

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور ثقافتی تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

جنوری 2019

● پاکستان وقت سے پہلے پیدا ہونے والا بچہ ہے

● میں ماورائے نظر علوم کا کچھ حد تک قائل ہوں

امجد اسلام امجد کی کرشماتی شخصیت کا راز

● اشفاق صاحب نے گڑ والی پائے کی

طرح ادب و گفتگو میں تصوف کی شکر گھولی

باناؤ قدسیہ غضب کا مشاہدہ رکھتی اور شاندار

طریقے سے اس کی عکاسی کرتی تھیں



جلد: 56 - شماره: 1 جنوری 2019ء

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

www.facebook.com/sayaradigest
Email: editorsayyara@yahoo.com
sayyaradigest@gmail.com
editorsayyara@hotmail.com
Phone: 92-042-37245412
Mobile: 0300-9430206

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شکفتہ تحریریں

ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور

مدیر اعلیٰ : امجد رؤف خان
مدیر منتظم : کامران امجد خان

مدیر : محمد ثاقب

معاون مدیران : جویریہ کامران - رونی خان - فرحان امجد

سرکولیشن مینجر : بشیر احمد

0333-4207684

خرم احمد خان -

0310-4942908

ہمایوں ثار

نکران پرنٹنگ : خالد محمود - محمد رفیق

طابع : اللہ والا پرنٹرز شاہراہ قائد اعظم لاہور

0333-4207684

خرم احمد خان -

0300-4144781

طارق محمود -

شعبہ اشتہارات

شوکت افضل ریاض آفندی
فیاض عمر عارف محمود اہل

مجلس مشاورت

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر
240 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن لاہور سے شائع کیا۔

قیمت
100 روپے

القرآن

بسم الله الرحمن الرحيم

سورة الاعراف

اور فرمودی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو! اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی کھلی دلیل آگئی ہے۔ یہ اللہ کی اوثقی تمہارے لئے ایک نشانی کے طور پر ہے لہذا اسے چھوڑ دو کہ خدا کی زمین پر چرتی پھرے۔ اس کو کسی بُرے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں آ لے گا۔ یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے اور اسکے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

اس کی قوم کے سرداروں نے جو بڑے بنے ہوئے تھے کمزور طبقہ کے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے کہا: کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے؟ انہوں نے جواب دیا بے شک جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اسے ہم مانتے ہیں ان بھائی کے مدعوں نے کہا جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔

(آیات: 72-79) (تجوید: تفہیم القرآن۔ از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

الحیثیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مال دار کجوسوں کی ہلاکت

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر مجھ پر پڑی تو فرمایا۔

”وہ لوگ تباہ و برباد ہو گئے۔“

میں نے کہا ”میرے ماں باپ آپ پر قربان کون لوگ تباہ و برباد ہو گئے؟“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ”وہ تباہ و برباد ہو گئے جو مال دار ہونے کے باوجود خرچ نہیں کرتے“ کامیاب صرف وہی ہوگا جو اپنی دولت لٹائے، سامنے والوں کو دے پیچھے والوں کو دے اور بائیں جانب والوں کو دے اور ایسے مال دار خرچ کرنے والے تو بہت ہی کم ہیں۔

(بحوالہ: فرمان رسول ﷺ نمبر سیارہ ذابجٹ)

اس شمارے میں.....

تفہیم القرآن قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے!

القرآن

2

مال دار کنجوسوں کی ہلاکت!

ادارہ

الحديث

2

احمد رؤف خان چمکتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی!

دستک

14

قلندر حسین سید ایسی بے مثال تحریروں کا گلدستہ جنہیں پھنکے کے لیے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی درکار ہوئی ہے!

خود طلیس ویدہ اختیار کو پینا کر دیں

49

نوشاہ اختر ایک شخص کا فسانہ جو اپنا پرستی کا شکار ہو کر اپنی دنیا پر باد کر بیٹھا تھا!

چھتاوے کا عذاب

62

محمد سلیم اختر آگرہ کے قبرستان کی اس قبر سے ایک بچہ نکلا جو زندہ تھا دل ہلا دینے والی کتھا!

انتقام

85

ادھورا منصوبہ

74

جہاں بھی گریں شہت مارا

17

جرم کی راہ پر چلنے والوں کی کہانی، جن کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا

جاوید رازی



دریائے وقت

127

سید جعفر امیر رضوی
لا زوال ادب کے معیار کو رکھنے کا طرز فکر
بیان کرتی منفرد تحریر!

تشدد اور اس کی اقسام

129

فرحت قادر
بڑھتا ہوا تشدد اور ظلم و جبر ہمارے معاشرے میں بگاڑ
کی اہم ترین وجہ ہے!

شکار

137

گلاب خان مولیٰ
پولیس ایکار کی کہانی اسے اپنی زندگی کے سب
سے عجیب ”مجرم“ کو گرفتار کرتا تھا!

اک ذرا اعتبار

141

زارار رضوان
دیار غیر میں اپنوں کے ستم کا نشانہ بننے والی
ایک لڑکی کی کہانی!

سراب زندگی

159

تالکد بیخ الرحمن
ایک شخص کا ماجراجس نے اپنی ساری زندگی کسی کی
خوشیوں کی نذر کر دی تھی!

HOME OF ENTERTAINMENT

نواز خان

گالی حویلی گوری شوگی

97

اس خانوادے کی کہانی جس نے ایک علاقے میں ظلم کی انتہا کر رکھی تھی۔
انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ”یوم حساب“ کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

فطرت کا خزانہ

123



یہ حقیقت ہے کہ ان پھلوں، سبزیوں و جڑی
بوٹیوں کا استعمال فقط غذا کے طور پر نہیں ہوتا
بلکہ ان میں موجود صحت بخش اجزاء بہت
سے امراض سے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔

عارف محمود اہل

مسلمان افغان بادشاہ باز بہادر اور اس
کی ہندو محبوبہ روپ متی کی تاریخی داستانِ محبت!

روپ متی اور
باز بہادر

187

ایک شخص کی کہانی جس کے گناہ نے مرتے
دم تک اُسکا چھپانہ چھوڑا

آدم خور
چیونٹیاں!

167

بازوق تاریکین کے کلام و انتخاب پر
مبنی مقبول ترین سلسلہ!

ادارہ

بزمِ شاعری

179

آپؐ نے اپنی ساری زندگی یاد الہی اور مخلوق
خدا کی بہتری میں صرف کر دی!

پروفیسر غلام رسول

حضرت یاک
بن دینار

193

اڑدھے نے ہم کا زہری اور ہماری طرف پلک ہمہاں رفتار سے
بھاگے کہ سو میٹر دوڑ کا مقابلہ ہوتا تو ہم کو لٹ میڈل جیت لاتے!

جاوید اقبال

اڑدھے کا شکار

202

خواتین کا رز

سیارہ کچن کا رز
جویریہ کامران

نئی اور ذائقہ دار کھانوں
کی منفرد ترکیب



183



185

● پاکستانی گیم ڈویلپر
..... سعدیہ بشیر
● جلد بیدار ہونی والی خواتین
کینسر کا کم شکار ہوتی ہیں



طلسمِ زادی

(قسط: 15)

مدتوں یاد رہنے والا یادگار ناول
لفظ لفظ اسرارِ سطر تجسس؟

ایم اے راحت

205

اظہار خیال



کروانے میں دلچسپی لیتی تو شاید یہ سانحہ رونما نہ ہوتا۔
 مختصر حسن کو احتیاط لازم ہے۔ باقی کرنی کا پھل
 کمال و جمال حبیب روپ بہروپ از نائلہ بلخ
 الرحمن بندہ نواز گیسو دراز بھی پسند آئیں۔ یہ اچھے
 سلسلے ہیں۔

(محمد یونس مجاہد)

قاسم علی شاہ کی باتیں

جناب مدیر سیارہ ڈائجسٹ السلام علیکم! امید ہے
 خیر و عافیت سے ہونگے شاہ صاحب کی باتیں بڑی
 اچھی لگیں۔ لیکن ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ
 قاسم علی شاہ کی جو تصاویر شائع کی گئی ہیں ان میں
 ایک تصویر میں وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے
 ہیں۔ اگر شاہ صاحب تصویر میں ٹانگ پر ٹانگ نہ
 چڑھتے تو ان کا جوتا ساتھ بیٹھے ہوئے بزرگ کے
 کھٹے یا شلوار کو نہ چھوتا اور اچھا لگتا۔ بہر حال یہ ان
 کی مرضی تھی۔ اللہ کرے ادارے کے سبھی حضرات
 بخیریت ہوں۔ آمین۔

(شوق خانوہنی)

معاشرتی رویوں کی عکاسی

جناب ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! بلاشبہ سیارہ
 ڈائجسٹ آج کے دور کا بہترین ڈائجسٹ ہے۔
 سیاست، معاشیات، سماجیات، محیر العقول قصے کہانیوں کا
 خوبصورت گل دستہ حالیہ شمارے میں قلندر حسین کی عرق
 ریزی خود طبعیں دیدہ اغیار کو پینا کر دیں بہت کمال
 رہی۔ انھوں نے اپنے سلسلے کو بہت متوازن رکھا ہے
 کہیں مزاح کا عنصر نمایاں ہوتا ہے اور کہیں بے حد غور

احتیاط لازم ہے

محترم جناب امجد رؤف صاحب مدیر اعلیٰ سیارہ
 ڈائجسٹ۔ السلام علیکم! امید ہے آپ بخیریت
 ہونگے دبیر کا شمارہ زیر مطالعہ ہے آپ نے دستک
 میں سوشل میڈیا کے متعلق خوب لکھا ہے اسے اعتدال
 میں ہی رہ کر اپنا کام کرنا چاہئے۔ شاہ صاحب قاسم
 علی شاہ صاحب کی کتاب سوچ کا عالمیہ کے جتنے
 باب آپ نے شمارے میں رقم کئے ہیں عمدہ ہیں۔
 میرا شاہ صاحب سے یہ سوال ہے اگر انسان
 پریشانیوں میں گھرا ہوا اور مٹی سوچیں اس پر سوار
 ہو جائیں تو اس کا حل ممکن ہے؟ امید ہے شاہ
 صاحب رہنمائی فرمائیں گے۔

نواز خاں کی پوری کہانی پڑھی واقعی عمدہ ملاٹ
 کے ساتھ عمدہ کہانی ہے اور جس طرح کہ اچھی کہانی
 میں کوئی نہ کوئی سبق پوشیدہ ہوتا ہے اس میں بھی یہ
 سبق پوشیدہ نظر آیا کہ اگر انسان حق پر ہو تو اسے
 بلیک میل نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی معافی مانگ کر
 اپنے آپ کو ڈی گریڈ کرنا چاہئے۔ سچائی کبھی نہ کبھی
 ظاہر ہو کر ہی رہتی ہے۔ خدا کے ہاں دیر ضرور ہے
 اندر حیر نہیں۔ تقدیر لکھنے کے فیصلہ میں محترمہ نوشاہ
 اختر صاحبہ نے جس المیہ کا ذکر کیا ہے میں یہ محسوس
 کرتا ہوں اگر عورت دیوروں، جیشوں یا کزنوں سے
 میل ملاپ اور تعلقات میں حد اعتدال میں رہے تو
 بہت سی انہونیوں سے بچا جاسکتا ہے۔ کہانی میں
 خاتون اگر اپنے دیور سے فری نہ ہوتی یہ سوچتی کہ یہ
 میرا حقیقی بیٹا نہیں اور اپنے خاوند کا جسمانی علاج

خوشی اس بات کی ہوئی کہ آپ نے میرے خط کو بھی رسالے میں جگہ دی۔ خطوط دیکھ کر اعزاز ہوا کہ سیارہ ڈائجسٹ کی ٹیم نہ صرف رسالے میں چھپنے والی تحریروں کا معیار برقرار رکھنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے بلکہ اس سلسلے میں ہونے والی مثبت تنقید پر بھی خصوصی توجہ دیتی ہے۔

کسی بھی جریدے کا معیار بہتر بنانے کے لیے یہ بات سب سے ضروری ہوتی ہے کہ قارئین کی آراء کا خیال رکھا جائے اور ان کے اچھے مشوروں پر عمل درآمد کی کوشش بھی کی جائے۔ مجھے امید ہے کہ سیارہ ڈائجسٹ کے ٹیم ممبران اپنی اسی کوشش میں یقیناً کامیاب رہیں گے۔ اور ہماری تنقید کا برا نہیں مانیں گے۔

(صابر ندیم۔ کراچی)

☆ صابر صاحب ہم تنقید برائے اصلاح کو نہ صرف خوش دلی سے قبول کرتے ہیں بلکہ اسے اپنے لئے انتہائی اہم ”تنقید“ تصور کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح ہی ہم سیارہ ڈائجسٹ کو قارئین کی پسند کے عین مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

چند تجاویز

کمری ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ! السلام علیکم! آپ کے ڈائجسٹ کی دیرینہ قاری ہوں اور اس کی تمام تحریروں دلچسپی کے ساتھ پڑھتی ہوں۔ آپ سے چند گزارشات کرتا ہوں تاکہ سیارہ ڈائجسٹ کو قارئین کی پسند کے عین مطابق بنایا جاسکے۔ سب سے پہلے تو میں چاہوں گی کہ بزم شاعری کا سلسلہ فوراً بند کر دیا جائے کیونکہ ایسی غیر معیاری اور بے وزن شاعری شائع کرنے سے بہتر ہے کوئی اچھی سی کہانی شائع کی جائے تاکہ پڑھنے والوں کو معیاری مواد می ملے اور ڈائجسٹ میں کہیں بھی معیاری کی محسوس

طلب اور سنجیدہ تحریروں شامل ہوتی ہیں۔ شاعری کا انتخاب بھی ہوتا ہے اور اقوال زیریں بھی۔ سچ ہے ان کی کاوش بہترین ہوتی ہے۔ طلسم زلوی کی نئی قسط بڑی ہی سنسنی خیز تھی۔ پڑھ کر حیرت آگیا۔ اسی طرح ”خدا خود شام خوان محمد ہے“ اور ”سمائل و جمال مصطفیٰ“ بے مثال تحریروں ہیں۔ ایڈیٹر صاحب! ذاتی خیال ہے کہ ”سیارہ“ ایک مکمل جریدہ ہے۔ خاص طور پر گذشتہ چند سالوں کے اندر اس میں انقلابی تبدیلیاں بھی آئی ہیں۔ ایک جمہوری جریدہ ہے۔ جہاں ہر قسم کی تحریری آزادی ہے۔ مذہب بھی ہے اور تفریحی مواد بھی۔ بلکہ کہانیاں تو غصب کی ہوتی ہیں۔ اور سلسلوں کا تو جواب ہی نہیں۔ جونہی میرا اخباری ہا کر رسالہ پھینک کر جاتا ہے۔ میں اسے آفس لے جاتا ہوں۔ اور آفس میں ہم صاحب ہم ذوق ساتھیوں نے ایک بزم ادب تشکیل دے رکھی ہے۔ جہاں ہم اس ڈائجسٹ کو تنقیدی نشست کے حوالے کرتے ہیں۔ خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں اور اس کے مضامین پر بحث کرتے ہیں۔ ہمیں آئینے راس نہیں آتے مگر سیارہ پھر بھی ہمارے سامنے آئینے رکھتا ہے کہ دیکھو اپنی کریہہ شکلیں دیکھو۔ اور پھر اپنے وہ اصل چہرے تلاش کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عنایت کئے تھے۔ میں اپنی بزم ادب کی جانب سے آپ کو سلام پیش کرتا ہوں۔ اور ہم کچھ عرصے تک ڈائجسٹ کے ارباب اختیار کو اس سلسلے میں زحمت دیں گے۔ تاکہ آپ ہماری خصوصی نشست میں شرکت کریں۔

(شیخ ناصر علی۔ لاہور)

مثبت تنقید

محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! پچھلے شماروں کی طرح سیارہ ڈائجسٹ کے دسمبر کے شمارے میں اپنی غزل دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی اور اس سے زیادہ

ہوں۔ پہلے بھی وقتاً فوقتاً خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتا رہتا ہوں۔ اس بار خط لکھنے پر مجبور آپ کی تحریر ”سوشل میڈیا کو کام کون ڈالے گا؟“ نے کیا ہے۔ آپ نے واقعی اپنی تحریر میں سچ لکھا ہے کہ ہم لوگ بغیر سوچے سمجھے جودل میں آتا ہے سوشل میڈیا پر اپ لوڈ کر دیتے ہیں۔ نہ ہمیں دوسروں کی عزت کا خیال ہے اور نہ قانون کا خوف۔ اور تو اور پتی ہی افواج اور ملک کے خلاف بکواس سے بھی نہیں گھبراتے۔ اس لیے انتہائی ضروری ہے کہ سوشل میڈیا کے حوالے سے بھی ضابطہ اخلاق تیار کیا جائے اور اس پر سختی سے عمل درآمد کروایا جائے۔ سردیوں کا موسم آتے ہی کئی مسائل بھی ساتھ آ جاتے ہیں۔ جیسے موسم میں ذرا سی شدت آئی تو گیس کا پریشری غائب ہو گیا ہے۔ مہنگائی اور گیس بجلی کی قیمتوں میں اضافہ نے پہلے ہی لوگوں کا جینا مشکل کر دیا ہے۔ جانے ہمارے ملک کے حالات کب سدھریں گے۔ مجھے تو کوئی امید نظر نہیں آتی۔ طاغوتی قوتیں بچے گاڑنے کو تیار بیٹھی ہیں۔ امریکہ کے بیانات آ رہے ہیں کہ پاکستان کے خلاف مذہبی عدم رواداری کی وجہ سے پابندیاں عائد کر دی جائیں گی۔ بھارتی حکومت اپنی فوج کو چوکس کر رہی ہے کہ بڑی ملک پر سر جھل شراٹیک کرنی ہے۔ یہ سب کیا ہے..... کیا ہم کسی بڑی سازش کا شکار ہونے جا رہے ہیں۔ خدا ار ملک بچانے کیلئے سب متحد ہو کر سوچیں۔ اقتدار اور اپنی ذات کو بھول کر ملک و قوم کیلئے سوچنے کا وقت ہے اللہ ہماری مدد فرمائے۔ (آمین)

(محسن ریاض۔ سرگودھا)

.....☆☆☆☆.....

نہ ہو۔ دوسری بات یہ کہ کہانوں کا لے آؤت تبدیل کرایا جائے اور ہر کہانی کا آغاز نکلین صفحے سے ہو۔ اس طرح تصاویر کی پرچٹک میں بھی بہتری آئے گی اور قاری پر خوشگوار اثر پڑے گا۔ تیسرا یہ کہ ہر ماہ کسی شخصیت کا انٹرویو ضرور شائع کیا جائے تاکہ پڑھنے والوں کی دلچسپی مزید بڑھ سکے۔ اس کیلئے اگر گنتی جتنی مشہور شخصیات کے بجائے اہم کارنامے انجام دینے والے پس پردہ افراد کے انٹرویوز شائع کئے جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ایک بے حد اہم بات یہ کہ قارئین کی شرکت کیلئے اقدامات کئے جائیں۔ میرے خیال سے سیارہ ڈائجسٹ میں اس وقت ”اظہار خیال“ کے سوا ایسا کوئی سلسلہ نہیں جس کے ذریعے قارئین ڈائجسٹ میں عملی طور پر شرکت کر سکیں۔ اس کیلئے سوال و جواب اور دیگر کئی طرح کے سلسلے شروع کئے جاسکتے ہیں۔ امید ہے آپ ان تجاویز پر غور کر کے عملدرآمد یقینی بنائیں گے۔

(سمیعہ خورشید۔ ملتان)

☆ محترمہ سمیعہ صاحبہ آپ کی تجاویز ہم نے نوٹ کر لی ہیں اور ہر ممکن حد تک ان پر عملدرآمد کی کوشش کی جائے گی تاہم چند باتیں عرض کرنا چاہیں گے وہ یہ کہ بزم شاعری سیارہ ڈائجسٹ کا سب سے مقبول سلسلہ ہے آپ شاید یقین نہ کریں مگر ہمیں سب سے زیادہ ڈاک اسی سلسلے کے حوالے سے موصول ہوتی ہے۔ نیز یہ سلسلہ قارئین کی عملی شرکت کا منہ بولا ثبوت بھی ہے۔

سوشل میڈیا

محترم امجد رؤف خان صاحب۔ السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ آج کے دور میں حق و صداقت کی آواز جس طرح بلند کئے ہوئے ہے اس کیلئے آپ اور آپ کی ساری ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔ میں تقریباً 10 سال سے آپ کے ڈائجسٹ کا مستقل قاری



چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی!

عمران خان انتخابات سے پہلے اور وزیر اعظم بننے کے بعد بھی بارہا یہ کہتے رہے ہیں کہ وہ پاکستان کو مدینہ کی طرز پر فلاحی ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ وزیر اعظم کے اس بیان کی تا صرف تحریک انصاف بلکہ تمام اپوزیشن جماعتوں نے بھی تعریف کی اور تمام تر سیاسی مخالفت کے باوجود پاکستان کو مدینہ کی طرز پر فلاحی اسلامی ریاست بنانے کے لیے بھرپور تعاون کی یقین دہانی بھی کرائی۔ عملی طور پر اقدامات کی بات کی جائے تو پی ٹی آئی کی حکومت نے اس ضمن میں اب تک جو سب سے اہم کام کیا اور جسے اپنے پرانے سب نے سراہا وہ اُن غریب اور بے سہارا افراد کے لیے پناہ گاہوں کی فوری تعمیر تھی جو فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر رات بسر کرتے ہیں۔ ان پناہ گاہوں میں بے سہارا لوگوں کے لیے بستر، لحاف اور کھانے پینے کی اشیاء کی فراہمی کو یقینی بنایا گیا ہے۔ بعد ازاں ان عارضی پناہ گاہوں کی جگہ شیلٹر ہوس تعمیر کر دیے جائیں گے جن کی تعمیر کا کام تیزی سے جاری ہے۔ اس کے علاوہ حکومت نے سگریٹ نوشی کم کرنے کے لیے کچھ دنوں قبل پور پی ممالک کی طرز پر ایک ٹیکس متعارف کرانے کا اعلان کیا جسے 'گناہ ٹیکس' کا نام دیا گیا، اس حوالے سے کام مکمل ہو چکا اور دستاویزات کا بیڑہ کوارسال کر دی گئی ہیں جسے ممکنہ طور پر آئندہ ہونے والے اجلاس میں منظور کر دیا جائے گا۔

گناہ ٹیکس عائد ہونے کے بعد سگریٹ کے فی پکٹ قیمت میں دس روپے کا اضافہ ہوگا۔ حکومتی شخصیات کا ماننا ہے کہ غریب آدمی دیے سگریٹ نہیں چتا، اور جو پیتے ہیں وہ خود ہی ٹیکس دیں گے۔ اس ٹیکس کے نفاذ کا ایک اور مقصد یہ بھی ہے کہ سگریٹ نوشی کی حوصلہ شکنی کی جائے تاکہ بد معاشی ہوئی تباہ کو نوشی کو روکا جاسکے۔ اس کے ساتھ ہی تحریک انصاف کے اقلیتی رکن قومی اسمبلی رمیش کمار نے اسمبلی

اجلاس کے دوران شراب نوشی کو تمام مذاہب میں حرام قرار دیا اور اس پر پابندی عائد کرنے کی قرارداد پیش کرنے کی تجویز دی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام کے ساتھ عیسائی، ہندو اور سکھ برادری سمیت بیشتر مذاہب میں شراب کے استعمال، تیاری اور فروخت کی ممانعت ہے۔ ریش کش مارنے کہا کہ شراب کی خرید و فروخت کے تمام لائسنس منسوخ کر دیے جائیں۔ انہوں نے اس تجویز پر ایوان میں رائے شماری کا مطالبہ بھی کیا۔ لیکن ایک اقلیتی رکن اسمبلی کی شراب پر پابندی کے خلاف تحریک ارکان اسمبلی کی اکثریت نے مسترد کر دی۔ شاید اکثریتی ارکان یہ قرارداد پیش کرتے اور اقلیتی ارکان اس کے خلاف بولتے تو سمجھ آتا کہ چلو شراب نوشی ان کی برادری میں برا فعل نہیں ہوگا۔ لیکن یہاں تو گنگا بنی الٹی پہننے لگی۔

ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ارکان اسمبلی جن کی اکثریت مسلمان ہے وہ شراب پر پابندی کے حق میں ووٹ دیتے لیکن انہوں نے اس کے خلاف ووٹ دیکر ثابت کر دیا کہ وہ محض نام کے ہی مسلمان ہیں اور باتیں چاہے اسلام کی کرتے ہیں لیکن عملی طور پر ہرگز ایک حقیقی اسلامی فلاحی معاشرہ قائم نہیں کرنا چاہتے۔ یہ ارکان جنہوں نے شراب پر پابندی کے خلاف ووٹ دیا اپنے مسلمان ووٹرز کے پاس کیا منہ لیکر جائیں گے اور کیا انہوں نے اگلے جہان میں جا کر حساب دینا نیکر بھلا دیا ہے۔ اسمبلی میں قرارداد مسترد ہوگئی۔ چلیں جناب! یہ تو اراکین کی اپنی صوابدید تھی۔ مگر وفاقی وزیر اطلاعات نے اس قرارداد پر جو تاریخی الفاظ ادا کیے، اُن کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے۔ جناب خواجہ چوہدری کا خیال ہے کہ ”ریش کش مارنے نے یہ قرارداد سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے پیش کی، کیونکہ جن لوگوں کو شراب نوشی کرنی ہے وہ پابندی کے باوجود بھی کرتے رہیں گے۔“ گویا.....

چلتی نہیں ہے یہ کافر منہ کوٹلی ہوئی

یہ عجیب دلیل ہے حکومت کو سوچنا چاہیے کہ کسی چیز پر گناہ ٹیکس لگا کر یا کسی چیز کی قرارداد مسترد کر کے لوگوں کو روکا نہیں جاسکتا، کیونکہ جنہیں سکریٹ ہٹنی ہے، وہ لفظ گناہ کی وجہ سے نہیں رکیں گے۔ اور جو شراب نوش ہیں، وہ بھی خرید کر بھی اسے گھر تک منگوا سکتے ہیں۔ اصل مسئلہ پابندی یا جھوٹ کا نہیں، بلکہ معاشرتی اقدار کا ہے۔ آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں، وہ بہت زیادہ تشویشناک ہے۔ ہر شخص موقع پر بغیر سوچے اور خیر کے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقلیتی ارکان کے مطابق اقلیت کے نام پر ملک بھر میں شراب خانے چلائے جا رہے ہیں جبکہ ان کے مالکان کی اکثریت کا تعلق اقلیتی برادری سے نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ طاقتور اشرافیہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے اقلیتی برادری کا نام استعمال کرتی ہے۔ جس سے یہ غلط تاثر عام ہوتا ہے کہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں شراب نوشی کی اجازت ہے۔ سکھ برادری کا بھی کہنا ہے کہ سکھ مذاہب میں شراب نوشی کو حرام قرار دیا گیا ہے اور اس کے استعمال یا کاروبار کی ممانعت ہے۔ ماضی میں بھی اقلیتی ارکان اسمبلی ان کے نام پر شراب کے کاروبار کے خلاف

آوازیں اٹھاتے رہے ہیں لیکن اس پر کسی حکومت نے کان نہیں دھرے۔ اقلیت کا ماننا ہے کہ دھرم کے چند بڑے ٹھیکیداروں نے اس ناپسندیدہ فعل پر ذاتی مفادات کی خاطر خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔ اور ان کی وجہ سے ایوان میں قرارداد پیش نہیں ہونے دی جاتی۔

سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں شراب کے کاروبار پر پابندی عائد کی گئی لیکن جنرل ضیاء الحق کے دور میں حکومت نے اقلیت کے نام پر شراب کی خرید و فروخت کے لائسنس دینے فیصلہ کیا۔ یہ سلسلہ آج تک ہر برسر اقتدار آنے والی حکومت نے جاری رکھا ہوا ہے۔

اگر دین اسلام سے قطع نظر طبی لحاظ سے دیکھا جائے تو شراب پینے کے جان لیوا نقصانات ہیں۔ جس سے ہر شخص واقف ہے۔ کینسر، پھیپھڑوں، جگر اور گردے کی بیماریاں، یادداشت کم یا ختم ہونا اور رعشے جیسی موذی بیماریوں سمیت لاتعداد مرض شراب نوشی سے جڑے ہیں۔ اس کی وجہ سے معاشرتی بُرائیاں الگ بھیتی ہیں۔

وزیر اعظم عمران خان نوجوانوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے کا درس دیتے ہیں، اگر ہم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر شراب پینے اور پلانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا کہ ”شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے“۔ ایک اور موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”اللہ نے لعنت فرمائی ہے شراب کے پھونکنے والے، اسے پینے والے، اسے بیچنے والے اور اسے خریدنے والے پر اور اس کی حد 80 کوڑے ہے۔“

اس لحاظ سے ارکان اسمبلی پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات پر عمل درآمد کے لیے قوانین وضع کریں۔ مگر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی شورشی اگر شراب پر پابندی کے خلاف رائے شماری نہ ہونے دے تو پھر آپ کیسے پاکستان کو مدینہ کی طرز پر فلاحی ریاست بنانے کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے کی امید کر سکتے ہیں؟؟۔

(امجد رؤف خان)



وارث

امجد اسلام امجد

کی

کرشماتی شخصیت کا راز



”نئی سازمی میں لمبوس فریدہ خانم دیال سنگھ میٹن، مال روڈ پر واقع شیران کی بیڑیاں چڑھتی ہوئی آئیں اور میں حیران رہ گیا۔“

امجد اسلام امجد صاحب نے کھوئے لہجے میں یہ عجیب ماجرا سنایا۔

سردیوں کی ایک رات ہم لاہور کی تھول اور پرسکون آبادی ڈینٹس کے جنگلے میں بیٹھے گفت گو میں مشغول تھے کہ بات ماورائی اور عجیب و غریب واقعات، تجربات اور مشاہدات کی جانب نکل گئی۔ باہر اندھیرا تھا اور بستی کے اس مکان کے مہمان خانے کی کھڑکیوں پر پڑے دبیز پردوں کی درزوں سے جھانکتی لمبوس کی مدھم ٹشمٹائی روشنی بیرونی دیوار تک پہنچنے پہنچنے دم توڑ دیتی تھی۔ مہمان خانے کے اندر اہم ادیب اور نامور شاعر امجد اسلام امجد صاحب مجھ سے مخاطب تھے۔ گزشتہ برسوں کی کئی شہروں پر محیط درجنوں ملاقاتوں میں پہلے بھی Deja vu، یعنی اشتباہ کہ گویا یہ واقعہ پہلے کہیں بیت چکا ہے اور تجربے مشاہدے میں آچکا ہے، کے موضوع پر بات نہ ہوئی تھی۔ ایسا بہت لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ انھیں کسی اجنبی شخص کو مل کر اپنائیت کا احساس ہوتا ہے جیسے وہ پہلے مل چکے ہوں، کسی مقام پر جا کر لگتا ہے جیسے وہ دیکھا بھالا ہو اور وہ ادھر آچکے ہوں اور کوئی واقعہ یا وقت کا کلزایوں محسوس کراتا ہے جیسے وہ خوب جانا پہچانا اور تجربے میں آیا ہوا ہو اور پہلے بسر ہو چکا ہو۔

امجد صاحب واقعہ سنانے لگے ”یہ قریباً تیس برس پہلے، اسی کی دہائی کا واقعہ ہے، مجھے شہزاد احمد نے فون کیا کہ فریدہ خانم آئی ہوئی ہیں۔ ہم نے شیران میں اُن سے ملاقات طے کر لی۔ ہم متعین وقت پر وہاں پہنچ گئے اور

گپ شپ کرنے لگے۔ بات چیت کے دوران میں کسی خیال میں کھو کر خاموش ہو گیا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ سامنے سے ایک پیراٹرے پر چائے کی پیالیاں اور دیگر برتن تھامے چلا آ رہا ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیراٹرے کھڑا ہوا، اُس نے اپنا توازن کھودیا اور ٹرے اُس کے ہاتھوں سے پھسل کر فرش پر گر کر اور برتن کچھوں میں بکھر گئے۔ اُس نے جھک کر کچیاں سمیٹنی شروع کر دیں۔ میں نے اُس سے نظر اٹھا کر شیشے کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو فریدہ خانم نیلے رنگ کی دیدہ زیب ساڑھی میں لمبوس خوب دکتی ہوئی، سیڑھیاں چڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ ”احمد صاحب نے توقف کیا اور الفاظ توالتے ہوئے بولے۔ ”اچانک میں جیسے بیدار ہو گیا۔ جو کچھ میں نے دیکھا تھا، وہ واہمہ تھا۔ نہ تو پیراٹرے سے آیا تھا، نہ برتن ٹوٹے تھے اور نہ ہی فریدہ خانم آئی تھیں۔ میں نے خیال سے نکل کر سامنے دیکھا تو وہی ایک پیراٹرے چلا آ رہا تھا۔ اُس نے ایک ٹرے تھامی ہوئی تھی جس پر برتن تھے۔ جیسا میں نے تصور میں دیکھا تھا، ویسا ہی حقیقی زندگی میں ہوا۔ وہ لڑکھڑایا، ٹرے پھسلے، برتن ٹوٹے اور میں نے نظر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا تو فریدہ خانم نیلے رنگ کی ساڑھی میں سیڑھیاں چڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا۔“

”گویا خواب و خیال خلط ملط ہو گئے“ میں نے کہا۔

وہ بولے ”دونوں ممالک واقعات اتنے حتمی تھے کہ میں متذبذب ہو گیا۔ میرے ساتھ اتنی کی دہائی میں ایسے واقعات اتنے تواتر سے ہونے لگے کہ میں پریشان ہو گیا۔ کئی مرتبہ کسی انجینی جگہ پر جا کر احساس ہوتا کہ میں پہلے یہاں آیا ہوا ہوں۔ کسی نے گھر میں جا کر آشنائی کا احساس ہوتا۔ جب میں نے سرفراز شاہ صاحب جیسے صوفی سے رابطہ کیا۔ شاہ صاحب نے اس کی منطقی وجہ بیان کی۔ اُن کا کہنا تھا کہ انسانی دماغ چار حصوں پر مشتمل ہے، بعض غیر معمولی طور پر احساس حقیقی لوگوں میں ایک حصے سے موچیں دوسرے حصے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ یوں انسان میں احساس دوران وجدیہ ہو جاتا ہے۔“

بچنے کے باہر سڑک سے گزرنے والے انکاڑ کا موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں کا میکانیکی شور اور ہیڈ لائٹیں نیم تاریکی اور خاموشی میں سیندھ لگاتیں، بل چل ہوتی اور پھر سے وہی ماحول ہو جاتا۔

اندر کمرے میں احمد صاحب چائے کی چسکیاں لے رہے تھے اور پڑھتے لہجے میں مجھ سے مخاطب تھے ”میرا نظریہ ہے کہ صوفیا، روشن ضمیر اور غیب میں ہمارے اوپر سے گزرنے والے لمحات سے مستقل تعلق قائم کر لیتے ہیں۔ ہر شخص میں ایسی حیات مختلف شدت کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ اگر کسی میں یہ شدت دیگر لوگوں سے بڑھ کر ہے تو وہ اس صلاحیت کا زیادہ حامل ہوگا۔ زندگی اسرار سے بڑھ ہے۔ اس میں فقرۂ دل سے لے کر کائنات کی وسعتوں تک بے شمار چیزیں پھیلی ہوئی ہیں۔“

احمد صاحب نے توقف کیا، سامنے پڑی میز پر نظر مرکوز کی اور بولے ”ایک مرتبہ علامہ اقبال سے اُس دور کے ایف سی کالج کے قلمی کے انگریز پروفیسر نے استفسار کیا کہ رسول پاک کو جب وحی ہوتی تھی تو وہ حالت جذب میں چلے جاتے تھے۔ ایسے میں وحی کے الفاظ لفظ بہ لفظ ہیں یا یہ خلاصہ ہے۔ اقبال نے کہا کہ یہ لفظ بہ لفظ (Verbatim) ہیں۔ پروفیسر نے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ رات کو وحی ہو اور حالت جذب سے نکل آنے کے بعد یاد رہے۔ اقبال نے جیٹن سے کہا کہ یہ قطعی طور پر ممکن ہے۔ ہر شخص کے پاس ایک مخصوص طاقت کا

رہسور ہوتا ہے۔ میرے اوپر شعر لفظ بہ لفظ مکمل صورت میں وارد ہوتا ہے۔ جب کہ میرا رہسور ادنیٰ سا ہے۔ وہ تو غیر معمولی انسان تھے۔ ان کے ہاں بہت قوی اور بڑا رہسور تھا۔ سو یہ نہ صرف بالکل ممکن ہے بلکہ میرا اس پر ایمان بھی ہے۔“

امجد صاحب کی بیٹی اور داماد عمرے پرسود یہ گئے ہوئے تھے اور ان کا معصوم شرارتی نواسا کی مرتبہ کمرے میں آکر اپنے نانا سے باہر گاڑی کی سیر پر چلنے کی لاڈ بھری ضد کر چکا تھا۔ میں نے امجد صاحب کی آنکھوں میں نواسے کے لیے محبت تیرتے دیکھی، جب وہ اپنے ڈارے سے بولے ”بھس کر دکھا اور بچوں کو بازار جانے کے لیے تیار ہونے کا کہو“ تو میں نے ان کے اور بچوں کے درمیان سے بیٹے کا ارادہ کیا اور ان سے رخصت کی اجازت طلب کر لی۔

امجد صاحب کا قریبی عزیز میرا بچپن کا جمعی جماعت سے دوست چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ ان سے تعلق علمی و ادبی ہونے کے علاوہ ذاتی قسم کا بھی ہے۔ امجد صاحب کو خاندانی معاملات میں کسی مرتبہ ایسی شخص آزمائشوں کا سامنا رہا ہے کہ کوئی عام اعصاب کا کوٹاہ نظر شخص ہوتا تو ٹوٹ جاتا۔ جب کسی ان موضوعات پر بات ہوئی تو انھوں نے ایک دور اندیش اور سمجھ دار دانش ور کی طرح ان مشکلات کو زندگی کا خراج اور عارضی معاملات سمجھتے ہوئے حوصلہ بلند رکھنے کی کوشش کی اور دوستوں کو ایسے پی گئے کہ انھیں چہرے کی لکیروں کا حصہ نہیں بننے دیا۔

امجد صاحب سے ان کے گھر، ریسٹورانوں، کلبوں، ہوٹلوں، علمی محفلوں اور ادبی میلوں میں بے شمار ملاقاتوں میں دنیا جہاں کے موضوعات، تالیف، روزگار، شخصیات، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، قراۃ العین حیدر، واصف علی واصف، پروفیسر احمد رفیق اختر، صادقین، احمد عظیم قاسمی، پروین شاکر، میڈم نور جہاں اور دیگر بے شمار رحمان ساز ادیبوں، دانش وروں اور باصلاحیت لوگوں کا تذکرہ رہا، عام زندگی کے افراد، سیاحت کے تذکروں، ادب کی باتوں، فلسفے کے نکات اور ذاتی زندگی کے معاملات پر جی بھر باتیں ہوئیں، گفتگوئی مٹی، گفتگوئی بڑی بھی پر ہر ملاقات کے بعد اگلی مرتبہ ملنے کی خواہش دو آتشہ ہوتی۔

دل چسپ کہانی ہے۔

درجنوں کتابوں کے مصنف، سینکڑوں نظموں اور غزلوں کے شاعر، وارث، دلہیز، سمندر، وقت، فشار، دن اور ایسے بے شمار ڈراموں کے خالق امجد اسلام امجد کو اندھی خالد، ایک بیوروکریٹ اور ملکہ رضیہ سلطان نے تخلیق کار بننے میں مدد دی۔ ایک چھوٹی سی چٹان جھرنے کی روانی تبدیل کر کے بعد کو بننے والے دری کا رخ بدل دیتی ہے، ایک چھوٹا سا واقعہ زندگی کا دھارا بدل دیتا ہے اور بعض اوقات بڑا واقعہ زندگی پر اثر نہیں ڈالتا۔ ایک شبے میں چھوٹی سی ناکامی دوسرے شبے میں بڑی کامیابی کی داغ بیل ڈالتی ہے۔

ایک ادبی محفل کے بعد رات کو لان میں بیٹھی ہوا میں کھانا کھاتے ہوئے امجد اسلام امجد صاحب نے حدیث دول، حکایت زندگی بیان کرنی شروع کی۔

1944 کا خانوش، ٹھہرا، ست رولاہور پرانے شہر کی فصیلوں سے باہریوں و مہرج سے قدم چھوکتے خاصا پھیل چکا تھا جیسے خطرے کی آمد پر واپس اندر سمٹ جائے گا۔ مسلمان، ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی، اینگلو انڈین دھنوں سے غمزدہ شہر تہیب پاتا تھا۔ براٹھ رتھ روڈ اور جیمز لین روڈ ایسے انگریزی ناموں کی سڑکوں کے قریب

فلیمنگ روڈ نامی برطانوی نام کی سڑک پر دست کاروں کے ایک خاندان میں بعد ازاں اردو کے شیش محل میں چراغ روشن کر کے بے شمار کس پیدا کرنے والے امجد نے پہلی قطاری بھری۔ اس کی آبائی کنوئی میں رہنے والی سگی انڈی خالہ ہرگز نہ جانتی تھی کہ بعد کے برسوں میں امجد کو سیکنگٹوں غزلیں، نعشیں، درختوں شعری تراجم، لاتعداد ٹی وی ڈرامے اور سیریل تحریر کرنے تھے، پرائڈ آف پرفارمنس اور ستارہ امتیاز ایسے اعلیٰ ترین ملکی اعزازات اپنے نام کرنے تھے۔

ہسپانوی مکالموں کے وسطی محن میں فوارہ اور گرد کرے ہوتے تھے، راجستھانی حویلیوں کے وسط میں محن اور تین اطراف رہائشی کرے اور چوٹی جانب صدر دروازہ ہوتے تھے، اسی طرح آج بھی قدیم شہروں کی ضیصلوں میں آباد محلوں میں احاطے جیسے کنوئیاں کہتے ہیں، کی اطراف میں پرانے رہائشی مکانات ہیں۔

عموماً بچے کے ذہن میں اپنی پیدائش، ماں، اشیا، گرد و نواح اور دیگر قریبی نوعیت کے معاملات پر سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں جنہیں وہ بعد ازاں معاشرتی و ثقافتی تربیت کے باعث بالعموم بھلا بیٹھتا ہے یا میسر جوابات سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ بے اطمینانی جستجو کو جنم دیتی ہے، جستجو نئے خیالات کی جانب لے جاتی ہے، اس راہ سے کئی پک ڈھڑیاں نکلتی ہیں، غیر مستعمل پک ڈھڑی کا سفر حیرت، مکافضے اور دریافت کا سامان لیے ہوتا ہے۔

سولیمنگ روڈ کی کنوئی میں ریختے، لڑھکتے، دوڑتے بھاگتے، لالچتے پھلاتے امجد کے ننھے دماغ میں انڈی خالہ کو دیکھ کر ہم دردی کے علاوہ ان کی ناپائیدگی کے متعلق سوالات جنم لیتے رہتے کہ وہ انڈی کیوں ہیں اور اس میں ان کا قصور کیا ہے۔ خالہ کو کہانیاں سنانے کا شوق تھا۔

ایک ناپائیدہ شخص میرے پسندیدہ معروف امریکی مصنف ریمنڈ کا روور کی کہانی کیتھڈرل (کلیسا) کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کہانی ایک نظر رکھنے والے آدمی کو ناپائیدہ شخص رابرٹ کے دماغ کی آنکھ سے دنیا کو قصور کرنے، محسوس کرنے، دیکھنے اور اپنے آپ کو نظر آتی دنیا سے آزاد کرنے کا اظہار یہ ہے، فن پارہ ہے۔ ہم اُس دنیا کے قیدی ہیں جو ہم دیکھ سکتے ہیں، گویا ہم دنیا کی قیدی ہیں، جب کہ ناپائیدہ چوں کہ دیکھ نہیں سکتا سو اُس کی دنیا لامحدود ہوتی ہے۔

بہر طور خالہ کی سنائی کہانیوں نے ننھے امجد کے شوق داستان کو ہمیز دی اور اس نے ان میں رنگ آمیزی کر کے کہانیاں پختہ شروع کر دیں۔ بعد ازاں اُس کے کانوں میں پھونکی خالہ کی کہانیاں اس کے منہ سے نئی شکل میں نکلتی ہیں۔

وقت پلٹتا ہے، رضیہ سلطان اور بیوروکریٹ منظر نامے میں داخل ہوتے ہیں۔

امجد کے گھرانے میں تعلیم کا زیادہ رواج نہ تھا۔ ناپائیدہ خالہ سے سنی کہانیاں وہ کچھ بڑھا کر اور کچھ خود تخلیق کر کے اسکول میں سنایا کرتا۔

وہ ساتویں جماعت میں تھا کہ اس کے معصوم ذہن نے رضیہ سلطان کے کردار سے متاثر ہو کر ایک سفر اتنی صفحات پر مشتمل ڈراما ”رضیہ سلطانہ“ لکھ کر اپنے استاد کو دکھایا۔ استاد اپنے باصلاحیت طالب علم سے متاثر ہوا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔

”رضیہ سلطانہ“ نامی نسوانی کردار کی جانب اوائل عمری سے مائل ہونا احمد کے تحت المشہور میں کارفرما فطری رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ عموماً اس عمر کے لڑکے بالے تاریخی کرداروں سکندر اعظم، چنگیز خان، حیدر علی، ٹیپو سلطان وغیرہ میں زیادہ دل چسپی رکھتے ہیں۔

بہر حال احمد کو فنی و جسمانی کھارکس درکار تھا۔ فنی ترقی کے لیے ادب تھا، اسکول کے رسالے، نشان منزل کی ادارت تھی، اور جسمانی ترقی کے لیے کرکٹ تھی۔

کالج کے زمانے میں بارہ برس بعد احمد کی اسلامیہ کالج کی ٹیم چیمپئن بنی تھی۔ اس ٹیم میں احمد کی یہ طور کھلاڑی کام یابی قابل ستائش رہی تھی۔ البتہ پنجاب یونیورسٹی کی ٹیم میں احمد کو ریزرو کھلاڑی کے طور پر لیا گیا اور اس کی جگہ ایک بیورو کریٹ کے بیٹے کو کھلایا گیا۔

گویا بیورو کریٹ نے احمد کی حق تلفی کر کے اسے کھیل سے دل برداشتہ کر دیا اور وہ یک سوئی سے ادب کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کرکٹ میں اس کا ٹیلنٹ اوسط رہتا جب کہ ادب میں وہ غیر معمولی صلاحیت کا حامل تھا۔ چنانچہ ارتکاز توجہ سے وہ ادب میں مقام فضیلت کی جانب تیزی سے سفر کرنے لگا۔ بیورو کریٹ کی نامہ رسانی اپنی نکل میں ایک نعت لیے آئی تھی۔ خدا جانے کون سی چھوٹی و فنی پریشانی کی ایزمی کی چوٹ سے آب زم زم پھوٹ سکتا ہے۔

احمد کے ہم سارے میں ایک نامی گرانی ادبی ہستی آقا بیدار بخت رہتے تھے جو احمد کی بہت حوصلہ افزائی کرتے۔ یوں نہ صرف اس کی خوبی گھر کے سامنے آتی بلکہ ایک شفیق شخصیت کے ہم دروانہ اور عجانہ رویے کی وجہ سے اعتماد میں بھی اضافہ ہوتا۔

ایوب خان کے خلاف عوامی لہر، موج دریا سے بڑھ کر طوفان بلاخیز کا روپ دھار رہی تھی۔ تب تک احمد ساحل مدھیانوی، مگر مراد آبادی اور دیگر رومانی شعرا سے زیادہ متاثر تھا۔ وہ طالب علم تھا، جذباتی تھا، بے نادت کا داعی اور تبدیلی کا خواہاں تھا۔ چنانچہ ایوب کے خلاف ایک نظم ”ہوائے شہر و قاشعاراں“ لکھی جو کئی دلوں کی دھڑکن بن گئی اور سیاسی راہ نماد وائش ورنٹیف رامے کے رسالے ”نصرت“ کے سرورق پر شائع ہوئی۔

شاعر احمد کی خوبی کو جلا اور اعتماد کو بڑھوتری ملی۔ اچانک احمد کی زندگی کی فلم میں ایک گاؤں کا درواخل ہوتا ہے۔ اطالوی روایت میں یہ ایک خفی رنگ لیے کفیل ہوتا ہے۔ جب کہ روایتی حقیقت اسے ایک ایسے شفیق بزرگ کفیل کے طور پر پیش کرتی ہے جو کسی کی فنی کفالت اپنے ذمے لے لے۔ شرقی روایت میں پھر طریقت، استاد مکریم یا خاندانی بزرگ یہ کردار اپنا لیتے تھے۔ وہ ایک مہربان پرندے کی طرح بچے کو اپنے پروں کی پناہ میں لے لیتے تھے۔

احمد کے لیے ادا قار و بامرؤت معروف ادیب احمد ندیم قاسمی صاحب نے یہ کردار اپنایا۔ 1965 کی جنگ ختم ہوئی تھی۔ قوم حب الوطنی کی خوشبو سے مہک رہی تھی اور جذبے کی حدت میں دہک رہی تھی۔

سادہ زمانہ تھا، خواہشات زیادہ نہ تھیں، قوم کی اکثریت کا طرز و معیار وراثت ایک سا تھا، وزراء، سفراء اور عامی ایک ہی طرح کے پیلے سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے، چھپر ڈیوٹل میں بھیکے جراثیم کش پھاہوں

اور فینکسل کی پونچھن کی سوکار بوؤں میں بے عوامی اسپتالوں سے علاج کرواتے۔ بد معاش گمراری والے چاقو استعمال کرتے اور شرابے داغ سفید لباس پہننے سو سفید پوش کہلاتے۔

ادریخٹل کالج میں جنگ کے حوالے سے مشاعرہ تھا۔ امجد نے اس میں ایک نظم پڑھی۔ احمد عظیم قاسمی صاحب تب تک ایک منجے اور مستحکم ادیب و دانش ور کی امتیازی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ وہ بھی مشاعرے میں فروکش تھے۔

مشاعرہ ختم ہوا تو قاسمی صاحب امجد کے قریب رُک گئے اور کہنے لگے ”آپ نے بہت اچھی نظم پڑھی ہے۔ کیا آپ یہ نظم مجھے عطا کر سکتے ہیں؟“ ایک بڑے ادیب کی جانب سے عطا کرنے کا لفظ نوآموز کے لیے باعث حوصلہ افزائی تھا۔ امجد گھبرا کر کچھ کہنے ہی کو تھا تو قاسمی صاحب نے بات جاری رکھی ”میں نون کے نام سے ایک رسالہ نکالتا ہوں۔ مجھے نون کے لیے یہ نظم عنایت کر دیجیے۔“ امجد نے انھیں یہ نظم دے دی جو اگلے پرچے میں شائع ہوگئی۔ پرچے کی کاپی امجد کو ملی تو ساتھ میں حوصلہ افزائی کا خط بھی تھا جس میں قاسمی صاحب نے لکھا تھا ”میں نے بزرگی کا لائنس لیتے ہوئے، آپ سے عمر میں بڑا ہونے کے ناتے، آپ کی اجازت سمجھتے ہوئے نظم میں ایک لفظ بدلا ہے۔“ افسارہ بزرگی اور راہ نمائی کا یہ مظاہرہ امجد کے دل کو چوم گیا۔ بعد ازاں قاسمی صاحب یہ کہتے ہوئے امجد سے نئی نظم وغزل کا تقاضا کرتے ”آپ کی نظم نہیں آئی، میں نے پرچا آپ کے لیے روکا ہوا ہے۔“ حوصلہ افزائی کے چند جملے امجد کا دل بڑھا دیتے۔

پس اس کے بعد میدانِ ادب میں امجد نے بگھٹ ثانیوں میں کوسوں کا سفر طے کرنا شروع کیا۔ مشقِ سخن سے کلام میں دمک پیدا ہوئی، رقیقِ القلم سے اظہار میں حساسیت بڑھ گئی اور کشادگی، دل و گفتار سے وسعتِ احباب ہوئی۔ شہرِ در شہر سفر کیے، مختلف کرداروں، عجیب لوگوں، قد آور دانشوروں، فن کاروں سے شناسائی ہوئی۔

حقیقی زندگی کے آسٹریا اور امریکا کی دل چسپ حکایات و واقعات کو بیان کیے بنانا نہیں بنتی، بادہ و ساغر نہ سہی، قرطاس و قلم سہی۔

امجد کی زندگی میں احمد عظیم قاسمی کے سے بامروت و شفیق بزرگ آسٹریا کے الپس کے پہاڑوں کی قدموں میں رہنے والے بہار کے رکھوالے کی طرح تھے اور داد دیتے ہم نشین امریکا کی وسائیں یونیورسٹی کی ہم جماعتوں کی مانند تھے۔

بہار کا رکھوالا، آسٹریا کے الپس کے جنتِ نظیر سلسلہ کوہ کے قدموں میں آباد گاؤں سے ذرا اوپر مشرقی ڈھلوان پر واقع خواب آلود جنگل میں رہنے والا ایک حقیقی شخص تھا۔ اُس بوڑھے شخص کو چند برس قبل علاقے کی کونسل کے ایک نوجوان ممبر نے ملازمت پر رکھا تھا۔ اُس کا کام پہاڑی تالابوں اور جھروں میں سے جھاڑ جھکاڑ چننا اور صاف کرنا تھا تاکہ نیچے واقع بستی سے گزرتی ندی کو چشموں کے شفاف پانی کی فراہمی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ وہ شخص خاموشی اور تن دہی سے اپنے کام میں منہمک رہتا۔ وہ سارا دن پہاڑیوں میں پھرتا رہتا اور بادلوں کے سائے میں، بارشوں میں، سورج کی میٹھی روشنی میں، جھروں سے درختوں کے پتے اور شاخیں، پودوں کی ٹہنیاں اور نہ نشین گاد صاف کرتا رہتا۔ یوں صاف پانی کی روانی برقرار رہتی۔ جلد ہی وہ بہتی سیاحوں کے لیے

ایک پد کشش مقام بن گئی۔ وہاں تالابوں میں خوب صورت بگے تیرتے رہتے، رنگین مچھلیاں شفاف پانی میں اگلیاں کرتی نظر آتیں اور قریب میں واقع جھوٹے گمریلو صنعتوں کے پیسے دن رات پانی کے زور پر چلتے رہتے۔ سرسبز و شاداب کھیتوں کی سیرانی کا بھی انتظام رہتا اور بستی کے کینوں کو وہاں گوشہ بہشت کا احساس ہوتا۔ سال گزرتے رہے۔ ایک مرتبہ کونسل کا سالانہ اجلاس ہوا۔ جب وہ بجٹ کا جائزہ لے رہے تھے تو ایک ممبر کی نظر اس بوڑھے شخص کی تن خواہ پر پڑی۔ رکھوالا پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر کام میں مصروف رہتا تھا اس لیے عموماً نظروں سے اوجھل رہتا۔ چنانچہ ممبر نے تجویز پیش کی کہ چون کہ وہ کبھی کام کرتا نظر نہ آیا تھا اور اس کا وجود فقط ایک معاشی بوجھ تھا سو اسے ملازمت سے فارغ کر دیا جائے۔ اس تجویز کو مختلف طور پر منظور کر لیا گیا اور اس رکھوالے کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

چند ہفتوں تک کچھ بھی تبدیل نہ ہوا۔

موسم خزاں کی آمد کے ساتھ درختوں سے پتے جھڑنے شروع ہو گئے۔ چھوٹی شاخیں، ٹہنیاں درختوں پودوں سے ٹوٹیں اور تالابوں میں گر گئیں۔ پانی کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہوتی شروع ہو گئی۔ ایک سہ پہر ندی کے پانی میں ہلکی پیلاہٹ اور گدلا پان نظر آیا۔ چند روز میں پانی کی تہ میں رسوب میں اضافہ ہوا، گلے سڑے چوں ٹہنیوں کی تعداد بڑھی اور پانی کے گدلے پان میں اضافہ ہو گیا۔ چند ہفتوں میں پانی کی سطح پر لیس دار مادے کی ہلکی سی چادر دکھائی دی۔ جلد ہی اس چادر کا رنگ گہرا ہوا اور یہ گاڑھے مادے میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی کثافت کناروں کے ساتھ بڑھ گئی اور پانی میں یہ بوجھ پیدا ہونا شروع ہوئی۔ صنعتوں کے پیسے آہستہ رفتار سے چلنا شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ ٹک گئے۔ بغلیں وہاں سے ہجرت کر گئیں اور سیاح بھی رخصت ہو گئے۔ آہستہ آہستہ بستی میں دبانیں پھوٹنے لگیں۔

کونسل نے شرمندگی میں ہنگامی اجلاس بلا لیا۔ انھیں اپنے احقانہ فیصلے کا احساس ہو چکا تھا۔ جلد انھوں نے بہار کے رکھوالے سے رابطہ کیا اور اس سے کام دوبارہ شروع کرنے کی درخواست کی۔

چند ہفتوں میں پہاڑیوں پر جھرنوں اور تالابوں کی صفائی ہو گئی، ندی کو اچھی طرح آلائشوں سے پاک کر دیا گیا، سورج کی کرنوں میں ہیرے کی طرح دھمکتا پانی پھر سے جاری ہو گیا اور بستی کی فضا نئیں پھر سے سبزے اور پھلوں کی خوشبو سے معطر ہونے لگیں۔

والدین، اساتذہ، فضیض بزرگ اور متعلقہ شعبے کے سینئر اس بہار کے رکھوالے کی طرح ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کوئی بالواسطہ کردار ادا نہیں کرتے مگر خاموشی سے اپنے کام میں محو رہتے ہیں اور امکانات کی سر زمین کو جاتے صلاحیت کے چشموں اور جھرنوں سے آلائشیں صاف کرتے رہتے ہیں۔

محاصرین کے حوالے سے ایک مشاہدہ ہے۔ حاضر زمانے میں دیکھا گیا ہے کہ اپنے متعلقہ شعبے کے محاصرین عموماً رشک سے زیادہ حسد کی جانب مائل ہو جاتے ہیں۔ اس میں دیگر کے علاوہ نمایاں وجوہات میں اپنی ذات میں خوبی اور صلاحیت کی قلت اور عام معاشرتی چلن شامل ہیں جن میں اسے زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ دیگر غیر متعلقہ شعبوں کے لوگ ستائش و حوصلہ افزائی کا زیادہ باعث بنتے ہیں، چون کہ اُن کا بالواسطہ مقابلہ، موازنہ اور تعلق نہیں ہوتا۔

خوش قسمتی سے امجد صاحب کو ادب، فنونِ لطیفہ اور ٹی وی میں ایسے بہت سے سینئر اور دوست ملے جنہوں نے اُن کی بھرپور حوصلہ افزائی اور پزیرائی کی۔

یہاں دوسری بچی حکایت کا تذکرہ کر رہی ہوں گا۔ یہ ایک چشمِ گھٹاٹم حقیقی نوعیت کا واقعہ ہے۔ امریکا کی دسٹائن یونیورسٹی میں چند غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کے حامل لڑکے زیرِ تعلیم تھے۔ ان میں مستقبل کے نمایاں ادیب، شاعر اور مفکر بننے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ وہ سب باقاعدگی سے نشستوں کا اہتمام کرتے جن میں وہ اکٹھے ہو کر اپنی تخلیقات تجزیے کے لیے پیش کرتے۔

وہ لڑکے تجزیہ و تنقید کے معاملات میں بے لحاظ ہو جاتے اور ایک دوسرے کی تحریروں کے پرچے اُڑا دیتے۔ وہ نشستیں اکٹھا کر کے سی حیثیت اختیار کر گئیں جہاں روایت، معاشرہ ادب و فلسفے اور نکتہ طرازی کے پڑ ڈھانے مکالمات سے مخاطب کو جواب کروایا جاتا۔ اس گروہ کو ”جکڑنے والے“ کا نام دیا۔

اس کے مقابل یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم لڑکیوں نے بھی ایک گروہ تشکیل دیا جسے انھوں نے ”جکڑنے والے“ کے برعکس ”بحث والیاں“ کا نام دیا۔ یہاں نشستوں میں اپنی تخلیقات پیش کی جاتیں اور ان پر مباحثہ بھی ہوتا مگر یہ مباحثہ جکڑ کر دم گھونٹنے والا نہ ہوتا بلکہ تعمیری اور حوصلہ افزا ہوتا۔ کسی طالبہ کی معمولی سے معمولی تخلیق پر اُس کی راہ نمائی اور حوصلہ افزائی کی جاتی۔

میں برس بعد یونیورسٹی کے طلبہ کے کیریئر پر ایک طالب علم نے سنجیدہ حقیقی کام کیا۔ اُس نے دیکھا کہ ”جکڑنے والوں“ کے برعکس ”بحث والیوں“ نے ادبی و تخلیقی میدانوں میں نمایاں کام پایا یا حاصل کی تھیں۔ جکڑنے والے مایوس اور بے دل ہو کر اپنے تخلیقی کاموں سے کنارہ کش ہو گئے تھے جب کہ بحث والی طالبات نے حوصلہ پکڑ کر استقامت سے اپنا کام جاری رکھا اور ان میں سے چھ خواتین قومی سطح پر کامیاب و معروف ہوئیں۔ ان میں سے مارگری رائلنگ نے ”ڈی برلنگ“ نامی ناول تخلیق کیا جو ملکی سطح پر اُس سال کا بہترین امریکی ناول قرار پایا، بائیس زبانوں میں ترجمہ ہوا اور اسے 1939 کے موثر و شان دار انعام ”پلٹزر“ (Pulitzer) سے نوازا گیا۔

یوں حوصلہ افزائی کے نتیجے میں پوشیدہ و خوابیدہ جواہر نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ امجد اسلام امجد کو احمد عظیم قاسمی کی حوصلہ افزائی نے اس درجہ اعتماد بخشا کہ وہ آج بھی اُن کے شکر گزار ہیں۔ افتخار عارف کا ایک پر مغز اور قریبِ حقیقت قول ہے ”احسان کرنے والا یقیناً بڑا آدمی ہوتا ہے۔ زیادہ بڑا تو وہ آدمی ہوتا ہے جو اپنے اوپر کیا گیا احسان یاد رکھتا ہے۔“

احمد عظیم قاسمی صاحب کے فوت ہو جانے کے بعد اُن کے سینکڑوں ارادت مندوں اور شاگردوں نے یقیناً انھیں محبت سے یاد رکھا، پر جس شخص نے آگے بڑھ کر عملی طور پر اُن کے لیے تقاریب کا اہتمام کیا، احباب اختیار سے درخواست گزار ہوا اور ایسے معاملات میں مددِ اہمہام کا کردار ادا کیا، وہ امجد اسلام امجد ہیں۔

دانش ورانِ نکتہ فہم خوب جانتے ہیں کہ وہ ارادے، خواہشات، فن پارے، شاعری، ناول اور منصوبہ بندیاں جو فقط دماغ میں ہوں، خام ہیں۔ عملی صورت اختیار کرتے ہیں تو قابلِ توجہ و لائقِ تحسین قرار پاتے ہیں۔ انھوں نے احمد عظیم قاسمی صاحب کی محبت میں عملی اقدامات کیے۔

مرحوم اے حمید فرماتے تھے کہ بیٹیاں باپ کی چارپائی کی وارث ہوتی ہیں۔ فیض احمد فیض کی بیٹیاں سلیمہ و منیرہ ہوں، احمد بشیر کی بیٹی نایلم احمد بشیر ہوں، منو کے بھانجے حامد جلال کی بیٹی عائشہ جلال ہوں، زید اے سلہری کی بیٹی سارا سلہری ہوں۔ ہر جانب بیٹیاں باپوں کی قبروں پر روشن چراغوں کے مانند ہیں۔ وہ ہر میسر مواقع پر باپوں کی یادیں تازہ کرتی رہتی ہیں۔ ایسے میں بیٹے کم کم سامنے آتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کی حقیقی بیٹی ناہیدہ قاسمی نے اُن کی یاد کی شمع ”فنون“ اور جانبہ جامضامین و گفت گو میں روشن کر رکھی ہے اور جس مقام جلی سے احمد صاحب اُن کے لیے تنگ دودھ کرتے ہیں، وہ عام سے بڑھ کر ہے۔

ایک صبح کراچی کے برب بسندہ واقع شان دار کلب ڈی ایچ اے کلف اینڈ کٹری کلب میں مجھ ناچیز کو احمد اسلام احمد صاحب اور چند دیگر معروف و معروف ادیبوں کے ہم راہ ناشتے پر مدعو کیا گیا تھا۔ یہ کبھی سابق صدر پرویز مشرف کا پسندیدہ کلب ٹھہرا تھا۔ پروقار عمارت کے ساتھ تھلیں گھاس کا ایک وسیع و عریض قالین بچھا ہوا ہے۔ اس کے ایک کنارے پر بسندہ کے نیلگوں پانی کے ساتھ ساتھ ٹہس بٹے ہوئے ہیں جن کے مختصر بانچوں کے قدموں میں آکر ٹھنکین بسندہ پانی سر پٹتا اور جھاگ پیدا کرتا ہے۔ بسندہ کے اس جانب کا حصہ صاف ہے اور اس پر اتوار کی ست اور شفاف صبحوں کو پرائیوٹ موٹر بوس اور سپر بوس منڈلاتی ہوئی بسندہ لہروں پر چمپا کے پیدا کرتی نظر آتی ہیں۔ صاف صبح میں ایک جانب بے آباد جزیرہ اور آبی جھاڑیوں اور گھاس کے جھنڈ بھی نظر آ جاتے ہیں۔ کشتی پر بیٹھ کر بسندہ میں قاصلے سے دیکھا جائے تو سرسبز گھاس، روغن شدہ دیکھے ٹہس، گالف کورس اور فرارے بھرتی کشتیاں اسے تین الاقوامی ساحلی شہر کارنگ دے دیتے ہیں۔

اُس صبح ناشتے کے بعد، جب میزبان اور دیگر مہمان رخصت ہو گئے تو میں اُن کے ہم راہ لان چیمبرز پر بسندہ کے رخ نرم اور سنہک ہوا میں آکر بیٹھ گیا۔

نہ جانے مجھے بسندہ، جزیروں اور ریگستانوں کی یہ نسبت پہاڑ اور جنگل کیوں کراہتی جانب زیادہ بلاتے ہیں۔ شاید اُن میں چھیدگی اور اسرار زیادہ ہوتے ہیں، حیرت کا سامان زیادہ ہوتا ہے یا پھر شاید میں پہاڑوں کا بیٹا ہوں اور جنگلوں کا خود رو پودا!

اُس روز سویرے بسندہ کی نیم خشک ہوا کپڑوں میں سے گزرتی ہوئی بدن سہلائی تھی اور روح کی بے چینی کو قرار سے ہم کنار کرتی تھی۔ بسندہ پر ایک شانتی تھی جو ہم میں نکل ہوتی تھی۔ وہی شانتی جو قلندر، درویش اور صوفی کا اثاثہ ہوتی ہے۔

احمد صاحب نے بسندہ کے اُن دیکھے جزیروں پر نگاہیں دُور کہیں مرکوز کر دیں اور بولے ”ہم فلمنگ روڈ پر رہتے تھے۔ وہاں میرے چچا ایک مرتبہ ایک قلندر مجھ کو بابا کو لے آئے۔ وہ مجھ کو غیب کا حال بتاتا تھا۔ اُس نے میرے بارے میں بہت سی باتیں درست بتادیں۔ ان میں میرے حراز اور عمومی نوعیت کی باتوں کے بارے میں قیاس آرائیاں ہوئیں تو شاید میں یقین نہ کرتا۔ اُس نے حقائق پر مبنی چند ایسی باتیں بتائیں کہ میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ بہت اچھی طرح معلومات حاصل کر کے خوب تیاری کر کے آیا ہے۔ ابھی میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ ہمارے، نظر کے چشموں کے معروف کاروباری فرد، ای۔ پلومر (E-Plomer) والے دوست ملے آ گئے۔ انھیں دیکھ کر مجھ کو بہت یاد آیا کہ وہ چھ بھائیوں میں

جو تھے نمبر پر ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی حقائق پر مبنی باتیں بتائیں۔ پس اس سے میرا تذبذب بہت حد تک ختم ہو گیا اور میں ماورائے نظر علوم کا کچھ حد تک قائل ہو گیا۔ ماورائے نفسیات (Parapsychology) اور ما بعد الطبیعیات (Metaphysics) کے وجود پر میرے اندر سے گواہی اُٹھتی ہے۔“

شاید سمندری ہوا کی یہ یک وقت آداس اور مسرت آگئیں سرسراہٹ نے میرے کانوں میں چند نام پھونکے یا پھر یہ میرے اندر سے اُٹھنے والا تجسس تھا جو میرے ہونٹوں پر اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور قدرت اللہ شہاب کے نام لے آیا۔

شاعروں کے متعلق عمومی عوامی تصور پایا جاتا ہے کہ وہ کم سن، کچھ جھپٹی کچھ نکلی، اپنی موج و مستی کے غلام اور ذمے داریوں سے مجتنب ہوتے ہیں۔ اس تصور کو جگر مراد آبادی، میراجی، اختر شیرانی، ساغر صدیقی، اسرار الحق مجاز، جون ایلیا اور بہت سے دیگر شعرا نے راج کیا ہے۔ امجد صاحب کو میں نے بے شمار قاتلوں میں اس کے برعکس پایا۔ وہ کچھ موجود میں حاضر، دنیوی ذمے داریوں کے پاس دار ہیں۔ جب ان لوگوں کا تذکرہ آیا تو امجد صاحب یوں گویا ہوئے جیسے ابھی انہی کے پاس سے اُٹھ کر آرہے ہوں۔

”ہم فلمنگ روڈ پر رہتے تھے، وہیں اے حمید رہتے تھے۔ ہانکے جمیلے گورے بچے ہالی ووڈ کے فن کاروں کی مانند تک سب اے حمید کو ملے اشفاق احمد آیا کرتے تھے۔ اشفاق صاحب خوب وجہ آدمی تھے۔ تب تک انھوں نے داڑھی نہ بڑھائی تھی بلکہ مغربی رنگ میں خاصے رنگے ہوئے تھے۔ سو اے حمید اور اشفاق احمد کی جوڑی خوب زندگی سے معمور اور بھرپور نظر آتی۔ میں ان دونوں ادب کے ابتدائی زبچے چڑھ رہا تھا اور وہ خاصے بلند مقام پر کھڑے تھے۔ میرا ان سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ ان سے شناسائی کی مہم خواہش بھی دل میں کروٹیں لیتی رہتی۔“

”اشفاق صاحب سے اُس دور میں کوئی صاحب سلامت نہ ہوئی؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولے۔

”نہیں، البتہ بعد میں میرا اُن سے خاصا قریبی تعلق قائم ہو گیا۔ وہ یقیناً ایک غیر معمولی آدمی تھے۔ جدید دور کے داستان گو تھے۔ اُن کی زبان میں قدرت نے کچھ ایسی کشش اور دس ڈال دیے تھے کہ اگر وہ ایک ہی واقعہ پانچ مختلف مواقع پر سناتے تو ہر مرتبہ نیا لطف دیتا۔ اُن کی تحریروں اور ڈراموں سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو ان کی گفت گو انھیں ایک الگ منفرد طرز کے داستان گوؤں کے زمرے میں شامل کر دیتی ہے۔“

”حسن کوئی، داستان کوئی ہی تو برصغیر کی منفرد روایت ہے۔ یہاں کیا کمال کے داستان گو، شعری قصائص کے بیان کرنے والے، درباری لطیفہ گو اور چوپال سنانے والے روایت کو موجود رہے ہیں۔ ایسی روایت مغرب میں نایاب نہ سہی تو کم پایاب ضرور تھی“ میں نے بات بڑھائی۔

”حسن گفت گو اور تخلیقی ادب سے ہٹ کر اشفاق صاحب میں چند غیر معمولی خوبیاں تھیں“ امجد صاحب نے محبت سے معمور آواز میں کہا۔

”وہ بہت محبت والے انسان تھے۔ میں فتویٰ لطیفہ میں نووارد تھا۔ میرا لکھا ڈراما ”وارث“ غیر معمولی طور پر مقبول ہو گیا اور بے طور شاعر بھی میری پہچان قائم ہونے لگی۔ اشفاق احمد اور ان کی بیگم بانو قدسیہ نے مجھے بہت محبت دی۔ اشفاق صاحب خود بہت محنت اور تنگ و دو کے بعد آگے آئے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کی باقاعدہ

طور پر منصوبہ بندی کی تھی۔ اُن کے لیے موزوں لفظ لائق پسند (Likeable) ہے۔ جوں جوں اُن کی عمر بڑھتی گئی، وہ اپنی خوش گلائی کی اہمیت سمجھ گئے اور اس خوبی کی جانب اپنی توجہ زیادہ مبذول کر لی۔

”گزروالی چائے کی طرح انھوں نے ادب و گفت گو میں تصوف کی شکر گھولی۔“ ابھی میری بات سچ ہی میں تھی کہ احمد صاحب نے میرا جملہ اُچک لیا۔

”وہ حقیقی طور پر تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ ان کے بابا نور والے کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ اُن کا ممتاز مفتی کی کتاب الکھ گری میں بھی تذکرہ ہے۔ درحقیقت اشفاق صاحب نے روحانیت کو چمکا دینا کراہی تحریروں میں پیش کر دیا۔ یہ بھان کی پرانی روایت رہی ہے۔ روحانیت پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی شاعری کی شریاںوں میں ازل سے دوڑ رہی ہے۔ انھوں نے لوگوں کو اس روایت کی یاد دلادی۔“

نور والے بابا فضل شاہ صاحب نے سو برس سے اوپر عمر پائی تھی اور ممتاز مفتی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور دیگر بہت سے ادیبوں اور دیگر افراد کے افکار کو متاثر کیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ پاکستان کے قیام سے قبل ہند کے صوفی بزرگ ایک جگہ اکٹھے ہوئے تھے جہاں اس مملکت کے قیام کا فیصلہ ہوا تھا۔ بابائی کی اس بات پر لوگوں کا اعتماد حیرانل ہو جاتا اور وہ شک میں مبتلا ہو جاتے۔ اس بارے میں ممتاز مفتی نے الکھ گری میں لکھا تھا ”مجھے بابائی کی یہ بات بہت مکی۔ ابتدا پر ادب و ادب اور یوں بر ملا، اور پھر اتنا تقاضا۔ اس محفل میں کسی نے کہا، بابائی یہ جو پاکستان ہے، یہ کیا اسلامی مملکت ہے۔“ بابا بولا ”پتر! ابھی توجہ پڑا ہے، ابھی بونا لکھے گا اور جب بوئے پر پھول لگا تو ساری دنیا حیرت سے دیکھے گی۔“ واللہ اعلم بالصواب۔

”ایک دل چسپ واقعہ ہے۔“ احمد صاحب نے یادوں کے آئینے سے وقت کی دھول صاف کرتے ہوئے کہا ”1952ء میں اشفاق صاحب اٹلی گئے۔ وہ وہاں کے شہر میلان میں گئے۔ انھوں نے ٹائی سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اُس وقت اطالیہ کے لوگ پاکستان کو زیادہ نہ جانتے تھے اور اسے ہندوستان ہی کا حصہ سمجھتے تھے۔ ہندوستان کو جو کیوں ساحلوں کی ایسی سرزمین سمجھا جاتا تھا جہاں لوگ قرون وسطیٰ میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کے لوگ جنگلوں اور غاروں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اشفاق صاحب لوگوں کا یہ تصور ختم کرنا چاہتے تھے۔ سو انھوں نے وہاں لوگوں کو پاکستان میں موجود اُس دور کی جدید چیزیں، ٹیلی فون، ریل گاڑی، موٹر کاروں وغیرہ کا بتایا۔ میلان میں انھوں نے ایک موقع پر مابعد الطبیعیات کے خلاف بولنا شروع کر دیا تاکہ اطالوی انھیں ماذن سمجھیں اور اپنے میں شمار کریں۔ وہیں ایک طبیعیات (Physics) کا پروفیسر موجود تھا۔ جب اشفاق صاحب خوب بول چکے تو اُس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا ”میں تم سے ہاتھ ملانا چاہتا ہوں۔“ اشفاق صاحب نے گوگو کیفیت میں اُسے دیکھا تو وہ بولا ”میں ستر برس کا ہو کر اپنے شعبے کے بارے میں کچھ بھی احتیاط سے حقیقی طور پر نہیں کہہ سکتا جب کہ تم ایک ایسے موضوع کے بارے میں حرفہ آخر کہہ کر حقیقی طور پر مطمئن ہو جس کے بارے میں تم جانتے ہی نہیں۔“

عموماً دیکھا گیا ہے کہ دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں کے اعلیٰ ترین دماغ، نوبل انعام یافتہ سائنس عاجز ہوتے ہیں اور مبتلا علم وہ حاصل کرتے ہیں اتنا ہی اپنی کم علمی کا اور اک ہونے کی بنا پر منکسر ہو جاتے ہیں۔

مستند ادیب و خوبصورت راوی ہیں کہ ایک مرتبہ اشفاق احمد صاحب نے انھیں بتایا کہ انھوں نے خاموشی کو

ریکارڈ کیا۔ انھوں نے چستان کے صحرا، امن آباد کی ڈھنگی گراؤٹ اور اعدولہ لاہور کی گیت کی رات بارہ بجے کے بعد کی خاموشی ریکارڈ کی۔ انھوں نے ان خاموشیوں میں در آنے والے زیر و بم میں واضح فرق پایا۔ گویا خاموشی کی زبان، زمان و مقام کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ صحرا میں قدیم کھڑکی ہول ناک خاموشی، بہار کے موسم میں جوین پر آئے باغ میں چھائی انبساط انگیز خاموشی اور گرمیوں کے خشک میدانوں میں جینہ برسنے سے پہلے جس آلود خاموشی میں یقیناً فرق ہوتا ہے۔

امجد صاحب نے مزید کہا۔

”اشفاق صاحب میں اگر شہرت کی خواہش تھی تو، چند لوگوں کو چھوڑ کر، کس جھٹکی شخص میں زیادہ لوگوں تک پہنچنے اور اپنے فن کی پذیرائی کی خواہش نہیں ہوتی؟ اگرچہ ان میں بناوٹ آجاتی تھی پر یہ اتنی جھٹکی ہوتی تھی کہ ان کی ذات کا حصہ بن گئی تھی۔ وہ خالص محبت سے بھرے بندے تھے اور اتنی ہی پر خلوص بانو قدیر تھیں۔ وہ غضب کا مشاہدہ رکھتی تھیں۔ کبھی طالب علمی کے دور میں اپنے کالج کو رنٹ کالج، لاہور کے لڑکوں کے ہوسٹلوں میں گئی ہوں لیکن اگر اپنے ناول ”رجب گدھ“ میں اس مختصر مشاہدے کی شاندار طریقے سے عکاسی کی تھی۔ ان کے اندر مادہ نہ شفقت تھی۔ ایک بڑا پن، ایک عاجزی تھی۔“

ایک مرتبہ نور اہدی شاہ نے کراچی میں عالمی اردو کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے بانو قدیر کا حوالہ دے کر کیا خوب صورت بات کہی تھی ”بانو آپا کہتی تھیں کہ اگر مجرم سے اُس کے جرم کی پناہ نہ لے کر اور اسے غصے سے دیکھو تو کبھی مجرم کی ماں بن کر بھی سوچو۔ اُس کی بھی ماں ہوتی ہے۔ مجرم کو اپنے بیٹے کی جگہ رکھ کر دیکھو۔“ انسان کا اپنے حالات، واقعات، مرثیہ، جنینائی ترکیب اور وقتی جذباتی انبال کا غلام ہونے اور اس کے باعث قاتل یا رجم ہونے پر کیا مندریں بات ہے۔

”عاجز تو قدرت اللہ شہاب بھی تھے۔“ میں نے لقمہ دیا تو امجد صاحب نے انھیں یاد کرتے ہوئے ایک حلقہ، اور جمل اور توازن بات کہی۔

”میری شہاب صاحب سے زیادہ ملاقات تو نہ رہی۔ پر جو رہی اس میں ان کے حلقہ تاثر کم گو، سادہ اور بڑبڑاٹھ شخص کا انھما۔“

امجد صاحب نے توقف کیا اور مسکراتے ہوئے واقعہ سنایا ”جزل ضیا الحق کے زمانے میں جزل کے ایم عارف سی این سی تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ملاقات کے لیے مجھے بلایا۔ میں اُن کے پاس پہنچا تو انھوں نے ایک خواہش کا اظہار کیا۔“

”کون سی خواہش؟“ میرے لہجے میں تجسس تھا۔

”انھوں نے کہا کہ اسی کی دہائی میں، ہوش سنبھال کر، فوج میں آنے والے جوان نے پاکستان بننے نہیں دیکھا۔ لہذا وہ بزرگوں کی قربانیوں، اشغال آبادی کی صعوبتوں اور عدیم الطیر جذبے سے قطعاً کٹائی طور پر آشنا ہے۔ انھوں نے خواہش کا اظہار کیا کہ ہم فوجی جوان کو جذباتی طور پر قیام پاکستان کے دور میں لے جائیں تاکہ اُس کے اندر دلولہ تازہ پیدا ہو۔ سو اُن کی خواہش پر ایک فلم بنانے کا منصوبہ بنایا گیا۔“ امجد صاحب نے توقف کیا۔

”اس قلم سے متعلق اظہارِ تشکر کی ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں دوسو ملین بلائے گئے، ایک میں تھا اور دوسرے قدرت اللہ شہاب صاحب تھے۔ وہیں میری پہلی ملاقات شہاب صاحب سے ہوئی۔ میں نے انھیں متین اور سنجھا ہوا انسان پایا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ قلم بننے کے دوران مجھے لینے کے لیے آری نے گاڑی بھیجنا شروع کی۔ پہلی مرتبہ ایک گاڑی آئی، دوسری مرتبہ مختلف گاڑی آئی اور تیسری مرتبہ پہلی والی گاڑی ہی آئی۔ جب میں نے ڈرائیور سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ یہ ہمارا قانون ہے۔ بذِ لطف معاملہ تو یہ ہے کہ جب قلم کی ایڈیٹنگ ہو رہی تھی تو ان میں سے آری کی ایک گاڑی چوری ہو گئی جو بعد ازاں علاقہ بغیر سے لی۔ مجھے قلم کے بنانے کے عمل کو خیر رکھنے کے معاملے نے خاصا لطف دیا۔ ایک روز میں جنرل کے۔ ایم۔ عارف سے پوچھ ہی بیٹھا کہ اگر ہندوستان میں ایسی ہی قلم بن رہی ہو تو کیا ہمیں پتا چل جائے گا۔ اس پر جنرل صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس پر رائے دی کہ پھر تو امکان یہی ہے کہ ہندوستان والے ہماری قلم کے بارے میں بھی جانتے ہوں گے۔ سو اس معمولی سے معاملے کو اتنا چھپانے کا کیا فائدہ۔“

میں نے شہاب صاحب کا ذکر پھر سے چھیڑا تو بولے ”اشفاق احمد بہت خلوص اور سنجیدگی سے شہاب صاحب کی تعریف کیا کرتے تھے۔ ایک لڑکا دور دراز گلت سے چلا اور برطانوی دور میں اپنی قابلیت سے بلند مقام تک پہنچا تو اس میں کوئی تو خوبی ہوگی۔ مجھے تو اس بات میں بھی کوئی خامی نظر نہیں آتی کہ انھوں نے حکومتِ وقت کے احکامات کی بجا آوری کی۔ اگر انھوں نے ایوب حکومت کی ترجیحات اور احکامات پر عمل کیا تو یہ طور ایک سرکاری ملازم اپنی ذمہ داری نبھاتی۔ یہ اُن کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ ایسا نہ کرتے تو خیانت کرتے۔ اُن سے مشورہ مانگا گیا تو حکومت کے فائدے کا مشورہ دینا اُن پر لازم تھا۔ شہاب صاحب نے اس سے ذاتی مفادات حاصل نہیں کیے۔ ان پر بے دینائی یا رشوت ستانی کا کوئی الزام نہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا، ایک ملازم پیشہ شخص سے اپنی ملازمت کے حوالے سے ایسی ہی دیانت کی توقع کی جانی چاہیے۔“

میں نے اشارۃً ایوب دور میں قائم ہونے والے رائٹرز گِلڈ کا تذکرہ کیا تو امجد صاحب کھنکار کر بولے ”شہاب پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے ایوب کے ایما پر رائٹرز گِلڈ قائم کر کے ادیبوں کو خریدنے کی کوشش کی تو اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے استفسار کیا۔

”ہم اس معاملے کو اس طرح بھی دیکھ سکتے ہیں کہ انھوں نے ادیبوں کو بے حالی اور گرم نامی سے اُٹھا کر سرکاری طور پر پزیرائی دلائی، انھیں معاشرے کے معزز اراکین کے طور پر شناخت کیا گیا۔ ادیب شکوہ کناں رہتے ہیں کہ انھیں حکومت پوچھتی نہیں، اگر پوچھ لے تو کہا جاتا ہے کہ خریدنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ شہاب صاحب نے صرف ایک پلیٹ فارم ہی نہیں فراہم کیا بلکہ ان کی بھوک بھی کوشش کی۔ یہ قابلِ قدر امر تھا۔“

میں نے سوچتے ہوئے کہا ”جیسے آج کل منعقد کیے جانے والے ادبی جشن اور میلے بے جا تنقید سمیٹتے ہیں۔ جب کہ سفارت خانوں، ملٹی میڈیئل کمپنیوں اور بینکوں کے تعاون سے برپا کیے جانے والے ان میلوں نے کسپری اور عدمِ توجہی کے شکار عام ادیب کو کلی محلے کے چائے خانوں اور سکھروں، ویکٹوں سے اُٹھا کر بیچ ستارہ ہوٹلوں

اور پڑھنا و قاریات کا سرگرم کر اس کی عزت افزائی کی ہے۔ بیورو کرکسی میں ایک انگریزی قول سینہ در سینہ چلا آتا ہے۔

"If you do something, something will go wrong. If you do nothing, nothing will go wrong."

"اگر تم کچھ نہ کرو گے تو کچھ بھی غلط نہ ہوگا۔ اگر تم کچھ کرو گے تو امکان ہے کہ کچھ نہ کچھ غلط ہو جائے گا۔"
"ان کے روحانی معاملات؟" میں نے استفسار کیا۔

"گو شہاب صاحب کے روحانی معاملات کے حوالے سے بہت سی باتیں حلق سے نہیں اتریں تاہم انہیں بے یک جہش دست برد نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شخص کا تجربہ، مشاہدہ اور احساس مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص کا تجربہ مجھ پر نہیں گزرا یا میری فہم سے ماورا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ غلط بیانی ہو۔ پس ہماری نظروں میں فرق ہے۔ شہاب صاحب کے معاملات فریبہ خیال، باطل یا حقیقت، کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ ان پر قطعیت سے فیصلہ صادر کر دینا محال ہے۔"

"اگر دیکھا جائے تو اپنی جوانی اور ادھیڑ عمری کے دور تک اشتقاق صاحب اور شہاب صاحب مغربی وضع قطع اور ذہن رکھتے تھے۔" میں نے مسکراتے ہوئے امجد صاحب سے کہا تو وہ بولے۔

"اس طرح تو واصف علی واصف جیسے درویش سو فی موٹ ٹائی مین کر انگریزی ٹیوشن سینٹر چلاتے تھے۔ البتہ ان میں نیم مجذوبیت کا رنگ واضح طور پر جب بھی موجود تھا۔ قرۃ العین حیدر سے بڑھ کر مغربی طرز حیات کا مشاہدہ اور تجربہ کس اور ادیب کو ہوگا۔ مگر میں نے ان کے حوالے سے بھی ایک منفرد مشاہدہ کیا۔"

"وہ کیا؟" میں نے نصف التہار کی جانب رواں دواں حدت دیتے سورج کو دیکھتے ہوئے اشتیاق سے کہا۔ ہمیں وہاں بیٹھے بہت دیر ہو چکی تھی اور سفید رنگ کی بیدی کرسیاں ساہوں میں خنجر کردی گئی تھیں۔

امجد صاحب نے بے چینی سے پہلو بدلا اور بولے "یہ 1989 کا قلعہ ہے۔ میں عمرہ کرنے سعودی عرب گیا۔ میرے ساتھ جمیل الدین عالی اور قرۃ العین حیدر بھی تھے۔ قرۃ العین حیدر مذہب کی جانب خاص رجحان نہ رکھتی تھیں۔ بہر حال وہ وہاں عرب حکم رانوں کو برا بھلا کہتی رہیں۔ مکہ کی روح پرورد فضا میں نہ جانے ایسا کیا جادو تھا کہ وہاں جا کر وہ کچھ لمحوں میں ایسی سمجھ ہوئیں کہ خاموش ہو گئیں۔ رات کا پچھلا پہر تھا، خانہ کعبہ کے صحن میں ہم پر گویا کوئی نفوس پھونک دیا گیا۔ ہم میں دل میں ایمان کی آج رکھنے والے اور تھکی کے شکار لوگ، سبھی شامل تھے، مگر وہاں کا معاملہ ایسا تھا کہ سبھی کیف و وجد کی کیفیت میں آ گئے اور پوری رات گزر جانے کا احساس ہی نہ ہوا۔ شروع میں ہم نے وہاں دین کی بات کی اور اللہ تعالیٰ کی ماہیت پر غور کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ سب نے ادب آمیز خاموشی کی کھلی اوڑھ لی۔ یہاں تک کہ صبح کے چار، پانچ بج گئے۔ جب میں وہاں سے اٹھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ قرۃ العین حیدر نوافل پڑھ رہی تھیں۔"

"یقیناً دل میں موجود ایمان کی رقی اور رقی کا مرکز شاس رب ہے۔ انسان، کسی دوسرے کے بارے میں ایمان و کفر کا فیصلہ صادر کر کے اللہ کی ربوبیت میں مداخلت کرتا ہے اور تکبر و شرک میں مبتلا ہوتا ہے" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو امجد صاحب اٹھے ہوئے بولے۔

”پروفیسر احمد رفعتی اختر جیسے صوفی مثل آدمی کے دوستوں نے کالج کے زمانے ہی میں ان کا نام جوگی رکھ دیا تھا۔ وہ بھی انگریزی کے استاد تھے اور ساری زندگی پینٹ شرٹ میں نظر آتے رہے ہیں۔ چند لوگ بہت پسندیدہ ہوتے ہیں، خوشی کا باعث بننے ہیں۔ اشفاق، بانو، شہاب، واصف، احمد رفعتی اختر یہ بہت پیارے انسان ہیں جو لوگوں میں خوشیاں اور سکون بانٹتے رہے ہیں۔ اسی فہرست میں نہیں حنیفہ تاب کو بھی شامل کرنا چاہوں گا۔ ہمیں ان لوگوں کی ان خوبیوں کی قدر کرنی چاہیے۔“

ہم کراچی کے سمندر کنارے کلب سے تو اٹھ آئے پر میں پروفیسر احمد رفعتی اختر سے، اپنے دور طالب علمی کی، نوے کی دہائی کے اوائل کی، ان کے گوجر خان میں واضح گھر میں ہونے والی پہلی ملاقات کی یادیں یوں ساتھ لے آیا جیسے غلی کو چھوڑ دینے کے بعد بھی اس کے پھول کا رنگ انگلیوں کی پوروں پر اتر چلا آتا ہے۔ یہ نوے کی دہائی کا واقعہ ہے کہ میں نے ایک مشترکہ شناسا سے پروفیسر احمد رفعتی اختر کا تذکرہ سنا۔ اُن دنوں میں یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا، داغ میں کارل مارکس، برٹریڈ رسل، جیمز فریزر، ڈارون اور پاکستانی بائیس بازو کے دانشوروں کو پڑھ کر تفکیک کا خناس سلیا ہوا تھا، لڑکپن کا عالم تھا اور شریالوں میں خون جوش مارتا تھا پر اسے کوئی رستہ نہ ملتا تھا اور نادانی میں بہکتا پھرتا تھا۔ ایسے میں پروفیسر صاحب سے ملنے کے لیے لاہور سے گوجر خان میں اُن کے گھر تک سفر کا قصد کیا۔

یہ اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ ایک اُن جانے خوف اور ہم نے دل کو کیلکڑے کی طرح جکڑ لیا۔ یوں گلتا جیسے ابھی کہیں سے کسی قریبی عزیز کی موت کی خبر آ جائے گی، کوئی حادثہ درپیش ہو گا یا کوئی آفت ٹوٹ پڑے گی۔ جی ہر وقت سہا رہتا۔ میں نے اُس تجنی دوپہر میں اُن کے گھر کے سامنے والے میدان میں گاڑی پارک کی اور گھر کے دروازے کے ساتھ گلی اطلاق کی گھنٹی بجائی۔ پہلے سے وقت لے رکھا تھا۔ سو گھر کی سادہ سی بیٹھک میں بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پروفیسر صاحب تشریف لے آئے۔ اُس دور میں تو سوشل میڈیا تھا اور نہ ہی پروفیسر صاحب کا غیر معمولی تذکرہ۔ سو سوچ رکھا تھا کہ لمبے لمبے عمامہ پہنے، لمبی سفید داڑھی اور ناتھ پر محراب کا نشان لیے کوئی صاحب تشریف لائیں گے۔ پروفیسر صاحب کے چلنے نے حرمت میں جلا کر دیا۔ لیکن شیوہ، ہاتھ میں سگریٹ کی ڈبیا تھا، چہرے پر مسکراہٹ لیے پروفیسر صاحب تشریف لائے۔ میں اُن کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور غور سے دیکھتے ہوئے بولے ”آپ نے اپنے دل میں اُن جانے خوف کو کیوں بے وجہ پال رکھا ہے۔“ اُن کی بات سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ میں اب تک خاموش تھا۔ پس وہی بول رہے تھے۔ انہوں نے گویا چند جملوں میں میرے توہم و تکلیف کو میرے دل سے چٹکی میں پکڑ لیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اُن سے اپنی مختصر بساطِ عمل کے مطابق سوالات کیے۔ ان کے انصاف نے نہایت سلیجے ہوئے انداز میں، دین و فلسفے، سائنس و ادب کے حوالے دیتے ہوئے، اطمینان بخش اور مدلل جوابات دیے۔ فلسفے، افلاطون، کانت، کینیوشس، سچو وا ایپے عظیم فلسفیوں اور شیپیر سے لے کر کافکا تک کے ادیبوں کے یوں حوالے دیے جیسے یہ ابھی اُن کی محفل سے اٹھ کر آئے ہوں۔ معاملہ صرف ان کے صاحبِ دلم ہونے تک محدود نہ تھا بلکہ اُن کی شخصیت میں ایسی جاذبیت تھی، گفت کو میں روانی اور لطافت تھی اور محفل میں سکون تھا کہ مخاطب کے بے قرار

دل کو قرار آ جاتا تھا۔ اسی دوران ایک بیگز ان سے ملے آگئے۔ پروفیسر صاحب نے بیگز سے ایک جانب صوفے پر بیٹھ جانے کی درخواست کی اور مجھ عام سے طالب علم سے خاصی دیر محو گفت گورہے۔ گویا معاشرتی تقدیم پر مہمان داری کے تقدم کو فیت دی۔ جب میں نے رخصت ہونے کی اجازت مانگی تو مجھے پڑھنے کو تسبیح دی۔ بعد ازاں ان سے چند ملاقاتیں ہوئیں، میں عملی زندگی میں آگیا، لاہور و پنڈی سے دور ہو گیا اور ان سے مدتوں ملاقات نہ ہو سکی۔

ابھی کچھ ہی عرصے پہلے میں ان سے ملنے لاہور سے پنڈی کے نزدیک ان کے حالیہ محل پارہ پرواقع ڈیرے پر پہنچا اور گھنٹے بھر کی ملاقات کے بعد واپس لاہور آگیا۔ رستے میں ایک آن جانے احساس سے مغلوب رہا۔ یک دم مجھ پر مشکف ہوا کہ میں جتنی دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا تھا، امن اور سکون نے مجھے اپنے حلقے میں لیے رکھا تھا۔ میں ان کی اس خوبی کو بھول چکا تھا اور یہ اس طرح مجھے یاد آگئی جیسے اپنے آبائی گھر کی جانب مدتوں بعد مراجعت کے دوران پرانا برگد کا درخت یا ہم سائے مکان سے جھانکنی پھولوں کی ڈالی اپنا بچپن یاد دلا دے۔ پروفیسر احمد رفعتی اختر کے چاہنے والوں میں جرنیل و بیوروکریٹ، شاعر و ادیب، چھاپڑی والے سے لے کر پرچون فروش اور گدائے بے نوا شامل ہیں۔ جنرل اشتفاق پرویز کیانی سے لے کر سابق آئی جی شعیب سڈل ٹک، صفائی ہارون الرشید سے لے کر جاوید چودھری، ممتاز مفتی، اشتفاق احمد، مستنصر حسین تارڑ اور امجد اسلام امجد جیسے ادیب اور شاعر ہیں۔

اگر چند الفاظ میں کسی شخص کی شخصیت کا احاطہ کرنا ہو تو احمد فراز کے لیے ”شرارتی، محزون“، منیر نیازی کے لیے ”خوگن“، فیض احمد فیض کے لیے ”شقیق و کشادہ دل“، ساغر صدیقی کے لیے ”فقیر“، مجید امجد کے لیے ”گم سم“، ناصر کاظمی کے لیے ”اداس“، م۔ راشد کے لیے ”پڑھکوہ“ اور پروین شاکر کے لیے ”رومانی“ کے الفاظ ذہن میں آتے ہیں تو امجد اسلام امجد کے لیے ”پڑھنیل، عاجز و حلقہ“، موزوں الفاظ ٹھہرتے ہیں۔

وہ عام شعری چلن سے ہٹ کر بارہا اپنی الہیہ کا محبت بھرا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس معاملے میں ذہن پنجابی کے عمدہ اور کچھ حد تک بھلا رہے گئے شاعر شریف کچھائی کی جانب چلا جاتا ہے جنہوں نے غلو میں دل اور سچے آن مول جذبات کے ساتھ اپنی بیوی کی تعریفیں لکھیں۔ بیوی سے محبت ایک قابل ستائش جذبہ ہے جس کی وہ حق دار ہوتی ہے کہ مکان کو گھر بناتی ہے۔

امجد صاحب کی حاضردماغی کے تین واقعات ہیں۔

ایک مرتبہ انہما آئس کونسل لاہور میں وہ بیاد احمد ندیم قاسمی سے متعلق اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ اجلاس میں زیر بحث تھا کہ کس ادیب و شاعر کو صدارت کے اقبال سے فخریاب کیا جائے۔ مختلف نام زیر غور تھے۔ میں نے ایک اہم شاعر کا نام تجویز کیا۔ امجد صاحب نے ان شاعر کے رجب کا اعتراف کیا تو ایک شریک محفل نے نقدہ دیا۔

”بے شک وہ صاحب اہم اور بڑے شاعر ہیں لیکن جب گفت گو کرنے پر

آتے ہیں تو ان کی توہوں کا رخ کسی بھی جانب ہو سکتا ہے۔ ان کے

بارے میں پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ وہ Unpredictable ہیں۔“

اس پر احمد صاحب نے فوری کہا۔

”وہ ناقابل پیش گوئی Unpredictable نہیں ہیں بلکہ

Predictable (قابل پیش گوئی) ہیں۔ وہ یقینی طور پر کوئی گڑب

فرمائیں گے۔“

ہندوستان میں مشاعرہ تھا۔ احمد اسلام احمد اور عطا الحق قاسمی ریلوے اسٹیشن سے مشاعرہ گاہ کچھ یوں پہنچے کہ انھوں نے اپنا اپنا سامان اٹھا رکھا تھا۔ مشاعرے کے بعد سارا سامان عطا صاحب نے اٹھایا ہوا تھا۔ ایک شریک محفل نے ہم دودی سے کہا ”دیکھئے صاحب! سب بوجھ عطا صاحب نے اٹھا رکھا ہے اور احمد صاحب خالی ہاتھ ہیں“ اس پر احمد صاحب بے ساختہ بول اٹھے۔

”میرے ذہن پر عطا کی غزلوں کا بوجھ اس وزن سے کہیں زیادہ ہے جو عطا

نے اٹھا رکھا ہے۔“

ایک اور واقعہ ہے۔ اپنے سفر نامے ”سفر دستر“ میں عطا الحق قاسمی صاحب کے بارے میں بذلہ نثری سے لکھتے ہیں ”ثرین میں سوار ہو کر عطا الحق قاسمی نے باقی سب کام ڈیٹ پر آئی ہوئی لڑکی کی طرح مجھ پر چھوڑ دیا۔“ انھرا آئرش کوسل کے ایک کمرے میں ٹیوب لائنٹ کی سفید مٹی ہوئی روشنی میں بیٹھے ہوئے مجھے ایک واقعہ سنایا ”ایک مشاعرے میں ایک بہت حسین و دلکش خاتون میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ دوران مشاعرہ بے اختیار نظر اُس کی جانب اٹھ جاتی تھی۔ وہ ٹک میری جانب دیکھ رہی تھی۔ مشاعرہ ختم ہوا تو حاضرین میرے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ وہ خاتون بھی اُس جانب چلی آئی اور پیچھے کڑی ہو کر میرے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ میں سمجھ گیا۔ لوگوں کے چمکنے ہی وہ میرے پاس چلی آئی اور بولی ”میں آپ کی بہت فین ہوں۔ مجھے آپ کی بہت سی نظمیں زبانی یاد ہیں مگر مجھے آپ سے مل کر مایوسی ہوئی ہے۔ آپ کی شاعری میں سوز (Pathos) اور نوحن (Melancholy) ہیں جب کہ میں پچھلے دو گھنٹے سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ مسلسل ہنستے جارہے ہیں۔ میں نے اُسے جواب دیا بی بی اگر میں ہر آدمی کی خواہش اور اُس کے تصور کے مطابق اپنا منہ بنانے کی کوشش کروں تو نہ جانے میرا کیا ہو جائے۔ میں نے اُسے اپنا ایک شعر سنایا تو وہ مطمئن ہوئی۔

میں اپنے ہست کی تہائیوں میں روتا ہوں

یہ مسکراتا ہوا شخص ہے میرا ہم زا“

احمد صاحب نے یہ واقعہ سن کر قہقہہ لگایا۔ اپنی ذات کے حوالے سے کسی بات کا تذکرہ کر کے اُس پر ہنسنے کے

لیے بہت ظرف اور ہمت چاہیے۔ احمد صاحب جابہ جابہ واقعات بلا جھجک سناتے رہتے ہیں۔

عالم یہ انھی سے وابستہ حکایت ہے کہ کسی مشاعرے میں ایک فربہ شاعر اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے کچھ یوں سو گئے کہ اُن کا منہ کھلا تھا، ناگئیں پھیلی تھیں اور خزانوں کے باعث جسم لرز رہا تھا۔ احمد صاحب نے ساتھ بیٹھے شاعر کے کان میں مذکورہ شاعر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اُدھر دیکھیں۔ یوں نہیں لگتا جیسے کسی گینڈے کو کوئی لگی ہو۔“ یہ سن کر شاعر کے اندر سے ہنسی کا ایک گولا چھوٹا اور وہ بے اختیار ہو کر منہ پر ہاتھ رکھے اسٹج سے چلے گئے۔

انھرا ہی میں ایک ذاتی نفست کے دوران سنانے لگے ”میری محبت والی نظمیں بہت مقبول تھیں۔ جب بھی

کسی نشست یا مشاعرے میں جانا ہوتا تو ان نظموں کا تقاضا زور پکڑ لیتا۔ جب میں وہ نظمیں سناتا تو بہت داد ملتی۔ جب میرے بچے ہوئے اور ہے تھے تو میں نے فیصلہ کیا کہ میں ایسی نظمیں پڑھنے سے حتی الوسع گریز کروں گا۔ انہی دنوں لڑکیوں کے معروف کلمہ زور کالج میں مجھے مدعو کیا گیا۔ وہاں کی اساتذہ میں میری ایک کلاس فیلو بھی تدریس سے وابستہ تھی۔ حسب معمول مجھ سے اپنی مشہور نظم ”ایک لڑکی“ سنانے کی فرمائش کی گئی۔ میں نے نال دیا۔ اصرار پڑھا۔ اس میں میری کلاس فیلو بھی شامل ہو گئی۔ لہذا میں نے اپنی نظم پڑھنی شروع کی۔ سامنے کالج کی لڑکیاں، آنکھوں میں خواب اور ستارے سجائے بہت اشتیاق سے میری نظم سننے لگیں۔ میں نے ابتدائی بول سنائے ”گلاب چہرے پہ مسکراہٹ، چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبہ، وہ جب بھی کالج کی سیر میوں سے سہیلیوں کو لیے اترتی“ میں نے آخری مصرعے کو زور دے کر پڑھا ”تو ایسے لگتا تھا جیسے دل میں اتر رہی ہو“ تو سامنے بیٹھی ایک لڑکی نے بے ساختہ سوال کر دیا ”سہیلیوں سمیت؟“ مجھے آج تک اس لڑکی کا وہ بہ یک وقت حسرت بھرا، شوخ اور بے ساختہ سوال نہیں بھولا۔“

امجد صاحب کی ایک قابل قدر خوبی ان کا تخیل ہے۔ وہ لڑکپن میں جب یہ شعر کہتے ہیں

چلتے ہیں آرزو کے ستارے شراب میں

چلتے ہیں بے کسوں کو سہارے شراب میں

تب تک شراب کا ذائقہ چکھتا تو کیا دھڑ رز کا دیدار تک نہ کیا تھا۔

اسی طرح جب انھوں نے اپنے لازوال و شاہ کار ڈرامے ”دارت“ میں دیہی منظر کشی اور ڈرامائی سامراج کی عکاسی کی تھی تب تک وہ کبھی ایک رات تک کے لیے کسی گاؤں میں نہ ٹھہرے تھے۔ گویا یہ سب تخیل کی کرشمہ سازی تھی۔

تخیل کی یہ پرواز تاریخی ناول نگاروں میں بہم نظر آتی ہے جو ماضی بعید کے اس دور میں زندگی بسر کیے بغیر اپنے ذہن رسا کے سہارے اس کی عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں۔

چند حیران کن کردار ہیں۔

بین الاقوامی سطح کے ذہین، فطین، چمکنیں فن کاروں پر نظر دوڑائی جائے تو غلطی پر دیرپا اثرات چھوڑنے والے ایمانوئل کانت نے کبھی اپنے گھر کے دس میل کے دائرے سے باہر سفر نہ کیا تھا، اس نے شادی نہ کی اور گیارہ برس مکمل گوشہ نشینی اور تنہائی میں بسر کیے۔ اس کے باوجود خیال و فکر کی ایک وسیع دنیا تخلیق کی۔

انسانی نفسیات و معاشرت کی بے مثال عکاس چین آسٹن جس نے تکبر و تعصب (Pride and Prejudice)، لیڈی سوزن اور دیگر لازوال ناول ہائیں برس کی عمر تک تخلیق کر لیے تھے، دیہی انگلستان میں قیام پذیر بری اور صرف چند روز کے لیے لندن گئی۔

مغرب میں تہملک مجاہدینے والے شاعر آرتھر ریماڈ نے شاہ کار فن پارہ ”جہنم کا ایک موسم“ اٹھارہ برس کی عمر میں لکھا اور بیس برس کی عمر میں لکھنا چھوڑ دیا۔ اس نے دوبارہ کبھی قلم نہ اٹھایا یہاں تک کہ پینتیس برس کی عمر میں کینسر سے فوت ہو گیا۔ اس کے یہاں Imagery، تخیل، شعریت، جزئیات، فطرت و نفسیات ہمہ جہتی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کے بارے میں علمائے ادب نے لکھا ”اس کا چمکنی اور اس کی نمونہ بری، دھماکے دار

آد اور یک دم معدوی حیران کن ہیں۔“

ایمالو سالگاری نے کبھی سمندروں کے طویل سفر نہ کیے پر نہ صرف انیسویں صدی میں ملاحوں اور کتب خانوں سے کشید کردہ واقعات و معلومات کی بنیاد پر دوسو کے قریب ملاحوں، قزاقوں اور سمندری سفروں پر مشتمل ناول لکھ کر امر ہوا بلکہ بعد ازاں بھی اہم گردانا جاتا ہے۔

ادھر اپنے ہندوستان میں غالب کا سا عہد ساز شاعر جو لامحدود ذہن سے ایک جہان خیال تخلیق کرتا ہے، بہت کم دلی سے باہر قدم رنجہ فرماتا ہے۔

ایک مرتبہ رام پور جاتا ہے اور جب زندگی میں پہلی مرتبہ ساحلی شہر کلکتے کا سفر اختیار کرتا ہے تو وہاں کا کچھ ایسا شیدائی ہوتا ہے کہ پکار اٹھتا ہے

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

امجد صاحب کی شاعری اور دیگر تخلیقات میں خواب کا بار ہا تذکرہ تو قابل فہم ہے پر پنجاب کے زرخیز میدانوں میں رہنے والے پر سائل، سمندر، جزیرے اور ریت کیوں اتنا جادو اثر رکھتے ہیں۔ اس کی نفسیاتی پڑتال تجزیے کی متقاضی ہے۔

کیا اس سے یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ امجد کی شاعری کے یہ عوامل معاہداتی و تجرباتی نہیں بلکہ تخیلاتی ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امجد نے اپنی ہی دنیا تخلیق کی ہو اور وحشی طور پر اسی میں جیے ہوں۔ وہ ایک جہان خیال کے موجد ہوں اور اس سے اخذ کردہ عناصر کی بنیاد پر شعر تخلیق کرتے ہوں۔ ناصر کاظمی اپنی شاعری جیتا تھا۔ لاہور کی مجید بھری گلیوں، رات کے ستارے میں بھونکتے کتوں کی ٹوک دار آوازوں، پاک ٹی ہاؤس کے سامنے ایستادہ درختوں، راتوں کو مال روڈ کی ویرانی میں چلتی موج در موج ہوا کے ساتھ، راج دور کی برطانوی طرز کی عمارتوں کے پہلو میں چلا، انھیں جذب کرتا ناصر کاظمی اپنی چھوٹی بحر کی شاعری میں اسی اداسی اور تنہائی بھری رومانیت منعکس کرتا ہے۔ اس کے برعکس گمان غالب ہے کہ منیر نیازی نے ہیبت ناک جنگلوں، شکار تے سانپوں، آسیب زدہ ڈیوڑھیوں، مکانات اور انجمنی راہوں میں شاید زندگی کو نہ رہتا ہو مگر یہ سب جہانِ فسوں اس نے اپنے گرد و کھڑی کے جالے کی طرح بن لیا تھا اور اسی میں زندگی بسر کر دی۔

شاید امجد نے خواب اور ہوا کو اپنا رفیق بنایا، پوری دنیا الفاظ و خیال کی سلاخیوں سے بنی یافتہ اس کے ایک گوشے میں کبھی کبھار جابر ام کیا، غالباً انھوں نے ایک ایسی کٹیہا بنائی جس میں عموماً جا جوگ سنبھالا۔ جوانی میں جنوں خیر خفقی تابانی تھی، کھار کے ہم راہ شہرت تھی اور ہر دو اسٹاف میں مہارت تھی، چناں چہ عمر کا طلائی دور جوانی لکھوں میں بیت گیا۔

سے کے سمندر، کہا تو نے جو بھی، سنا پر نہ سمجھے

جوانی کی عی میں تھا تیز پانی، ذرا پھر سے کہا

”میری بہت عجوبہ روزگار لوگوں سے ملاقات رہی ہے۔“ امجد صاحب نے خوش دلی سے کہا۔ یہ فردری کے مینے کی بات ہے۔ کراچی میں سردی کم کم ہی رن کرتی ہے، لوگ رسا جریاں اور گرم کپڑے

ماہن لیتے ہیں، بہار میں پھول بھی کم ہی کھلتے ہیں کہ شہر میں سبزے کی بہتات نہیں، البتہ فضا خوش گوار ہو جاتی ہے اور دل میں نامعلوم سی موہوم مسرت جگہ بناتی ہے۔ کراچی میں ادبی میلا تھا، اس میں سے چند کھٹے چرا کر ہم ایک چائیز ریسٹوران میں چلے آئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا، ریسٹوران ایک خوب صورت علاقے کی خاموش اور درختوں بھری سڑک پر واقع تھا۔ چھٹی کا دن تھا سوسڑکوں پر بھی رش کم تھا۔ پرانا کراچی تصویر کی آنکھ سے نظر آتا تھا۔

احمد صاحب کے بارے میں، ان کے اہل خانہ کے علاوہ، کم ہی لوگ جانتے ہیں کہ وہ کھانے کی پسند کے بارے میں خاصے حساس (Choosey) ہیں۔ چند چیزیں قطعی طور پر نہیں کھاتے جیسا کہ سی فوڈ میں پران وغیرہ، بیف بھی نہیں کھاتے اور باقی چیزوں میں بھی پسند و ناپسند خاصی کڑی ہے۔ ہمارے ریسٹوران سے ذرا دور کراچی کا ڈاکٹرن (صدر اور محققہ علاقہ) تھا۔ باغی میں کراچی مختلف رنگین اور پرکشش تہذیبوں اور مذاہب کا مونتاج رہا ہے۔ مسلمان، ہندو، مسیحی، پارسی، سکھ اور یہودی ستر کی دہائی تک اس کے بازاروں اور محلوں میں، ساحل سمندر پر اور عبادت گاہوں میں خوب رونق لگاتے رہے ہیں۔ معروف ادیب اسد محمد خاں صاحب کے بقول صدر کے اٹھیا کافی ہاؤس کے سامنے Thomas & Thomas نامی کتابوں کی دکان ہوتی تھی، جو آج بھی ہے۔ قریب میں فریڈرکس کینے ٹیریا اور کینے جارج واقع تھے۔ معروف و مرکزی علاقے میں بھی کتنی کے لوگ سڑکوں پر چلتے نظر آتے، چند لوگ تمباکو کے ٹبن اور پائپ پکڑے کینے ٹیریا میں جاتے نظر آتے۔ کنویرین ٹیلر شاپ کے مالک نے اداکار صادق علی کی کیلٹ ہیٹ پہنے جھک کر سامنے دیکھتے کی تصویر لگا رکھی تھی۔ حالات کی ستم طرینی یہ تھی کہ کچھ عرصے بعد اداکار صادق علی شیو بو حائے، فاج زدہ ہاتھ کو جیب میں ڈالے ٹیلر شاپ سے چند قدم دور کیمپول سینما والی گلی کے کھڑ پر پان کی دکان کے برابر اونچے اسٹول پر بیٹھے لوگوں سے پانچ پانچ دس دس روپے نذرانہ لیتے نظر آنے لگے۔ پارسیاں بیکری میں قرینے اور نفاست سے رکھی پیٹرز اور میٹریاں نظر آتی تھیں۔ گرد ہاں کوئی جوان کا کک کسی نوجوان لڑکی کے ساتھ داخل ہوتا اور کوئی فیملی کیبن خالی نہ ہوتا تو، اُس دور کی وسعت خیالی اور تہذیبی شائستگی کے مطابق، وہاں کے مالک ایرانی بھائی اُس جوڑے کو خوش آمدید کہہ کر بٹھانے کا انتظام کر رہی لیتے۔ سامنے پرنسٹن چرچ تھا جس کے فٹ ہاتھ پر صرف طوطے کی فال والے اور وزن کی مشین والے بیٹھے ہوتے تھے۔ موالیوں، بٹھوں، ساڑے کا تیل بیچنے والوں، محض ایک رومال سے بغیر تکلیف و انت نکالنے والوں کا کاروبار بھی صدر کے معروف علاقے میں خوب بجا رہتا تھا۔ اُس دوپہر ششے کی دیوار سے درختوں کے پتوں ٹہنیوں سے چمن چمن کر اور سفید میز پوش پر مختلف ڈیزائن بناتی روشنی کو کھتے ہوئے احمد صاحب نے اپنے وقت کے اہم، مشہور اور باصلاحیت لوگوں سے ملاقاتوں کا احوال سنایا، ان سے وابستہ دل چسپ قصے سنائے اور ان کی شخصیات کے مختلف گوشے وایکے۔ مشہور درویش مصور صادقین کے بارے میں واقعہ سنایا۔

”1963 تک صادقین کی بہ طور مصور پاکستان میں خاص حیثیت نہ تھی۔ وہ کوئی سند یافتہ مصور نہ تھے۔ این سی اے (NCA) اور دیگر اداروں کے لوگ ان کو مستند مصور ماننے سے گریزاں تھے۔ اُس دور میں انھیں فنون لطیفہ اور آرٹ کے گڑھ پیرس میں ایک اہم انعام دیا گیا۔ یہ اُس دور میں ایک بڑی خبر تھی۔ ہمارے ہاں جب

کسی باصلاحیت شخص کو مغرب سے انعام یا پزیرائی حاصل ہوتی ہے تو یہاں پر اُس کا اعتبار قائم ہوتا ہے اور اسے شہرت ملتی ہے۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں۔ پروفیسر عبدالسلام سے لے کر نصرت فتح علی خان تک کی صلاحیتوں کو بیرونی ممالک میں تسلیم کیا گیا تو یہاں پر انھیں عزت و شہرت ملی۔ انھی دنوں کویت میں فن و شہادت پر ایک اہم کانفرنس ہو رہی تھی۔ صادقین کو پاکستان کی نمائندگی کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ کانفرنس خاصی شان دار تھی اور اس کے مندوبین کی خوب خاطر تواضع کی گئی۔ وہاں صادقین کو ایک خیمہ دلایا گیا جس میں ان کی تیس بیٹیتیں تصاویر سج گئیں۔ حکومت نے انھیں اخراجات کے لیے 150 ڈالر دیے تھے۔ صادقین نے وہ ساری رقم خرچ کر دی۔ اب معاملہ یہ آن پڑا کہ وہاں آخر تک بیٹھنا تھا اور صادقین کے پاس کھانے پینے کو پیسہ نہ بچے تھے۔ اسنے میں ایک کویتی شخص خیمے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہم راہ ایک اٹارنہ نمبر تھا۔ کویتی شخص نے پہلے تو صادقین کو اور پھر اُن کی پینٹنگوں کو تعجب آمیز نظروں سے دیکھا اور اپنی نظر محارت دوبارہ تصاویر کی جانب مبذول کر لی۔ کچھ دیر وہ تصاویر کو غور سے دیکھتا رہا، پھر ایک تصویر کی جانب اشارہ کر کے اپنے نمبر سے عربی میں کچھ کہا۔ نمبر نے صادقین کی جانب دیکھا اور بولا ”مبارک ہو، شیخ صاحب کو آپ کی یہ تصویر پسند آگئی ہے۔“ صادقین نے روکے انداز میں اُن کی جانب دیکھا۔ غالباً اُن کا ذہن اپنی خالی جیب کی جانب بھی گیا ہوگا۔ اس کے بعد انھوں نے منہ پھیرتے ہوئے نمبر سے کہا ”یہ تصویر بک گئی ہے۔“ جب کہ وہ تصویر ہرگز نہ بکی تھی۔ اُس تصویر پر قیمت 500 سو ڈالر لکھی تھی۔ نمبر نے اعتراض کیا کہ اس پر فروخت شدہ کا نشان نہ لگا تھا۔ صادقین نے منہ بناتے ہوئے کہا کہ وہ بھول گئے ہوں گے۔ جب نمبر نے شیخ کو یہ بات بتائی تو اُس نے نمبر کے کان میں سرگوشی کی۔ نمبر نے صادقین سے کہا کہ شیخ صاحب نے آپ کی تصویر کی قیمت 5 ہزار ڈالر کر دی ہے۔ صادقین نے محضرت کر لی۔ اب شیخ چونک گیا اور اُس نے اس معاملے کو اپنی عزت کا سوال بناتے ہوئے پینٹنگ کی قیمت بڑھانی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ 5 سو ڈالر کی پینٹنگ کی بولی اُس نے 35 ہزار ڈالر لگا دی۔ صادقین نے پینٹنگ دینے سے انکار کر دیا۔ البتہ شیخ کو حتمی موقع ہی پر خطاطی کے چند نمونے بنا دیے۔ صادقین نے مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں نے پوچھا کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا تو وہ بولے ”شیخ کی آنکھوں میں جو پریشانی آئی تھی، وہ اُن مول تھی۔ اُس کی کوئی قیمت نہ تھی۔ سالا مجھے کیڑوں کوڑوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔“ اُس سہ پہر میں وطنی دوپہر کو امجد صاحب کی ذہنیل سے قصے برآمد ہو رہے تھے۔

”میری پہلی ملاقات پروین شاکر سے احمد نعیم قاسمی صاحب کی وساطت سے ہوئی۔ میں کراچی جا رہا تھا تو قاسمی صاحب نے چند کاغذات میرے حوالے کرتے ہوئے پروین شاکر کے متعلق کہا ”بیٹی سے ملنے آئیے گا۔“ میرے دل میں قاسمی صاحب کے لیے بے پایاں احترام تھا۔ انھوں نے پروین کے لیے بیٹی کا لفظ استعمال کیا تو میں نے اُسے قاسمی صاحب کی بیٹی کی طرح سمجھا اور دل میں وہی احترام دیا۔ ایک وقت تو ایسا بھی آ گیا کہ اُس جیسی رکھ رکھاؤ والی بارعب خاتون کی اگر احمد نعیم قاسمی صاحب کے علاوہ کوئی اور سرزنش کر سکتا تھا تو وہ میں تھا۔ وہ بہت نفیس اور شائستہ خاتون تھی۔ میرے خیال میں پروین شاکر پاکستان کی آج تک کی شاعرات میں سب سے اہم شاعرہ ہے۔“

میں توجہ سے امجد صاحب کی گفت گو سن رہا تھا۔ انھوں نے قبوے کا ایک گھونٹ بھرا اور بولے۔

”جب پروین شاکر مقابلے کا امتحان پاس کر کے ٹریننگ کے لیے اکیڈمی آئی تو اُس نے مجھ سے دو لوگوں سے ملاقات کروانے کی خواہش کا اظہار کیا، طاہرہ نقوی سے اور میڈم نور جہاں سے۔“

”اچھا؟“ میں نے تجسس لہجے میں کہا۔

”طاہرہ نقوی کو سرطان تشخیص ہو چکا تھا۔ شاداب چہرے، بولتی آنکھوں اور بوٹے قد والی طاہرہ نقوی کینسر سے بہت صبر اور ہمت سے نبرد آزما تھی۔ جب پروین شاکر اُسے مل کر آئی تو بہت اُداس تھی۔ میں نے اُس کے جذبہ ہم دردی کو سمجھتے ہوئے ملاقات کا پوچھا تو اُس نے ایک عجیب بات بتائی۔ وہ بتانے لگی کہ طاہرہ نقوی بہت کم زور ہو چکی ہے، بیماری میں بھر، ٹوٹ چکی ہے۔ البتہ اُس نے میرے لیے دو تین مرتبہ ایک ہی پیغام دیا۔ اُس نے پروین سے کہا ”امجد صاحب سے کہیے گا کہ وہ میری عیادت کرنے نہ آئیں۔“

”اُس کی اس درخواست کے پیچھے غالباً ایک جذبہ پوشیدہ تھا کہ آپ اپنے پسندیدہ لوگوں کی یادداشت میں اپنا زندگی سے بھرپور ہنسا مسکراتا تاثر برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ سو وہ چاہتی تھی کہ میں اُس کا ہنسا مسکراتا روپ یاد رکھوں۔“

امجد صاحب نے یہ بات کی تو میرے ذہن میں احمد فراز آ گئے جن کے عزیزوں نے اُن کی بیمار حالت میں وکیل جیٹر پر ملاقاتیوں سے ملاقات اور کیرا مینوں کو تصاویر کھینچنے سے منع کر دیا تھا۔ میرے ذہن میں نور جہاں بھی آ گئیں۔ چچائی، دکتی، گوبند پنپنے، ہیرے کی خیرہ کن آنکھیں بھری انگلیاں نجاتی نور جہاں شدید بیمار ہوئیں تو ملاقاتیوں کے سامنے بیماری کی حالت میں آنے سے گریز کرتی تھیں تاکہ اُن کا ٹیکس تصور برقرار رہے۔

امجد صاحب نے نور جہاں کی تصویر یادداشت میں روشن کی اور شاید اُن کی نفرتی آواز ریسٹوران میں گونجتی ہوئی سی سنائی دی۔

”ایک مرتبہ میں نے میڈم سے اُن کے لہرائی والے گھر میں بسی میں اُن دنوں ایک بہت بڑی تقریب میں گائے اُن کے گانے ”آواز دے کہاں ہے“ کی تعریف کی تو انھوں نے میرے لیے اپنے ہاتھوں سے چائے بناتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

”امجد جی آپ کو پتا ہے، میں نے سات برس کی عمر میں سرکس کے باہر تھوڑے پر کھلے آسمان کے نیچے نمبر دسبر کی شدید سردی میں اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ میں موتیوں کے ہار، قیمتی ساڑھی اور ہیروں کی انگلیوں کے لشکارے کے پیچھے میڈم کی اُن تمک محنت اور صلاحیت کو دیکھ سکتا تھا۔ اُن میں چند کمال کی خوبیاں تھیں۔ وہ خاص پڑھی لکھی نہ تھیں پر نہ صرف اُردو بہت اچھی بولتی تھیں بلکہ مناسب انگریزی میں بھی بات کر لیتی تھیں۔ اُن کے مزاج کی نفاست اور دکھ رکھاؤ سے ان کی تعلیم کی کمی کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بہت شان دار نقل اُتار لیتی تھیں۔ کسی دے لب و لہجے اور انداز و اطوار کی ایسی عمدہ نقل کر تیں کہ ارد گرد کے لوگ لوٹ پوٹ ہو جاتے۔“ امجد صاحب نے ماضی کے چمنستان میں مجھاکتے ہوئے کہا۔

”پروین شاکر کی دوسری خواہش میڈم نور جہاں سے ملاقات تھی۔ میں نے خود پر داختہ (Self Made) لوگوں میں ایک خاص عادت دیکھی ہے کہ وہ اپنی موجودگی میں لوگوں کی کسی دوسرے کی جانب توجہ برداشت نہیں کر پاتے۔ میں نے پروین اور مختلف لوگوں کو گھمگم لاہور میں اُس دور کے مخصوص انداز کے

معروف چائیز ریسٹوران 'شکھائی' میں کھانے پر مدعو کیا۔ میڈم نور جہاں کو کھانے پر بلانے کے لیے اُن کے کمر فون کیا۔ اُنھوں نے فون اٹھایا اور بولیں "جی امجد جی۔" میں نے پروین شاکر کا تذکرہ کیا تو بہت اہمیت سے پنجابی میں بولیں "بڑی چنگی اے (بہت اچھی ہے)۔" میں نے کہا کہ اگر وہ رات کا کھانا ہم سب کے ساتھ کھالیں تو ان کی مہربانی ہوگی۔ اُنھوں نے تاسف سے کہا کہ اُن کی چھوٹی بیٹی کی سکولی کی معطلی ہے اور وہاں جانے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں نے آخری کوشش کے طور پر کہا "دیکھ لیں، اگر آسکیں تو اچھا ہو جائے۔" میری آواز میں ڈکھن کر بولیں "امجد جی! میں ضرور آؤں گی، خواہ پندرہ بیس منٹ کے لیے آنا پڑے۔ زیادہ دیر نہیں رُک سکوں گی۔" اُنھوں نے وعدہ تو کر لیا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ آجائیں گی۔ رات کے کھانے کا وقت آٹھ بجے تھا۔ ابھی میں ریسٹوران میں اہتمام کر رہا تھا کہ عین آٹھ بج کر ایک منٹ پر باہر گاڑی آ کر زکی اور میڈم آگئیں۔ بہت بھرپور محفل رہی جس کی اصل رونق میڈم کی بر جستہ اور زندگی سے بھرپور گفت گو تھی۔ ریسٹوران ساڑھے گیارہ بجے بند ہو جاتا تھا مگر وہ وہاں رات گئے ساڑھے بارہ بجے تک بیٹھی رہیں۔ محفل میں احمد ندیم قاسمی، عطاء الحق قاسمی، پروین شاکر، مستنصر حسین تارڑ اور دیگر ادیب اور دانش ور تھے مگر سب کی توجہ انہی کی جانب رہی۔

امجد صاحب مسکرائے اور قبوے کی خالی پیالی کی تہ میں دیکھ کر میری جانب دیکھا اور بولے "راول پنڈی میں کئی برس کے وقفے کے بعد پی ٹی وی ایوارڈز اُس دور کے فیشن ایبل اور جدید ہوٹل Flashmans میں منعقد ہو رہے تھے۔ سب ہی شرکا رات گئے دو، تین بجے تک وہاں مکپ شپ کرتے رونق لگائے رکھتے۔ ایک رات کی بات ہے، میں لطفیے اور واقعات سنارہا تھا، میرے ارد گرد اچھے خاصے احباب اکٹھے تھے، خوب ہنگامہ تھا۔ میڈم نور جہاں کچھ ہی فاصلے پر بیٹھی تھیں۔ اُن کی توجہ میری طرف ہو گئی۔ بہر حال کتنے بھر بعد میڈم اپنی میز سے اُٹھیں۔ وہ انٹرکامینیکل ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ چنانچہ یوں لگا جیسے وہ اپنے ہوٹل جانے کے لیے اُٹھی ہوں۔ جب وہ میرے قریب سے گزریں تو میں کھڑا ہو گیا۔ اُنھوں نے میرے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے اور پنجابی میں بولیں "امجد جی کسی کتنے ٹھہرے ہوئے او؟" (امجد جی آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟) میں نے کہا کہ میں فلیش مین (Flashman) ہی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اب سب لوگ چپ ہو کر ہماری طرف دل چسپی سے دیکھنے لگے۔ میڈم نے جب سب کو اپنی طرف متوجہ پایا تو بولیں "آپ نے بتایا ہی نہیں، ورنہ میں بھی یہیں ٹھہر جاتی۔" اُن کے اس جملے کے کئی معانی لیے جاسکتے تھے۔ میں گھبرا گیا۔ میڈم نے سب لوگوں کی توجہ مجھ سے اپنی طرف مبذول کرانی تھی۔ کچھ توقف کے بعد وہ استہزائیہ ہنسی نہیں جیسے کہہ رہی ہوں 'آؤ اور میرے آگے چراغ جلاؤ اور وہاں سے چلی گئیں۔"

اُسی نشست میں اُنھوں نے پڑ سکون لہجہ میں کہا۔

"مجھے اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا ہنر دیا۔ میں نے معاشرے میں اپنی بساط کے مطابق اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کی ہے، لوگوں میں شعور بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈراموں میں جاگیر داری کے خلاف قلم اُٹھایا جب ہر سو سنا تھا۔ عورتوں کے تذلیل آمیز و چٹکے انسانیت پر ہنہ جלוں کو اُس دور میں جب ٹی وی پر ہر طرح کی پابندیاں تھیں، ایسے دل گیر اعزاز اور اشارے کنایے میں موضوع بنایا کہ بات مخاطب تک پوری اثر پذیری سے

کچھ بھی گئی اور صاحبان اختیار کے قواعد کے آئینوں کو نہیں بھی نہ گئی۔“

اُن کا انداز تخلیق اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ اپنی بات، موجودہ دشنام طرازو دریدہ دہن چلن کے برعکس، نفاست و سلیقے سے بھی کی جاسکتی ہے اور زیادہ موثر انداز میں کی جاسکتی ہے۔

ایک فن کار جسے اپنی شاعری پر بھرپور دوا، ڈراموں پر غیر معمولی شہرت اور شخصیت کو قہل رنک پذیرائی مل رہی ہو، فلسطینی مزاحمتی شاعری اور افریقہ کے سیاہ فام مظلوموں کی شاعری کا ترجمہ کر کے اُن کے ساتھ پوری انسانی ہم دردی کے ساتھ کھڑا ہے۔ ترجمہ بھی ایسا ہو گا یا مترجم پر وہی احساس شاعری میں اُترا ہو۔

لاہور میں ایک سادون، ہم عصر کے وقت باہر برآمدے میں بیٹھے بارش کی گلی جھڑی دیکھ رہے تھے۔ گھٹا خوب چھائی تھی، بادل برسے تھے، سیاہ مٹکھ سے بجلی کے تڑپتے لٹکارے کووندے اور عمارت کے دروہام اس کی کڑک سے گونج اُٹھتے۔ دُور کوئی فرانسفارم پھٹا، دھک سے دبے دھماکے کی آواز سنائی دی اور بجلی چلی گئی۔ کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک باقی تھی۔ ہم نے باہر ورائڈے میں موڑھے لگوائے اور طبلے کی کھال پر بھتی اُٹھکیوں کی پوروں کی طرح بجتے بارش کے قطرؤں کو سننے لگے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں دیواروں کے اندر کی ٹھنڈی مصنوعی دنیا سے نکل کر حقیقی زندگی میں لوٹ آیا ہوں۔ وہی حقیقی زندگی جب لاہور شہر کی باہر کی بستیاں آباد ہونے سے پہلے، حفاظتی دیواروں کے پیچھے تحت الشعور میں خوف ڈر آنے سے پہلے، کے شہر کی زندگی ہوتی تھی۔

لاہور کی تنگ گلیاں جیٹھ ہاڑ کے مینوں میں خوب چپ جاتی تھیں اور ہوا گرم ہو کر سانس لینا دشوار کر دیتی تھی۔ اندرون لاہور کے لوگ موسم کی پروا نہ کرتے ہوئے جہاں گیر کے مقبرے اور دریائے راوی کے کناروں پر آ جاتے تھے۔ وارث شاہ کا عرس بھی سادون میں ہوتا تھا۔ لوگ باگ ٹولیاں کی صورت کھانے پینے کا سامان، چادریں، ڈھولک، انگوت، برتن اور ترسے ساتھ لے جاتے۔ درختوں پر ترسے ڈالے جاتے، پتیلیں ڈالی جاتیں، ٹوکروں سے آم نکالے جاتے اور کھانے پینے کا سامان بچ جاتا۔ کھیل کود کا آغاز ہوتا اور چند لوگ میٹھی روٹی کے کٹڑے کر کے کسی منت کے پورے ہونے پر پانی سے اُس دُور کے لبالب بھرے راوی دریا میں مچھلیوں کو ڈال دیتے۔ تاش کی بازیائیں جیتیں، بھر پڑھنے کا اہتمام ہوتا اور شاموں کو گیس کے ہنڈوے جل اُٹھتے۔ برف کے کارخانے کم تھے اور لوگ کنوؤں کے ٹھنڈے ٹھار پانی پر گزارا کرتے۔ چھوٹے کنوئیں کو کھوٹی اور بڑے کنوئیں کو کھوہ کہا جاتا۔ چند تنگ گلیوں پر چھت ہوتی، عورتیں بند گھروں کے دم گھونٹتے ماحول سے بچنے کی خاطر باہر بند چھتی گلیوں میں بیڑھیاں بچھا کر بیٹھ جاتیں۔ بچتی گرمیوں میں ملل کے کپڑوں اور وائل کے گرتوں کا استعمال بڑھ جاتا۔ شربت کی مانگ بڑھ جاتی اور دہی کی بھی۔ جب گرمی بڑھ جاتی تو لڑکیوں کے گانے بھی بڑھ جاتے ”اللہ میاں مینہ درسا۔ ساڈی کوشی دانے پائے۔“ گھر، کوشنیاں، محلے ساتھ ساتھ تھے اور انسان بھی۔ انسان باہر نکل گیا، دُور دُور مکان بنالے، بیچ میں دیواریں بڑھائیں اور دور ہو گیا جھانکلا ہو گیا۔ پرانا لاہور میں تو نہ دیکھا تھا پر اپنے دادا، چچاؤں، پھوپھیوں، نانا، تانی اور وسیع لاہوری خاندان کے بزرگوں سے خوب سنا تھا۔

جب میں نے پرانی یادوں کا تذکرہ کیا تو امجد صاحب سنانے لگے ”میری بہت بچپن کی یادیں خاصی دھندلی ہیں۔ البتہ جب میں چھوٹا تھا تو بھی ہر وقت سوچوں میں کم رہتا تھا۔ میری قوت مُتغیبلہ وقت سے پہلے ہی فعال اور پختہ ہوتا شروع ہو گئی تھی۔ میرے والد کو فلموں کا بہت شوق تھا، میں کتابوں کو سادگی سے ایک کوئے

میں بیٹا پڑھتا رہتا تھا۔“

”ایک مرتبہ شیطان ہوئی میں میں جمیل الدین عالی، علائقی قاسمی اور چند دیگر دوست بیٹھے تھے۔ خوب کپ شپ چل رہی تھی۔ باتوں باتوں میں عالی جی کہنے لگے ”یہ تمہارے بے تکلف دوست تمہارا دماغ خراب ہونے نہیں دیتے۔“ بچپن کے دوست اور جوانی کے بے تکلف احباب انسان کی بنیادی فطرت سے واقف ہوتے ہیں اس لیے وہ گردن پر لگتی کلف کو چند لمحوں میں صاف کرنا خوب جانتے ہیں۔

”آپ کی شاعری پر خاصی بات ہوتی ہے، گفتہ شخصیت کا بھی تذکرہ رہتا ہے، البتہ آپ کے ٹی۔وی کے حوالے سے تجربات و مشاہدات پر کم ہی بات ہوتی ہے۔“

ابھی میری بات سچ ہی میں تھی کہ وہ مسکرا اٹھے۔ میں نے بات روک کر ان کی جانب دیکھا تو بولے ”بہت ہی دل چسپ اور میرے دل سے قریب موضوع ہے۔“

بارش کی جھری رُک چکی تھی، جس میں اضافہ ہو رہا تھا اور کوڑوں کا شور بڑھ رہا تھا۔ عصر کے دودھیا مشروب میں شام کا کولال کر شفق کو دودھ سوڈا کا سارنگ دے رہا تھا۔ غالباً بارش سے پناہ گزین پرندے جان وراپے کھر لوٹ رہے تھے۔ بجلی بحال ہو گئی تھی۔ سوہم واپس ٹھنڈے اے سی والے کمرے میں چلے گئے۔ معمول سے ہٹ کر حقیقت کا ذائقہ مختصر مدت کے لیے تو دوران انگیز ہو سکتا ہے۔ طولانی ہو جائے تو بلائے جان بن جاتا ہے۔

”میں سمندر ڈراما کر رہا تھا۔ جب پروڈکشن اسٹنٹ ہوتے تھے۔ میرے ساتھ ایک مستعد اور سمجھ دار لڑکا ہوتا تھا۔ اس کا نام سجاد تھا۔ سجاد دیگر ڈراموں میں بھی معاونت کرتا تھا۔ اسی دوران جمیل فخری (مرحوم) واپٹے ہاؤس کے آڈیو ریم میں کیلے جانے والے ڈرامے میں کبوتر باز کا کردار ادا کر رہے تھے۔ سجاد وہاں پر معاونت کر رہا تھا۔ جمیل فخری وہاں کوئی نیوٹی (Continuity) کے کپڑے بھول آئے۔ وہاں انھوں نے بہانہ بنا دیا کہ سجاد نے انھیں بتایا نہ تھا۔ نتیجتاً سجاد کو اچھی خاصی ڈانٹ پڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد میرا سیٹ کی دیوار کی جانب جانا ہوا۔ سیٹ کی دیوار اور ہال کی دیوار کے بیچ فاصلہ ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں پیچھے سجاد کھڑا تھا اور دیوار کی جانب رخ کر کے پاؤں اڑا رہا تھا۔ جب میں قریب ہوا تو دیکھا کہ وہ کہہ رہا تھا ”آ جاتے ہیں کبوتر باز۔“ میں نے یہی بات جمیل فخری کو بتائی۔ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ میری بات سن کر وہ اسٹیج کی دیوار کے پیچھے چلے گئے اور سجاد کو گلے لگا کر معاف کیا۔ ایک اور واقعہ ہے۔ کنورا آفتاب بہت پروفیشنل پروڈیوسر تھے۔ وہ غصے کے بہت تیز تھے۔ لوگ ان کا مزاج سمجھتے تھے۔ میں ”بانتھ“ ڈراما کر رہا تھا۔ اس میں ایک سینئر اداکار ایسے تھے جن کا سارا تجربہ ریڈیو کا تھا۔ ٹی وی کا زیادہ تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اداکار کی بار بار بری ٹیک ہو رہی تھی۔ پانچ، چھ مرتبہ ایسا ہو چکا تو کنورا آفتاب صاحب نے وہیں مانگ سے انھیں برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ وہ پرانے اداکار تھے۔ اداکار کوئی نئے فن کار کھڑے تھے۔ وہ اداکار بھی غصے میں آ گئے۔ اُس وقت تو خاموش رہے لیکن بعد میں کنورا صاحب سے کہنے لگے کہ انھیں خیال کرنا چاہیے تھا، آخر وہ ایک سینئر اداکار ہیں۔ یہ سن کر کنورا صاحب نے ہمت کر اداکار کو یہ کہہ کر لا جواب کر دیا۔ ”تھم کیسے سینئر ہو۔ مجھے تمہارے نام تک کا تو پتا نہیں۔“

امجد صاحب نے توقف کیا اور واقعات کی لڑی کو پھر سے تمام لیا۔

”ایک حسین فلمی اداکارہ تھی۔ اُس کا تعلق بازار حسن سے تھا۔ یہ وہ دور تھا جب فلموں سے کہانی اور اداکاری

رخصت ہوگئی تھیں۔ فارمولاء فلموں کا دور تھا جن میں اچھے کمرانوں کے لوگ آنا چھوڑ گئے تھے۔ تب فلموں میں لہجہ کانوں کا ترکا ہوتا، چہرے کی رنگینی اور جسمانی خطوط کو اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ یہ وہ بلیک ہول تھا جو ٹیلنٹ اور فنی خوبیوں کو نگل گیا تھا۔ ہیرامنڈی پیسے رایل پارک میں آباد ہوگئی تھی۔ حالات ایسے ہو گئے کہ مذکورہ حسین اداکارہ فلم ”تیس مارخان“ میں کام کر رہی تھی۔ وہ نیم خواندہ تھی، چند ڈائلاگ بول سکتی تھی اور پہچانی رقص کر سکتی تھی۔ حزیں قادری صاحب نے اُسے اس پنجابی فلم میں ایک پھویشن سبھائی جو خاص دل گیر تھی۔ اسے سمجھاتے ہوئے حزیں نے اداکارہ سے کہا ”بی بی تم گانا گاتے ہوئے گھر میں داخل ہوتی ہو۔ سامنے باپ کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ اسے دشمن قتل کر گئے ہیں۔ تم نے یہ دیکھ کر بیٹھ جانا ہے۔“ یہ سن کر فن کارہ نے متذبذب لہجے میں پنجابی میں پوچھا ”یہ سین کامیڈی اے یا ٹریجڈی؟“ (یہ سین کامیڈی ہے یا ٹریجڈی)۔“ انھوں نے موازنہ کرتے ہوئے کہا۔

”بی بی وی کے آنے سے باصلاحیت لوگوں کا فن چمک اٹھا۔ ریڈیو والے لوگ بی بی وی کی جانب آئے۔ ان میں اشفاق احمد، منو بھائی، احمد ندیم قاسمی، انور سجاد اور دیگر کئی شامل تھے۔ اس میں زیادہ پذیرائی تھی۔ ابتدا میں سب کی مشق مانگرو فن کی تھی۔ سوانحیں کمرے کی زبان کا علم نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ڈراموں میں لفاظی زیادہ ہے۔ آہستہ آہستہ سب ماحول کے مطابق ڈھل گئے۔ کسی چیز کی اہمیت اُس کی ضد سے متعین ہوتی ہے۔ اسی طرح موازنہ ہو سکتا ہے۔ وگرنہ سول فلاح رہتی ہے۔ ابتدا جملے طویل اور ڈائلاگ کچھ حد تک غیر حتمی تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ سب بدل گیا۔ ان میں تین آدمیوں میں غیر معمولی صلاحیت تھی، کنور آفتاب، یاور حیات اور محمد ثار حسین۔ خبروں کے حراج ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ غیر معمولی لوگوں کو غیر معمولی مواقع ملیں تو یہ ان کی خوش قسمتی ہوتی ہے۔ دولت، شہرت اور کام پائی ملنے سے انسان میں بعض اوقات عجیب و غریب تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں یا تو تکبر و آتا ہے، ہال کی کھال اُتارنے کی عادت ہو جاتی ہے یا پھر غیر معمولی عاجزی آ جاتی ہے۔“

احمد صاحب نے ایک یہ ظاہر معمولی لیکن ان کے لیے یادگار واقعہ بیان کیا۔

”ایک مرتبہ میں فردوس جمال اور عابد علی کے ساتھ بی بی وی لاہور اسٹیشن کے گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ ان دنوں میرا ڈراما ”وارث“ بی بی وی سے نشر ہو رہا تھا۔ وہ رکشے کا انتظار کر رہے تھے اور میں کسی کو ملنے کا منتظر تھا۔ سامنے ایک سائیکل سوار، سائیکل کھڑی کر کے مجھے مسلسل دیکھ جا رہا تھا۔ اس نے تیل میں بیچکے ملیشے کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ عابد علی اور فردوس جمال کے رخصت ہونے کے بعد وہ میرے قریب آیا۔ میں اس کے مسلسل دیکھنے کی وجہ سے بے چین ہو رہا تھا۔ قریب آ کر اُس نے پنجابی میں پوچھا ”سرو وارث کسی لکھیا سی؟“ (سرو وارث آپ نے لکھا تھا) میرا فوری تاثر یہ تھا کہ وہ نیلام گھر کا یا کسی اور پروگرام کا پاس مانگے گا۔ سو میں نے سپاٹ لہجے میں کہا ”ہاں بھئی کیوں کیا بات ہے؟“ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”بادشاہ نوکر بیگے آں تیرے (بادشاہ، تمہارے نوکر ہیں)۔ یہ کہہ کر وہ سائیکل پر بیٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ایک دنیا کی مار کھایا ہوا شخص میرا شکر گزار ہوا ہے کہ میں نے اُس کے حقوق کی بات کی ہے۔ مجھے لگا کہ ساری مجبور عوام کہہ رہی ہے ”تم نے ہماری بات کی ہے۔“ اس بات نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ میں نے زندگی بھر

حقیقت سے ناتا نہیں تو ذرا اس لیے میرے پاؤں زمین پر رہے اور دماغ درست جگہ پر رہا۔

”ایسی کامیابی پر تو لوگ قلم کا رخ کرتے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”پاکستان کی قلم اندھنری صحیح معنوں میں وہ پہلی نہ پاسکی جو ڈرامے کو حاصل تھی۔ ہندوستان میں 1930 کی دہائی میں وی شاندارام نے پونا میں قلم کا تربیتی ادارہ بنایا تھا۔ وہیں سے پڑے کئے سچے قلم ساز نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد اس جانب اول درجے کے لوگ نہ آئے۔ جو آئے اُن کی ذہنی بصارت محدود تھی۔ قلم کی اپنی زبان ہوتی ہے، اُسے کئے بغیر اچھی قلم نہیں بن سکتی۔ اعلیٰ معیار کے چند لوگ جیسے تنویر نقوی، قنیل شغائی وغیرہ اس جانب ضرور آئے اور ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا۔ البتہ دوسرے لوگ یا تو آئے نہیں یا ناکام ہو گئے۔“

”ایران میں شاندار قلمیں بن رہی ہیں“ میں نے گزارش کی تو انھوں نے وضاحت کی۔

”ایران پر فرانس کے اثرات تھے۔ فرانس آرٹ کی آماج گاہ تھا۔ ایران پر اس کے مثبت اور گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ویسے بھی ایران میں تہذیبی روایت مضبوط تھی۔ ہندوستان میں مدراس اور کلکتے میں قلم کے اپنے ادارے تھے جنھوں نے اپنی ثقافت پیش کر کے اسے پرموتتری دی۔ وہاں کے لوگ بھی خاصے تعلیم یافتہ تھے۔ ادھر پاکستان میں فارمولا قلموں کا رواج پڑ گیا۔ یہ قلمیں جلد بک جاتی تھیں، اس لیے لوگ فوری یافت کے لیے اس جانب آ گئے۔ سلطان راہی کی صورت میں ایک پورا انداز مجسم ہوا۔ ان کی قلموں میں ایک کاری گر، مکینک یا عام آدمی کی ایک امیر آدمی کی بیٹی سے محبت دکھائی جاتی۔ چوں کہ عام زندگی میں ایسا کم ممکن تھا، اس لیے لوگوں کو اس میں آسودگی اور کھاراس ل جاتے تھے۔ زیادہ تر قلمیں غریب امیر، ظالم مظلوم اور جاہر مجبور کی جنگ کے موضوع پر ہوتی تھیں۔ گو سلطان راہی نے ایک ہی رول دس مرتبہ کیا پر ہر مرتبہ اس میں نیا جوش اور دلولہ پیدا کر دیتے تھے۔“

”آج کل قلم کا احیا ہو رہا ہے جو خوش آئند ہے۔“ میں نے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔

وہ سوچتے ہوئے بولے ”آج کے قلم سے وابستہ لوگ حقیقت سے بہت دور ہیں۔ یہ زمینی ثقافت اور روایت سے کٹے ہوئے ہیں۔ میری زیادہ اُمید ان نوجوان لڑکے لڑکیوں سے ہے جو ابھی مقامی اداروں میں پڑھ رہے ہیں۔ وہ یہاں کے حقائق سے زیادہ قریب زندگی بسر کرتے ہیں اور اس سے آگاہ ہیں۔ اس لیے مجھے توقع ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مثبت تبدیلی لے کر آئیں گے۔ ویسے تو قلم کی دنیا بدل رہی ہے۔ ہالی ووڈ میں قلمیں ٹھنکیں کار بنا رہے ہیں۔ آج کا انسان خیالی دنیا میں رہنا چاہتا ہے۔ آس پاس کی زندگی بے معنی ہوتی جارہی ہے۔ مغرب کا معاشرہ لاخدا اور لاولد ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے یہاں کے میلوں، نوٹکیوں، کشتیوں اور ان سے وابستہ تخلیقی شعبوں کو آہستہ آہستہ مغرب کے ذرائع نے حد درجہ متاثر کر دیا ہے۔ یہ متبادل ذرائع حقیقی نہیں۔ اسی لیے یہاں ایک عجب انتشار نظر آتا ہے۔ اگر ہمارے زمین سے وابستہ تخلیقی ذرائع بہ تدریج نئے دور میں داخل ہوتے تو زیادہ توانا ہوتے۔“

مقام بدلتے ہیں، بستیوں، دیہات، جنگل، ویرانے میں انسان زندگی بسر کرتا ہے، سفر کرتا ہے پر اس کا اصل تعلق اُسی جگہ سے رہتا ہے جہاں اُس کی آنول ٹال دبی ہوتی ہے یا اُس کے گہرائے کا پہلا مردہ دفن ہوتا ہے۔

پس زندگی آئول نال دقتانے سے مردہ دقتانے کے درمیان کا ایک وقفہ ہے۔
 احمد صاحب سے لاہور، کراچی، پنڈی، اسلام آباد میں ملاقاتیں رہیں۔ اُن کی شفقت زیادہ تھی اور میری طالب علمانہ محبت بھی کم نہ تھی۔

احمد صاحب کو بے شمار ملاقاتوں میں نہیں نے متوازن اور مثبت سوچ کا مالک پایا۔ ہمارے ہاں کی عمومی روایت، جس کے تحت یا تو کسی کو شیطان یا فرشتہ سمجھ لیا جاتا ہے، کے برعکس انھوں نے انسان کو خوبی و خطا کا پتلا ہی سمجھا ہے۔ میں نے انھیں بعض باصلاحیت اور ضرورت مند شعرا کے لیے حدود درجہ ہم درد پایا ہے۔ نہ صرف اُن کی مستقل دل جوئی کرتے رہے ہیں بلکہ انھیں متعارف کروانے کے بہتر مواقع کے حوالے سے ملکی و دینی الاقوامی مشاعروں میں مدعو کروانے میں بھی معاون ثابت ہوئے ہیں۔ اس دور کے غائب ہیں سو مشاعروں کی کمرشل اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں۔ چٹان چہ خیر اور فلّاح کے کاموں میں بلا محاذ و خدہ خوب بڑھ جاتے ہیں اور جدھر میزبانوں کا ان سے معاشی فائدہ وابستہ ہو وہاں دانش مندی اور عملیت پسندی سے معاملات طے کرتے ہیں۔ حدود درجہ حساس ہیں سو زور درجہ بھی ہیں۔ خوش طبعی میں کلفت مزاحی کے تحت کسی سے طریفانہ گفت گو تو پسند کرتے ہیں پر تہذیب سے گری یا ذاتی تھنیک پر مبنی سستی گفت گو کو نہ صرف ناپسند کرتے ہیں بلکہ اس کا اظہار فوری کر دیتے ہیں۔ جس شے سے بھی وابستہ ہوتے ہیں، اس میں خوب محنت اور توجہ سے صلاحیتوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ البتہ بعض اوقات وہ شعبوں سے ایک وابستگی کے دوران کسی ایک شے کو فوقیت دینا پڑ جاتی ہے۔ کالج میں تدریس کے دوران ٹی وی سے وابستگی کی مصروفیت اس درجہ بڑھ گئی کہ ایک وسیع ترقوی سطح پر ناظرین کی ذہنی تربیت کے لیے تدریسی ذمہ داریوں کو مختصر مدت کے لیے پس پشت ڈالنا پڑا۔

اسلام آباد میں ہونے والی ایک ملاقات میں انھوں نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے تاسف کا ذکر کیا جو انھیں بے چین رکھتا تھا۔ ایک ایسا رنج جس کا مداوا اب ممکن نہیں تھا۔ پر اس سے پہلے اُسی ملاقات میں ہونے والی پر خیال گفت گو کا کچھ تذکرہ۔

اسلام آباد کی، بالوں میں مایک کی مانند، درختوں کے بیچ کبھی شاہ راہوں میں سے ایک کے نزدیک بربلہ بازار ایک ہوٹل کی بالائی منزل کی بالکونی میں بیٹھے ہوئے انھوں نے ایک رات انسان کے ہنوز زیرِ تحقیق معالے کی جانب اشارہ کیا۔

”میں شروع ہی سے سوچتا رہا ہوں کہ انسان کے دماغ میں خیال کہاں سے آتا ہے۔“

سامنے نیچے پان سگریٹ کی دکان کا مالک سر کھجا رہا تھا، ایک اسٹال پر ٹوئیاں، پی کیپ رکھی تھیں، دکانوں میں مناسب رش نظر آ رہا تھا، کن آئس کریم والا ایک بچہ کو آئس کریم پکڑا رہا تھا جسے وہ اپنے باپ کا ہاتھ چھوڑ کر بہت شوق اور احتیاط سے دونوں ہاتھوں سے تمام رہا تھا۔ خوب چمک چمک پھل تھی جو عموماً اسلام آباد میں کم کم ہوتی ہے۔ ققوں کی ایک لڑی سامنے لٹک رہی تھی جس کی پہلی چمک دار روشنی میں سامنے چوڑیوں کے اسٹال کی چوڑیاں دک رہی تھیں۔

”میں نے دیکھا ہے کہ انسان کے فہم و ادراک، حقیقت اور توہم کے بیچ بہت سے خاکستری حصے (Grey Areas) ہوتے ہیں۔ انسان اب تک ان کی تفہیم نہیں کر پایا۔ انھی حصوں میں روحانیت اور ماورائی معاملات

کے ڈانٹے جاتے ہیں۔ ایک شخص کو یک دم بیٹھے بٹھائے کوئی انوکھا خیال موجد ہے، شاعر پر عمدہ شعر نازل ہو جاتا ہے اور تخلیق کار کی چشم خیال کے سامنے ڈھلا ڈھلایا بنایا فن پارہ آن موجود ہوتا ہے۔“

میں نے ایک خیال انگیز قصہ سنایا۔

”لاٹینی امریکا کے نوبل انعام یافتہ ادیب گبریل گارسیا مارکیز جس کے ناول ’تہائی کے سوسال‘ کو بعض ناقدین بیسویں صدی کا سب سے بڑا ناول سمجھتے ہیں، کے بارے میں اس حوالے سے عجیب واقعہ ہے۔“

امجد صاحب غور سے میری بات سن رہے تھے۔ ذور مارکیٹ کے لوگوں کا دم شور، موسیقی اور گاڑیوں کے ہارن پس منظر میں سنائی دے رہے تھے۔

”وہ کہتا تھا کہ اس ناول کی کہانی کا منہم سا خاکہ اُس کے ذہن میں اٹھارہ برس کی عمر سے موجود تھا۔ البتہ اُسے سوچ نہ رہا تھا کہ اسے کس طرح لکھا جائے۔ ایک روز جب وہ اُس کی بیوی مرسیڈس اور بچے تعطیلات پر گاڑی میں تفریحی مقام کو جا رہے تھے، کہ ناول کی ساخت اور لہجہ اُس کے دماغ میں کوندے کی طرح لشکارا دکھا گیا۔ دراصل یہ کہانی اُس کی قریب ترین ہستی، اُس کی بانی کے کہانی سنانے کے انداز میں بیان کرتا تھی۔ اسے کہانی وہاں سے شروع کرنا تھی جہاں اُس کے نانا اُسے پہلی مرتبہ برف دکھانے لے گئے تھے۔ اس کشف کے وارد ہوتے ہی مارکیز نے اپنی گاڑی کا رخ واپس گھر کی جانب موڑ لیا۔ وہاں اُس نے گاڑی بیچ ڈالی اور ناول لکھنے میں جت گیا۔ گاڑی کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم چھ ماہ کے لیے کافی تھی، مگر ناول لکھنے میں اسے ڈیڑھ سال کا عرصہ لگ گیا۔ اس کی اصل طاقت تخلیق کا جنون اور دُور تھا اور حقیقی سہارا اُس کی بیوی تھی جس نے اس عرصے میں سارے گھر کا انتظام سنبھالے رکھا اور اُسے کوئی مشکل پیش آنے نہ دی۔ سو بعض دفعہ کوئی خیال سفر کے دوران دماغ پر وارد ہو جاتا ہے اور کئی مرتبہ سوتے میں خواب کی صورت ایسی طاقت سے نازل ہوتا ہے کہ تخلیق کار غینہ سے اٹھ کر اسے قلم کی گرفت میں لانے کی سعی کرتے لگتا ہے۔“

امجد صاحب نے اضافہ کیا۔

”ہمارے ہاں ایسے تخلیق کاروں کی کمی نہیں رہی جن کا خیال قطعی وہمی اور قدرتی ہے، مسلط کردہ نہیں۔ ساری دنیا کا ادب، بڑا ادب لہروں کی شکل میں چلتا ہے۔ ادب کے رومانی دور کو دیکھ لیں، سوشلزم، کمیونزم کا دور دیکھ لیا جائے یا بعد کے جادوئی حقیقت نگاری کا دور دیکھ لیا جائے سب لہر دو لہر آئے اور ماحول وقت پر سپہاں چھوڑ گئے۔ ہمارے ہاں اہم ترین نثر نگاروں کی پیدائش 1910 سے لے کر 1932 کے درمیان نظر آتی ہے۔ لاٹینی امریکا میں 1950 سے 2000 تک اہم ادیب سامنے آتے رہے۔ اردو ادب میں اہم لوگ 1950 تک لکھنا شروع کر چکے تھے۔ بین الاقوامی ادب کے مقامی ادب پر اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ مٹھو نے ترجموں سے آغاز کیا، سجاد ظہیر بیرون ملک گئے اور دیگر ادیبوں کا بھی بین الاقوامی ادب سے بالواسطہ یا بلاواسطہ واسطہ ہوا۔ 1920 سے پہلے کے ادب میں غریب، مظلوم اور بے کس کی بے چارگی نظر آتی تھی، بعد ازاں اس کی وجوہات کی جانب زیادہ توجہ کی گئی۔ ایک ریل چلتا ہے جو کہیں دم گم ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج بھی ہمارے ہاں ایک ریل تخلیق ہو رہا ہو جو بعد میں نظر آنا شروع ہو۔ ہمارے ہاں آج بھی حوصلہ افزا اور خوش کن امکانات نظر آتے ہیں۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کا تقابل ماضی کے اہم لوگوں سے چھوڑ دیا جائے۔ انہیں موجود کے حوال

و عناصر کے مطابق دیکھیں۔ ہمارے ہاں حقیقی، خالص اور زمین سے جڑی ہوئی سوچ کم ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ معاملہ باعثِ فکّر ہے۔ غالباً ہم ہیرونی خیال سے اتنے متاثر و مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہاں موجود روایت، فکّر اور ثقافت کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ البتہ امکانات موجود ہیں۔ میری نظر میں اچھی شاعری دل کے ذریعے دماغ کو چھو لیتی ہے۔ اس کے اہم عناصر میں خیال کے علاوہ ابلاغ اور غنائیت شامل ہیں۔ شاید اسی لیے مجھے ذاتی طور پر نظم و غزل کی نسبت زیادہ پسند ہے۔ اردو کے بھی دو حارے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد گواردو ہندی بہ ظاہر قریباً ایک طرح سے بولی جاتی تھیں، مگر ان کا انداز تحریر مختلف تھا۔ اردو فارسی، عربی سکرپٹ میں لکھی جاتی ہے جب کہ ہندی کا سکرپٹ دیوناگری ہے۔ آج ہندوستان میں اردو شاعری دیوناگری میں لکھی جاتی ہے۔ ہندوستان میں اردو شاعری قلمی سطح پر مقبول رہی ہے۔ مجروح سلطان پوری، جان نثار اختر، کبھی اعظمی، ساحر لدھیانوی اور گھیل بدایونی کو عام فہم انداز میں سادہ الفاظ کی نیم رومانی شاعری کہنا پڑی۔ چنانچہ سائنسد کی دہائی تک ہندوستان میں زبان کی ساخت اور الفاظ سادہ ہوتے چلے گئے۔ پاکستان میں وحیدہ اور کثیرا اجتماعی تجربات کیے جاتے رہے۔ دل چسپ بات ہے کہ ہمارے ہاں اضافت (ذریعہ، پیش وغیرہ) کا استعمال عام ہے۔ یہ ہندی میں نادر ہے۔ وہاں کے شعرا میں اس کا استعمال کم کم ہے۔ ہماری زبان پر فارسی کے اثرات موجود ہیں جب کہ وہاں ہندی کے اثرات زیادہ ہیں۔ وہاں شاعرے کی روایت آج بھی معروف ہے جب کہ یہاں اس کی مقبولیت میں کمی آئی ہے۔ سوزبان تو ایک ہی ہے مگر حالات اس میں بہت فرق تبدیلی لے آتے ہیں۔

باتیں ہوتی رہیں، شثرکی، شاعری کی، ادیبوں کی، معروف ادب بہ مقابلہ اعلیٰ ادب کی، تخلیقی کاروں کی کج ادائیگیوں کی اور خیال کی رسائیوں کی۔

شنید ہے کہ شاعری کی صنف پہلے کی طرح مقبول نہ رہی ہے۔ آج بھی عالمی سطح پر سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں تین شعرا کی شاعری سر فہرست ہوتی ہے، شکسپیئر، لاڈو اور خلیل جبران۔ اُس روز بھتی ہوا میں خوش لباس اور شکستہ تن خریداروں کے اڑتے لہادوں، بکھرتے بالوں اور اُٹھتے تہمتوں کے بچ بیٹھے مجھ سے بصیرت آموز لہجے میں کہنے لگے ”پاکستان وقت سے پہلے پیدا ہونے والا بچہ ہے۔“

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا ”یعنی تو اس کے بجائے ساتویں آٹھویں میں پیدا ہونے والا بچہ۔“

”شاید ایسا ہی ہے۔“ انھوں نے بات جاری رکھی۔

”دوسری جگہ عظیم کی وجہ سے، ہماری ولادت جو شاید 1960 میں ہوئی، 1947 میں ہوئی۔ برطانیہ کو ایسے حالات درپیش ہو گئے کہ اُسے نوآبادیات کو اپنے تسلط سے قبل از وقت آزاد کرنا پڑ گیا۔ پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ بنیادی طور پر رفاہی کاموں کے لیے تخلیق کی گئی تھی۔ اس کی پرورش سیاسی امور پر نہ کی گئی تھی جب کہ کانگریس کی سیاسی تربیت اور ارتقا جلد اسے بالغ سیاسی جماعت کے طور پر سامنے لے آیا۔ اس نے اپنے کارکنوں کی تربیت جمہوری اور سیاسی اساس پر کی۔ مسلم لیگ صحیح معنوں میں کل بارہ برس، یعنی 1935 سے 1947 تک سیاسی کردار ادا کرتی ہے۔“

میں نے اُن کی بات سمجھتے ہوئے کہا ”بارہ برس کے مسلم لیگی بچے کو قیام وطن کے موقع پر تریسٹھ سالہ جہاں دیدہ و تجربہ کار کانگریسی بزرگ کا سامنا تھا۔“

انہوں نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”اس پر مستزاد یہ کہ بھارت کے جواہر لال نہرو آزادی کے 17 برس بعد تک حیات رہے جب کہ قائد اعظم ایک برس بعد انتقال کر گئے۔“

اجہ صاحب نے دور نظریں جماتے ہوئے بچے کی بات کہی ”پاکستان کا انتظام شروع میں یو پی، سی پی کے پڑھے لکھے تہذیب یافتہ لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ انتقال آبادی کے بعد پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں زیادہ تر لوگ وہیں سے آئے۔ لہذا مہاجرین کی آباد کاری کے لیے بیوروکریسی کے ان لوگوں کو مصلحتاً سندھ و پنجاب کے طاقت ور جاگیرداروں سے سمجھوتا کرنا پڑ گیا۔ یوں وہ جاگیرداری نظام اور سوچ جو بھارت میں پندرہ اگست کی شام تین بجے ختم کر دیے گئے یہاں نہ صرف قائم رہے بلکہ محفوظ بھی ہوئے۔ یہاں سیاسی تربیت کے فقدان کی وجہ سے کوئی نظام جم کر نہ بیٹھ پایا۔ محلاتی سازشیں اور فوری مفادات مقدم ٹھہرے۔ چٹاں چہ کوئی مضبوط، مستقل اور دیرو پاؤں کا چانچا قائم نہ ہو پایا۔ جس کے ہاتھ بھی عثمان اقتدار آیا اس نے اپنا نظام مسلط کرنے کی کوشش کی جو اس کے رخصت ہوتے ہی منہدم ہو گیا۔“

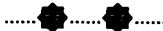
میں نے حسرت اور دکھ سے پوچھا ”کسی جانب کوئی بہتری نظر نہیں آتی۔“

انہوں نے رات کے اس پہر قریبی بلند و بالا رہائشی عمارتوں کے فلیشوں کی بجستی تیزوں کو دیکھتے ہوئے کہا ”یقیناً بہت سے سسٹم بہتر ہوئے ہیں۔ ہمارے اندر شعور بڑھا ہے اور بہتری کی مثبت خواہش میں بھی اضافہ ہوا ہے، پر فقط شعور و خواہش بے فائدہ ہیں جب تک ہمارے سامنے ایک محسوس، قابل عمل اور متفقہ لائحہ عمل نہ ہو۔ اس لائحہ عمل میں سب سے اہم خدیہ تعلیم ہے۔ ایک ایسا یکساں تعلیمی نظام جس میں متعلقہ تکنیکی وقتی عملی علوم کی ایسی آمیزش ہو جو ہمیں بیوروں پر کھڑا کر دے۔ تعلیم کے ساتھ نصاب میں معاشرتی تربیت کو شامل کرنا بھی ضروری ہے اور اس کے عملی مظاہرے کا انتظام بھی لازم ہے۔ بظاہر یہ ایک دشوار امر نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسے ذہین و اعلیٰ تعلیم یافتہ مخلص لوگوں کی جماعت موجود ہے جو ایسا نظام تعلیم ترتیب دے کر اس کے تسلسل کی نگرانی کر سکے تو ہماری دانش گاہیں مستقبل کے حقیقی مہمار پیدا کرنے کی صلاحیت حاصل کر کے وطن پاک کو وہ باعزت مقام دلا سکتی ہیں جس کا ہر پاکستانی دلی طور پر خواہشمند ہے۔“

بعض اوقات رات کو ہوا تیز ہو جاتی ہے۔ اُس رات ہوا میں تیزی کچھ بڑھ کر تھی۔ سو بار بار ہماری آنکھوں میں پانی بھر بھرا آتا تھا۔

یہ اُسی رات کی بات ہے جب بالکونی کے سامنے، نیچے بازار میں خوب ریل چلی تھی، کئی زندگیاں وقت کی پاکی میں بیٹھی اکل پیارے چلی جاتی تھیں، آوازیں دھوکے کے مرغلوں کی طرح اٹھتی تھیں اور فضا بے ضبط میں معدوم ہو جاتی تھیں۔ اوپر بالکونی میں بیٹھے بائیں کرتے کرتے جہان نون کی روایات کے امین اور اساتذہ ادب کے وارث اجہ اسلام اجہ صاحب نے مجھے اپنا دکھ بتایا تھا۔

”جب میں کسی قابل ہوا کہ اُن کی خدمت کر سکتا تو میری ماں جی فوت ہو گئیں۔ مرے چار سوتے ہوئے دھواں، مرے خواب سے مری آنکھ تک، یہ جو سیلی اٹک ہے درمیاں، اسی سیلی اٹک کے پار ہے، کہیں میری ماں!“



”خود جلیں دیدہ اغیار کو مینا کر دیں“



husain_sayyed2001@yahoo.com

قلندر حسین سید سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلم کار ہیں۔ گزشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جا رہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سید نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیون کی ٹھاس، کوڑھٹا کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے!!

ہو جائیں تالوں پر۔

حاصل مطالعہ

- 10% لڑکیاں سپورٹس کھیلتی ہیں اور 90% لڑکیاں تو لڑکوں کے دلوں سے کھیلتی ہیں۔
- وقت: موسم اور لوگ سب کی ایک فطرت ہوتی ہے کب کون کہاں بدل جائے۔
- جس قوم میں تعلیم، فقیر اور صحت کے شعبے منافع بخش کاروبار بن جائیں اسے دنیا کی کوئی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ (ٹیلن منڈیلا)
- جس ملک کے ہر کلومیٹر پر لائبریری اور تجربہ گاہوں کے بجائے دربار اور درگاہیں ہوں وہاں سائنسدان نہیں بلکہ مجاد اور ملنگ پیدا ہوں گے۔

- لوگ مذہب کے لئے لڑیں گے، جگڑیں گے، مذہب کی حمایت میں لکھیں گے، لیکچر دیں گے اور اس کی خاطر مرجائیں گے لیکن اس کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گے۔ (خلیل جبران)
- اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد نہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں۔ (القرآن 2-11)
- پاکستانی واحد قوم ہے جو صفائی کے لئے گندہ کپڑا مانتی ہے۔
- اتنی تاخیر نہ کیجئے پلٹنے میں..... کہ چابیاں بے اثر

○ سورج سے کسی نے پوچھا کہ باقی آٹھ سیارے
تیرے گرد ہی کیوں چکر لگاتے ہیں؟

سورج بولا مجھے نہیں معلوم میں اپنے کام سے کام رکھتا
ہوں۔

○ پاکستان کی جمہوریت اور طوائف کے گوشے میں
ایک قدر مشترک ہوتی ہے دونوں کے دروازے
غریب کے لئے بند اور اشرافیہ کے لئے کھلے ہوتے
ہیں..... سوچئے!

○ پرنٹف جوڑا خواتین کا ہوتا ہے باقی سب وہم
ہے۔

○ ضروری نہیں کہ آپ عظیم کادل جیتنے کے لئے محل
نہی بنوائیں یہ کام برتن اور کپڑے دھو کر بھی کیا
جاسکتا ہے۔

○ رات دس بجے کے بعد کال چار ج 200 فیصد
بڑھا دیے جائیں یہ اگلی نسل پر حکومت کا احسان عظیم
ہوگا اور مفید انویسٹمنٹ ہوگی۔ بہت سارے والدین
پریشان دیکھنے لگے جو ان کی حالت زار دیکھی۔

○ بچہ اپنی دادی سے: دادی کیا ہم ہمیشہ پانچ ہی
رہیں گے آپ میں ابوائی اور باجی۔

دادی: نہیں جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو ہم چھ
ہو جائیں گے۔

بچہ: پھر جب باجی کی شادی ہو جائے گی پھر ہم پانچ
رہ جائیں گے۔

دادی (بیچارے): پھر جب تمہارا بیٹا ہو جائے گا ہم
پھر چھ ہو جائیں گے۔

بچہ: جب آپ فوت ہو جائیں گی تو پھر سے ہم پانچ
ہو جائیں گے۔

دادی (نفسے سے): بے شرم سو جا چپ کر کے۔

○

○ الیہ یہ ہے کہ پاکستان میں کتابیں لکھنے والے
سے زیادہ تعویذ لکھنے والا کما لیتا ہے۔

○ اٹلی والوں کی رائے ہے کہ جس مرد کی جراثیم
پیشی یا شین ٹوٹے ہوئے ہوں تو اسے دو میں سے
ایک کام فوراً کر لینا چاہئے یا شادی کر لے یا بیوی کو
طلاق دے دے۔

○ مصری دانشور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شادی
چھوٹے قد کی عورت سے کرنی چاہئے کیونکہ مصیبت
جتنی چھوٹی ہوتی بہتر ہے۔

○ تعجب عورتوں کی عریانی اور تنگ لباس کو دیکھ کر
نہیں ہوتا بلکہ تعجب یہ ہے کہ جس گھر سے نکلی ہیں کیا
اس گھر میں مرد بھی رہتے ہیں۔

○ نیند اور تم کہاں پر رہتے ہو دونوں کیوں رات بھر
نہیں آتے۔

○ جب چھوٹے تھے تو بھول جایا کرتے تھے دنیا کتنی
تھی یاد رکھنا سیکھو بڑے ہوئے تو ہر بات یاد رہتی
ہے دنیا کتنی ہے کہ بھولنا سیکھو۔

○ جسے ہم اپنا چاند کہتے تھے اس نے تارے دکھا
دیئے ہم کو۔

○ اتنا زرخیز ملک کس کو ملے گا جہاں ایک اینٹ
اٹھاؤ گے تو نیچے سے چار دانشور نکل آتے ہیں۔

○ تعلیم انسان کو انگوٹھے کے نشان سے دستخط تک
لے گئی، ٹیکنالوجی دستخط سے انگوٹھے پر واپس لے
آئی..... دنیا گول ہے۔

○ ماچس کی ہر تیلی کا سر ہوتا ہے مگر اس میں دماغ
نہیں ہوتا اس لئے ذرا سا رگڑنے پر بھڑک اٹھتی
ہے۔

○ حضرت انسان کو خدا تب یاد آتا ہے جب وہ درد
کا مارا ہو غرض کا مارا ہو یا مرض کا مارا ہو۔

میں نے کہا بہن ترے کیسے کئے گی ذمہ
جاتے ہوئے چراغ اس نے بجھا دیا کہ یوں
(مرضی برلاس)

دنیا میرے آگے

محمد تقی عثمانی کی کتب سے اقتباس

جسٹریٹ لائبریری:

مارش لائبریری کے بعد ہم جسٹریٹ لائبریری کی مشہور لائبریری میں پہنچے۔ یہ وسط شہر کی ایک بلند و بالا عمارت میں واقع ہے۔ یہ لائبریری بھی اس کے بانی کے نام سے موسوم ہے۔ انہیں سر الفریڈ جسٹریٹ لائبریری کہا جاتا ہے۔ ان کی قائم کردہ یہ لائبریری صرف مذاہب عالم کی کتابوں اور مخطوطات پر مشتمل ہے۔ جس میں اسلام، عیسائیت، یہودیت، ہندو مذہب، بدھ مت، جین، سکھ، تاؤ، شنتو ہر مذہب کا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ کتابیں عربی، لاطینی، انگریزی، فارسی، ترکی، اردو، ہندی اور نہ جانے کتنی زبانوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ عربی مخطوطات کا بھی یہاں بہت بڑا ذخیرہ ہے جس کا صرف کیڑا لگ (فہرست) آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس لائبریری میں آنے کا مقصد یہ تھا کہ یہاں قدیم عربی کتب کے مخطوطات اصلی شکل میں دیکھنے کا موقع مل سکے لیکن یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخطوطات کا ذخیرہ مستقل طور پر رکھا ہوا نہیں ہے بلکہ اس کے لئے پہلے سے تاریخ، وقت اور کتابوں کا تعین کرنا پڑتا ہے اس کے بغیر اس سے استفادہ ممکن نہیں ہے۔ البتہ عام لوگوں کی دلچسپی کے لئے انہوں نے ایک شوروم ایسا بنایا ہوا ہے جس میں خطاطی کے مختلف نمونوں کی نمائش کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں ایک شوکیس میں دسویں صدی عیسوی یعنی تقریباً

تیسری صدی ہجری کا لکھا ہوا قرآن کریم کا ایک نسخہ موجود ہے جو اعلیٰ میں لکھا گیا تھا اور اب تک اس کی آب و تاب اور خطاطی کے حسن میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کے سوا اس شوروم میں میری دلچسپی کی کوئی چیز نہ تھی البتہ لائبریری کی عربی کتب کا کیڑا لگ جو آٹھ جلدوں میں ہے یہاں نسبتاً کم قیمت پر دستیاب تھا اس لئے میں نے وہ قیمت سمجھ کر خرید لیا۔ اس کیڑا لگ میں تمام مخطوطات کا تعارف بھی ہے اور ان کے صفحات کی تصاویر بھی موجود ہیں۔ ان میں سے بہت سے مخطوطات خود مصنفین کے اپنے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔

ڈبلن کے ان دو کتب خانوں کی سیر بڑی دلچسپ رہی۔ اپنے اسلاف کی کتابوں کے بجائے وہ عظیم ذخیرے ہیں جو یورپ کے مختلف شہروں میں بکھرے ہوئے ہیں اور جن کو دیکھ کر شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا

وہ حکمت کے خزانے وہ کتابیں اپنے آبا کی

جو دیکھیں جا کر یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

یہ سوال عام ذہنوں میں بکثرت پیدا ہوتا ہے کہ

ہمارے اسلاف کی کتابیں اتنی بڑی تعداد میں یورپ کیسے پہنچیں؟ اور ان غیر مسلم قوموں نے ان کا اتنا تحفظ کیوں کیا؟ اس سوال کا جواب اگرچہ تفصیل کا محتاج ہے اور یہ مختصر سفر نامہ اس کا مکمل نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ وہ جواب ہمارے لئے بہت سی عبرتیں رکھتا ہے اس لئے اختصار کے ساتھ اس کی طرف اشارہ مناسب ہے۔ سولہویں صدی عیسوی سے پہلے دنیا بھر میں علم و فن کے سب سے بڑے مراکز عالم اسلام میں تھے اس وقت غیر مسلم یورپ علم و ہنر اور فن و حکمت سے بحیثیت مجموعی اتنا آشنا نہیں تھا اور

پڑھائی جاتی رہی۔

THE WISDOM OF THE)
EAST: MARSH'S ORIENTAL
(BOOKS P17

لہذا اسلاف امت کی یہ کتابیں چونکہ یورپ کے لئے عقیم عمن کی حیثیت رکھتی تھیں اس لئے نشاۃ ثانیہ کے بعد کے یورپ نے انہیں محفوظ کرنے کا اہتمام کیا۔ ان کتب کا بڑا ذخیرہ تو وہ ہے جو یورپی قوموں نے عالم اسلام کے مختلف ملکوں پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں سے بڑو شمشیر حاصل کیا اور یورپ کے کتب خانے اچھی طرح دیکھنے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ان میں سے بڑا ذخیرہ وہ بھی ہے جو ان لوگوں نے مسلمانوں سے خریدا۔ یہ مسلمانوں کے علمی انحطاط اور معاشی بدحالی کا زمانہ تھا۔ اس لئے بہت سے ناب ذخیرہ غیر مسلموں کو فروخت کرنے میں لوگوں کو باک نہ ہوا۔ شروع میں ان کتابوں سے اہل یورپ کے شغف کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کی نشاۃ ثانیہ میں ان کتابوں کا بڑا اہم کردار تھا۔ علم دشمنی کا تاریک دور ختم ہوا تو یورپ میں علم دوستی کا ایسا رجحان پیدا ہوا کہ انہوں نے ہر علم و فن کی قدر پہچاننے اور ان کے تحفظ کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ ہر علم و فن میں اختصاص رکھنے والے (SPECIALIZED) اسکالرز پیدا کئے خواہ علمی زندگی سے علم کے اس گوشے کا کوئی تعلق نہ ہو۔ مسلمانوں کے دینی علوم کے تحفظ کے چھپے ایک تو حامل یہ تھا دوسرے بہت سے لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت جو فکری تحریکیں پروان چڑھانی معذور تھیں ان کی تقویت کے لئے علمی اسلحہ انہی مشرقین نے فراہم کیا جو اسلامی علوم کے مطالعے اور

اس معاملے میں عالم اسلام کا محتاج تھا۔ یورپ کے حکمران اپنے فہمراہوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لئے انڈس بھیجا کرتے تھے۔ لیکن شامت اعمال سے جب مسلمانوں کی اپنی کا علمی سے ان کا سیاسی زوال ہوا تو عالم اسلام کا علمی سرمایہ فاقہین یورپ کی طرف منتقل ہونا شروع ہوا۔ انڈس کے زوال کے بعد وہاں برسر اقتدار آنے والی عیسائی حکومت تو اس درجہ متعصب اور علم دشمن تھی کہ اس نے مسلمانوں کے کتب خانے غارتش کر دیئے اور علم و حکمت کے نہ جانے کتنے خزانے غرناطہ کے چوراہوں پر پھینک دیے۔ لیکن ہمارے اسلاف نے ہر موضوع پر تالیفات کا جو ذخیرہ تیار کیا تھا وہ اس کے باوجود تمام تر فنا نہ ہوسکا۔ کچھ علم دوست لوگوں نے اس وقت بھی مسلمانوں کی کتابیں چوری چوری چھپا کر رکھیں جب ایسی علم دوستی عیسائی تفتیش (Enquisition) کے ہاتھوں اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھی اور پھر رفتہ رفتہ جب یورپ میں وسیع الشربہ کا چرچا ہوا تو ان کتابوں سے استفادہ کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے اسباب میں ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ جن لوگوں نے عیسائی جکڑ بند کے بندھن توڑے انہوں نے مسلمانوں کے عقیم ورثے سے استفادہ کیا۔ مارشل لا بیری کے مطبوعہ کیلاک میں ابن سینا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

ابن سینا نے طب ریاضی منطق فلکیات اور فلسفے پر سو سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی مشہور کتاب ”قانون الطب“ کو یورپ کی یونیورسٹیوں میں حکمت کا خزانہ قرار دیا گیا ہے اور وہ سترہویں صدی کے وسط تک نصابی کتب کی حیثیت سے

جنوبی پنجاب کی بات کیوں کی جارہی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ میں اپنی پہلی فرصت میں وزیراعظم سے ملاقات کر کے انہیں یقین دہانی کراؤں گا کہ آپ نے اقتدار میں آنے سے پہلے متعدد بار بہاولپور صوبہ کے قیام کا وعدہ کیا تھا جس کی ویڈیوز بھی موجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جو تیاں ہی کھاتی ہیں تو تخت لاہور سے کھاتے رہیں گے آسمان سے گرا اور کجور میں اٹکا کے مترادف ہم اب سرداروں اور گدڑی نشینوں کی غلامی نہیں کر سکتے۔

(بحوالہ: نوائے احمد پور شرقیہ)

پاکستان میں جتنی کرپشن احتساب کے نام پر بے ایمانی کے نام پر، جہاں امن کے نام پر غدارا جہاں الوطنی کے نام پر جہالت علم کے نام پر اور انسانیت کی تذلیل انسانیت کے نام پر ہوئی ہے اتنی کسی دوسرے معاشرے میں شاید ہوئی ہو.....

پتن منارہ..... تاریخی و تہذیبی لوک ورثہ

رحیم یار خان سے تقریباً 10 کلومیٹر جنوب مشرق میں صحرائے چولستان کے خشک دریاہاکڑہ کے کنارے ایک عظیم الشان قدیم شہر اور اہم دریائی بندرگاہ کے کھنڈرات موجود ہیں۔ موہنجودڑو اور ہڑپہ کے ہم عصر شہروں کے درمیان ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ آثار قدیمہ کے سروے کے دوران 150 ایسی قدیم آبادیوں کے نشانات ملے ہیں جو ہڑپہ شہری تہذیب سے ملتی جلتی ہیں۔ تاہم پتن شہر دریاؤں کے مقام اتصال پر واقع تھا۔ محل وقوع کی وجہ سے پتن شہر کو بے حد سیاسی عسکری اور تجارتی اہمیت حاصل تھی۔ چولستان کا

تحقیق کے لئے وقف تھے۔ بہر صورت اسباب کچھ بھی ہوں قدیم علمی ورثے کی حفاظت یورپ نے خوب کی۔ یہاں تک کہ بظاہر وہ پرانی کتب جنہیں دیکھنے والے بھی اب وہاں خال خال ہی ہوں گے ذریعہ صرف کر کے بڑے اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھی جاتی ہیں اور انہیں زمانے کے تہیڑوں سے بچانے کے لئے جدید ترین تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔

”عمل“

جاپان میں تیسری جماعت تک بچوں کو ایک ہی مضمون سکھایا جاتا ہے اور وہ ”اخلاقیات اور آداب“ ہیں۔

حضرت علیؑ نے فرمایا جس میں ادب نہیں اس میں دین نہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ جاپان والے حضرت علیؑ کو کیسے جانتے ہیں اور ہمیں ابھی تک ان کی یہ بات معلوم نہ ہو سکی بہر حال اس پر عمل کی ذمہ داری جاپان والوں نے لی ہے۔

”بہاولپور“

طارق بشیر چیمہ ایم پی اے نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بہاولپور 1951ء سے 1954ء تک اپنی صوبائی اکائی کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ بہاولپور کی صوبائی اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر خود ان کے والد تھے مزید برآں اس حوالے سے پنجاب اسمبلی سے متفقہ طور پر منظور ہونے والی قراردادیں اپنی جگہ موجود ہیں جس کی روشنی میں جنوبی پنجاب اور بہاولپور صوبہ کی الگ الگ منظوری ہوئی تو پھر

نور علی ضامن حسینی مرحوم نے تاریخی جغرافیائی شہادتوں کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ بنوں عاقل سے شمال کی جانب کچھ فاصلے پر بنوں منارہ کا شاعر شہر الورتھا اور اس کی عمارت قلعہ اور کئی میل میں پھیلی ہوئی تھی۔ نشانوں اور باقیات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو سندھ میں اس سے زیادہ خوبصورت معیاری اور خوشحال شہر کے آثار اور کہیں نہیں ملتے۔ سکندر اعظم نے اس شہر کو اپنا دوسرا بڑا مرکز بنایا اور جنوب مغربی علاقوں کے حاکم میوی کنیس کے خلاف اس کی فوجی مہم کا آغاز بھی بنوں منارہ سے ہوا۔ سمیرک کا یہ بھی خیال ہے کہ سکندر اعظم کے عہد کا شہر (جسے یونانی پینا گارا کہتے ہیں) بھی الورتھا کے قریب تھا۔ اگر سید نور علی حسینی کی رائے کو درست خیال کیا جائے تو پھر بنوں منارہ کے قریب علاقہ بندور کو پینا گارا تسلیم کرنا پڑے گا۔ کھوکھر دروازہ الورتھا اور بندور کے قدیم آثار اور نشانیاں بنوں کے دس میل کے اندر موجود ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنوں کی وسیع منصوبہ بندی تھی۔ غلہ جمع کرنے کیلئے گودام، فرش گاہ، افواج، محلات الگ الگ سستوں میں تعمیر کئے گئے تھے اگر ان شواہد کو سامنے رکھا جائے تو بدھ جتنی سیاح کی آمد کے وقت بھی سندھ کا دارالحکومت بھی شہر بنوں منارہ بنتا ہے۔ بنوں سنگ نے اپنی یادداشتوں میں اس کو ”پی شش یولو“ کا نام دیا ہے۔ مختلف شہادتوں سے مورخین نے اندازہ لگایا ہے کہ بہاولپور شہر سے 12 میل دور سوئی دھار کی بدھ دلائ گاہ مہاراجہ کی تخت نشینی کے 11 سال بعد 136ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ بنوں شہر کی باقیات پر بدھ کی عظیم عمارت کا جو بلند و بالا لاکھڑا موجود ہے ماہرین کے نزدیک وہ بھی اس عہد کی تعمیرات میں

دریائے ہاکڑہ خشک ہونے کی وجہ سے بنوں شہر کی اہمیت ختم ہوتی چلی گئی اور خشک سالی کی وجہ سے بنوں شہر دریائوں میں تبدیل ہو گیا۔ اب یہ ایک مدفن شہر چند کنڈرات اور آثار سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں۔ پرانے تذکروں میں وادی سندھ کے دریاؤں اور اس کے کناروں پر آباد شہروں کی دلچسپ تفصیلات ملتی ہیں۔ مشہور فاتح سکندر اعظم نے اپنی افواج قاہرہ کو دریاؤں کی مدد سے وادی سندھ پر تاج کیا تھا سکندر اعظم کے حالات سفر میں دریاؤں کے ایک مقام اتصال پر ”گڈیا“ کے ایک علاقائی شہر کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ یہ دریائے ستلج اور دریائے سندھ کا ملحقہ تھا اور موجودہ پنجند ہیڈ ورکس کی جانب قدیم قصبہ اوج کے قریب تھا۔ یہاں سکندر اعظم نے اپنے بیڑہ کے لئے نئی گودیاں تعمیر کرائیں۔ سو ”گڈیا“ سے آگے سکندر اعظم شاہ میوی کنیس کی سلطنت کی حدود میں پہنچا لیکن میوی کنیس نے سکندر اعظم سے مقابلہ کی بجائے اپنے برہمن سرداروں اور تحائف کا ایک بڑا ذخیرہ لے کر اپنے لشکر سمیت بحر پور طریقہ پر اطاعت کا اظہار کیا مگر بعد میں ممتاز مورخ ایرین کے بقول سکندر اعظم نے میوی کنیس کو اسکے خوبصورت شہر میں چھائی دیدی۔ سکندر اور روہڑی کے قریب پہاڑی پر موجود شہر کے آثار کو اکثر مورخین الورتھا کہتے ہیں اور میوی کنیس کا دارالحکومت تصور کرتے ہیں مگر چند مورخین جن میں سمیرک بھی شامل ہے اس سے اختلاف کرتے ہیں کیونکہ وہ الورتھا کی موجودہ جائے وقوع کو صحیح نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ وہ جہ ہون سنگ گجرات دکانیا داڑ سے ایک فاصلے طے کر کے پہنچا تھا۔ بنوں عاقل کے قریب کوئی دریا شہر ہو سکتا ہے۔ ممتاز مورخ ودانور سید

عبادت گاہ اور ہندو مندر موجود تھے۔ امیر بہاولپور بہاول خان ثالث کے عہد 1804ء میں آ کر قوم کا جوگی اس مندر کا نگران تھا لیکن جلد ہی اس مندر میں جسے عرف عام میں مسڑھی کہا جاتا ہے، شوٹنگ کی پوجا شروع ہو گئی۔ بے اولاد خواتین وہاں آنے لگیں۔ مسلمان عورتوں کی آمد و رفت بڑھنے سے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور درویشوں کے ایک گروہ نے جس میں اکثریت درگاہ بھرچوٹھی شریف کے مریدوں کی تھی اس مندر کو مسمار کر کے یہاں ایک مسجد تعمیر کر دی جو مندر کی جگہ آج بھی وجود ہے۔ اس علاقہ میں نمک کی بہت کثرت رہی۔ مشہور ہے کہ چتن کے عظیم مندر کے پروہت بابائے جو دودھ اور پانی کے تالاب سے تھمک کر تھکا ہوا تھا تو چنیر میں دفن ہو کر خود کشی کر لی تھی۔

چتن منار کی کرسی زمین سے بہت بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیلاب نے اس کے کھنڈرات کو یکسر ملیا میٹ نہیں کیا۔ واقعات سے پتا چلتا ہے کہ ایک عہاسی داد پوترا سردار افضل خان عہاسی نے بدھ خانقاہ اور ہندو مندر کی پختہ اینٹیں اکٹرا کر دین گڑھ اور بھاگلہ قلعوں کی تعمیر میں استعمال کرائیں۔ 1973ء کے سیلاب نے قدیم دریائے ہاکڑہ کا راستہ اختیار کیا تھا۔ بہاؤ کے زور کی وجہ سے چتن منار کے قریب ایک وسیع جمیل بن گئی جس کا پانی ٹمکین تھا۔ 1870ء میں کرنل منچن نے بدھ کے کھنڈرات کی کھدائی کرائی تھی لیکن کوئی خاص چیز نہ تھی۔ اس دوران کچھ لیس دار مادہ برآمد ہوا جس پر بڑی بڑی زہریلی کھیاں تھیں جن کے کاٹنے سے کئی مزدور جاں بحق ہو گئے اس لئے کام بند کر دیا گیا۔

سے ہے۔ سر آرل شائن نے تو برصغیر میں اس عمارت کو دوسری صدی عیسوی کی بہترین تعمیرات میں شمار کیا ہے۔ اس عمارت کی کرسی موجودہ سطح زمین سے 15 فٹ بلندی پر ہے اور اس کے اوپر 26 فٹ بلند عمارت 12 فٹ عرض کے ساتھ موجود ہے۔ موجودہ کھنڈرات کے ارد گرد گول محرابوں کے نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ برج جو دور سے اب ایک مینار معلوم ہوتا ہے کسی عظیم مرکزی عمارت کا حصہ ہے۔ اس ایک ٹکڑے سے عمارت کی اعلیٰ طرز تعمیر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کرنل ناڈ نے دسویں صدی عیسوی میں چتن کو ایک ہندو راجہ کا پایہ تخت بیان کیا ہے کہ اس عمارت کی جانب مشرق میں ایک بڑے قلعے کے واضح آثار موجود ہیں۔ درمیان میں ایک اونچی اور مرکزی جگہ ایک ہندو مندر تھا جہاں شیوا رتری کا تہوار ہر سال دھوم دھام سے منایا جاتا تھا اور دور دور سے ہندو حکمران یہاں حاضری دیا کرتے تھے۔ بعد میں سابق ریاست بہاولپور میں متین انگریز ریذیڈنٹ کرنل منچن کے بیان کے مطابق چتن کی یہ بدھ عمارت کے اندرونی پلستر کو اکھاڑنے سے وہاں کچھ سندھی عمارت درج پائی گئی جس کے متن کا مفہوم کچھ اس طرح تھا ”میں نے ہر قسم کے منافع میں سے آدھا آدھائی روپیہ مندر کو بھجوانے کا اقرار کیا۔“ آئین اکبری میں صوبہ سیوستان کے ایک پرگنہ کے طور پر چتن پور کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ فتح سومناٹ کی طرف جاتے ہوئے سلطان محمود غزنوی بھی اسی راہ سے گزرا تھا۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ عہاسی داد پوتروں نے 1902ء میں جب ریاست بہاولپور کی بنیاد ڈالی تو اس وقت بھی اس شہر پر بدھ

کاجر..... آنکھوں کی پیمائی بہتر کرتی ہے اور
کینسر نہیں ہونے دیتی۔

مالا..... جسم میں بیماری کے خلاف دفاعی نظام کو
بہتر کر دیتا ہے۔

آڑو..... ہارٹ اٹک کو روکتا ہے اور ہانسنے کو
بہتر کرتا ہے۔

آم..... یادداشت کو اچھا کرتا ہے اور تھائی
رائیڈ گلیٹنڈ نہیں بننے دیتا۔

انگور..... آنکھوں کی صحت کے لئے بہتر ہے اور
گردے کی پتھری نہیں بننے دیتا۔

”تھیوری کیساتھ پریکٹیکل

ورک از حد ضروری ہے“

تعلیم ہر مرد و عورت کے لئے از حد ضروری ہے
تعلیم انسان کو شعور فراہم کرتی ہے۔ تعلیم انسان کو
پستیوں سے اٹھا کر بلند یوں تک لے جاتی ہے اور
تعلیم ہی کی بدولت کوئی معاشرہ دوسرے معاشرے
سے ترقی کے میدان میں مقابلہ کرنے کے قابل ہوتا
ہے۔ اچھے نظام تعلیم کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ طلباء کو
خواندہ بنانے اور بیرونی ماحول سے مطابقت پیدا
کرنے کے قابل بناتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس
کی نظریاتی فکری تہذیبی اور فنی تربیت بھی کرتا ہے
تاکہ اس کے نتیجے میں وہ مستقبل میں پیش آنے والی
مشکلات اور مسائل کا تجزیہ کر کے اپنی صحیح رائے قائم
کر سکے۔

تعلیم کا مقصد صرف ڈگری کا حصول نہیں ہے
بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تخلیقی صلاحیتوں اور تکنیکی
میدان میں مہارتوں کا حصول بھی از حد ضروری ہے
کیونکہ تخلیقی صلاحیتیں ملک و قوم کی ترقی کا باعث بنتی

”سروینسٹن چرچل“

چرچل نے بی بی سی ریڈیو پر تقریر کرتی تھی
انہوں نے ایک فیکٹی روکی اور اسے چلنے کے لئے
کہا۔ فیکٹی ڈرائیور نے معذرت کرتے ہوئے کہا
”جناب میں نے گھر جا کر چرچل کی تقریر سنی ہے
اس لئے کہ میں ان کا مداح ہوں۔ اس لئے میں
آپ کو نہیں لے جاسکتا۔“

چرچل نے یہ سنا تو بہت خوش ہوا اور دس پونڈ
نکال کر فیکٹی ڈرائیور کی پتیلی پر رکھ دیئے اور خوشی میں
کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ڈرائیور خوش ہو کر بولا ”لخت
بھینچیں چرچل پر آئیں آپ کو چھوڑ آؤں۔“

”ٹریفک آگاہی مہم“

○ ٹریفک سگنلز کی پابندی کریں۔
○ موٹر سائیکل سوار جیلمٹ اسٹینڈل کریں اور کار
ڈرائیور سیٹ بیلٹ ضرور باندھیں۔
○ کم عمر بچوں کو موٹر سائیکل اور کار ڈرائیونگ کی
اجازت مت دیں۔
○ رات کے وقت گاڑی کی لائٹس مدہم رکھیں اور
دوران ڈرائیونگ اپنی لائن میں رہیں۔
○ دوران ڈرائیونگ موبائل فون کا استعمال جان لیوا
ثابت ہو سکتا ہے اور گاڑی کا دروازہ کھولتے وقت
احتیاط کریں۔

”فوائد“

سیب..... دل کی حفاظت کرتا ہے اور قبض نہیں
ہونے دیتا۔
کیلا..... ہڈیاں مضبوط کرتا ہے اور بلڈ پریشر
کنٹرول کرتا ہے۔

کام کو بہتر انداز میں مکمل کر لیتے ہیں تو ان کے اندر بڑا جوش اور جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ ناقابل یقین خوشی محسوس کرتے ہیں۔ پریکٹیکل سے طلباء کام کرنا سیکھتے ہیں جو ان کی عملی زندگی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ پریکٹیکل کرنے والے طالب علم کی صلاحیتوں کی ڈیولپمنٹ ہوتی ہے جسے منصوبہ سازی، مشاہدہ، آلات کا استعمال اور تشخیص۔ یہ سب عملی تجربوں سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جیسے اپنے تجربوں کو پرکھنا، ان کا تجزیہ کرنا، نظریات کو پرکھنا، مسائل کا حل ٹیم ورک کے ساتھ تجربہ کرنے کی صلاحیت اور طالب علموں کا خود سے کچھ نیا سیکھنا، یہ سب عملی تجربوں کی بدولت ممکن ہے۔ عملی سائنس ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس طرح طالب علم خود سے کام کرتے ہیں اور اپنی ذہنی سطح کے مطابق کچھ نیا سیکھتے ہیں۔ عملی کام کا بڑا مقصد نئے نئے سوالات کے بارے میں سوچنا اور طالب علموں کے اعتماد کو بحال کرنا ہے جیسے گروپ کے ساتھ کام کرنا، اکیلے کام کرنا، مواد کو جوڑنا، مشاہدہ کرنا، غیر رسمی انداز میں اساتذہ کے ساتھ بات چیت کرنا، جو بچے پڑھائی میں عملی تعلیم حاصل کرتے ہیں ان میں یہ صلاحیتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔ ان صلاحیتوں کی وجہ سے طالب علموں کی آئندہ زندگی زیادہ بہتر ہو جاتی ہے اور ایسی مہارتیں جو اکثر سکولوں میں نہیں سکھائی جاتیں جیسے ذاتی فنانس، ذاتی فنانس کو سکودوں میں شروع کی عمر میں سکھانا چاہئے۔ بچوں کو یہ سمجھانا چاہئے کہ قرض لینے میں کیا مشکلات آتی ہیں۔ آج کل کے بچوں کو تمام تعلیم دی جا رہی ہے تو ذاتی فنانس کی تعلیم بھی ضروری ہے تاکہ ان میں آزاد خیال ہو اور ان کو پیسوں کی بچت کی اہمیت پتہ چلے

ہیں۔ سکول و کالج اور یونیورسٹی کسی بھی سطح پر تھیوری کے ساتھ ساتھ پریکٹیکل ورک از حد ضروری ہے کیونکہ یہ طلباء میں اعتماد اور لگن پیدا کرتا ہے اور مطلوبہ تعلیمی مقاصد کے حصول میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ دوران تعلیم پریکٹیکل طلباء کی عملی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ پریکٹیکل ورک میں مہارت سے طلباء کسی بھی کام کو محفوظ طریقے سے کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں منصوبہ سازی، مشاہدہ، آلات کا بہتر انداز میں استعمال اور بہتر نتائج کے حصول کے لئے احسن انداز میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ سکول و کالج کے طلباء میں گروپ پریکٹیکل کی بدولت ٹیم ورک حکمت عملی سے مسائل کا حل کچھ نیا کرنے کی لگن اور نئے نئے نظریات اور تجربات کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔ یہ طلباء میں تحقیق کی خوبی بھی پیدا کرتے ہیں۔

تھیوری کے ساتھ ساتھ پریکٹیکل کی طرف مہم پر توجہ دینے والے طلباء میں عقل، حوصلہ، تجسس، کوشش، برداشت، تحفظ، مسئلے کا حل، ذمہ داری کا احساس اور ناکامیوں سے سیکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے یہ وہ تمام خوبیاں ہیں جو عملی زندگی میں بڑی موثر ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً جو بچے حساب میں بڑی موثر ہوتے ہیں اگر ایسے بچوں کو پیسے دے کر خریداری کے لئے کہا جائے تو ان کے اندر پیسوں کے حساب اور خریداری کے بہتر انداز پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح صرف تھیوری کی کتابوں کو روک لگوانے کے بجائے چند عملی سرگرمیوں پر توجہ دے کر طلباء کی بہت سی صلاحیتوں کو نکھارا جاسکتا ہے۔

آپ نے اکثر مشاہدہ کیا ہوگا کہ طلباء جب کسی

بچوں کو عملی تعلیم دی جائے۔

یہ بات بھی تجربات سے ثابت ہو چکی ہے کہ تھیوری اور کتابی باتیں طلباء کے ذہن سے کچھ عرصہ کے بعد محو ہو جاتی ہیں لیکن اس کے برعکس کوئی بھی عملی کام طلباء کے اذہان پر نقش ہو جاتا ہے اور ایک عرصے بعد بھی ان کام کو وہ بہتر انداز میں سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ عملی کام یعنی پریکٹیکل کے ساتھ دی گئی تعلیم دیر پا اور موثر ثابت ہوتی ہے۔

ہمارے موجودہ نظام تعلیم کے بگاڑ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے طلباء کو صرف تھیوری پڑھانی جاتی ہے جس سے ان کی تخلیقی صلاحیتیں استعمال نہ ہونے کی وجہ سے زندگ آلود ہو جاتی ہیں نتیجتاً زندگی کے کئی سال صرف کرنے کے بعد جب طلباء ڈگری حاصل کر کے عملی میدان میں نکلتے ہیں تو ہر فیڈ میں ناکام نظر آتے ہیں جو بعد میں کام چوری ناجائز ذرائع کے استعمال اور بہت سے دوسرے معاشرتی، سماجی اور مذہبی بگاڑ کا باعث بنتے ہیں۔ پاکستان کے برعکس دنیا کے دوسرے ممالک خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں تھیوری اور پریکٹیکل دونوں کو یکساں اہمیت دی جاتی ہے اسی وجہ سے ان ممالک کے طلباء میں اعتماد کا اضافہ ہوتا ہے اور وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بغیر کسی پریشانی کے اپنی متعلقہ فیلڈ میں بھرپور انداز میں کام کرنے کے اہل ہوتے ہیں اسی وجہ سے ان ممالک کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہے جبکہ ہمارے ہاں عملی تعلیم کا فقدان ہمارے طلباء کی کامیابی میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ دنیا بھر میں ریاستیں طلباء کو خود مختار بنانے کے لئے عملی اور فنی تعلیم پر زور دیتی ہیں مگر پاکستان میں اس مسئلے پر کوئی

نکسے۔ اس سے بچوں کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوگی کہ انہیں پیسوں کو کس طرح خرچ کرنا ہے۔ بچے ایسی باتوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو اگر کوئی ذمہ داری دی جائے تو وہ اکثر بڑوں سے زیادہ ذمہ داری سے کام کو انجام دیتے ہیں۔ تعلیم کا فائدہ ہی جب ہے جب اس میں زندگی کی بہترین اقدار دکھائی دیں۔ بچوں کو اس طرح کی تعلیم دی جائے کہ انہیں اچھائی اور بُرائی میں فرق کرنا آئے وہ عقل سے سوچیں اور کھلے دل و دماغ سے چیزوں کو دیکھیں۔ اس تعلیم کا اثر یہ ہوگا کہ بچے اپنی زندگی میں احساس اور اقدار کا خیال رکھیں گے۔ ان کو خود سے سوچنا آئے گا۔

جہاں تک ٹیکنالوجی کی بات آتی ہے تو مواصلاتی صلاحیتیں زندگی کو کامیاب بناتی ہیں بچوں کو اپنے خیالات کو بیان کرنا آنا چاہئے۔ بچوں کے کردار کی نشوونما ان کی جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ بے حد ضروری ہے۔ ان کے اندر اپنی بات کو بیان کرنے کی صلاحیت ضروری ہے۔ ٹیکنالوجی کی دنیا میں بچے جہاں آڈٹ ڈور ایکٹیویٹیز سے دور ہیں وہاں وہ مٹی سے بھی بہت دور ہو گئے ہیں اور اگر کبھی وہ مٹی میں کھیل بھی رہے ہوں تو والدین ان کو منع کر دیتے ہیں جب کہ دیکھا جائے تو جو بچے آج بھی مٹی میں کھیلتے ہیں وہ ایسے بچوں سے زیادہ چست ہوتے ہیں جو صرف کمپیوٹر پر کھیلتے ہیں۔ مٹی سے کھیلنے والے بچوں کے اندر جو بہترین صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں ان میں ایک صلاحیت بچوں کے ہاتھوں کی صلاحیت کو ابھارتا ہے غرضیکہ ہم سب کے اندر تخلیقی صلاحیت موجود ہے لیکن اس کو استعمال کرنے کا فن جب ہی ممکن ہے جب بچپن سے

خاص بحث نظر نہیں آتی۔

ہمارے ہاں جن چند کالجوں میں عملی تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے وہاں مناسب تربیتی سہولیات ہی موجود نہیں ہیں۔ جدید پریکٹیکل لیبارٹریز اور آلات کی عدم دستیابی بھی اس ناکامی کی بڑی وجہ ہے اور جن سکولوں میں گورنمنٹ کی طرف سے لیبارٹریز کا قیام عمل میں لایا گیا ہے وہاں اساتذہ کا طلباء کے مستقبل سے غلط نہ ہونے کی وجہ سے پریکٹیکل پر توجہ ہی نہیں دی جاتی جس کے نتیجے میں طلباء کا مستقبل خطرے کا شکار ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ

امتحانات میں جب پریکٹیکل کی باری آتی ہے تو ہمارے طلباء بازار سے بنی بنائی پریکٹیکل کامیاں منگے داموں خرید کر جیسے تیسے وقت گزار لیتے ہیں کیونکہ ان کو اپنی تعلیم سے متعلق پریکٹیکل سکولوں میں عدم سہولیات کے باعث نہیں کروائے جاتے۔ اس لئے وہ امتحانات میں کامیابی کے لئے بنی بنائی پریکٹیکل کامیوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں فنی مہارتوں اور سائنسی تعلیم کی مناسب اردو کتابوں کی عدم دستیابی اور گھٹیا معیار بھی طلباء کی عملی تعلیم اور مہارتوں کے حصول سے بیزاری

انسان کی خوبصورتی

استاد نے کلاس میں داخل ہوتے ہی اپنے سب طالب علموں سے پوچھا:

تم سب کی نظروں میں کوئی چیز انسان کو خوبصورت بناتی ہے؟

سب شاگردوں نے مختلف جواب دیے۔ کسی نے کہا: خوبصورت آنکھیں۔ کسی نے کہا:

خوبصورت چہرہ۔ کسی نے کہا: بڑا قد۔ کسی نے کہا: سفید رنگ۔

اُن کے جواب سن کر استاد نے بیک سے دو گلاس نکالے۔ ایک شیشے کا نہایت خوبصورت اور نفیس گلاس۔ ایک مٹی کا گلاس۔

استاد نے دونوں گلاسوں میں الگ الگ چیز ڈال دی اور کہا۔ میں نے شیشے کے گلاس میں زہر ڈالا ہے اور مٹی کے گلاس میں پینے کا پانی۔ آپ کونسا گلاس پینا چاہتے ہیں؟

سب شاگردوں نے یک زبان ہو کر کہا: مٹی کا گلاس۔

استاد نے کہا: جب آپ کو ان گلاسوں کی اندر کی حقیقت معلوم ہوئی تو پھر آپ کی نظروں میں ان کی ظاہری خوبصورتی کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اسی طرح ہمیں بھی انسان کی اندر سے حقیقت معلوم کرنی چاہیے۔ کیونکہ بہت سے خوبصورت لباس ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر انسان نہیں ہوتے۔ بہت سے خوبصورت چہرے اور جسم ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر دل حیوانات سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔

(تحریر: سلیمہ حامد۔ لاہور)

”حاجت مند“

میں کس کس کی حاجت روا کرتا جب سو میں سے سو حاجت مند تھے۔ پھر میں نے سو چا خیرات دینا کوئی اچھا کام نہیں ممکن ہے کہ آپ اتفاق نہ کریں لیکن میں نے مہاجرین کے کیپسوں میں جا کر جب حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ خیرات نے بہت سے مہاجرین کو نکما بنا دیا ہے۔ دن بھر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں تاش کھیل رہے ہیں بھگت بازی ہو رہی ہے جو آہور ہا ہے گالیاں بک رہے ہیں اور فوگٹ یعنی مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔ ایسے لوگ بھلا پاکستان کو مضبوط بنانے میں کیا مدد دے سکتے ہیں چنانچہ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ بھیک دینا ہرگز نیکی کا کام نہیں۔

(سعادت حسن منٹو)

”احتیاط“

fasting blood sugar	70-130mg	ناشتے سے پہلے شوگر
fast meal blood sugar	180mg/dl	کھانے کے دو گھنٹے بعد شوگر
blood pressure	120/80 mmhg	شریائوں میں خون کا دباؤ
LdLcholesterol	100mg/dl	خراب کولسٹرول جو شریائوں کو بلاک کرتا ہے
HDLcholesterol	40mg/dl	اچھا کولسٹرول جو خراب کولسٹرول کو کم کرتا ہے
Triglycerides	150mg/dl	غذا سے چکنائی بننے والے آیز

کی بڑی وجہ ہے۔ پاکستان میں پرنکلیکلو کے معاملے میں محکمہ تعلیم اور طلباء دونوں ڈمک ٹپاؤ پالیسی پر عمل پیرا نظر آتے ہیں اسی وجہ سے ہمارے طلباء ڈگریاں حاصل کرنے کے باوجود بھی ملکی نظام کی ترقی اور بہتری میں خاطر خواہ کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہو پاتے اور یہی وجہ ہے کہ ہم بجائے ترقی کرنے کے روز بروز جمستی اور نا کامی کی دلدل میں چسپتے چلے جا رہے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا طالب علم تعلیم کے میدان میں نام صرف تحقیقی اور تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہو گیا ہے بلکہ اس میں علم کے حصول کا جذبہ بھی بتدریج ختم ہو رہا ہے جو کہ ہمارے مستقبل اور بقاء کے لئے خطرے کی علامت ہے۔

ثقافتی، معاشرتی اور معاشی تبدیلی تعلیم کے ساتھ ہی ممکن ہے جب ہم تعلیم کی بات کرتے ہیں تو چاہے اس میں سکول ہو یا یونیورسٹی ان سب کا تعلق تعلیم سے ہی ہے اور تعلیم کے کامیاب حصول میں پرنکلیک وک بے حد ضروری ہے یعنی نیچے نہ صرف پڑھیں بلکہ وہ پرنکلیک کے ساتھ چیزوں کا تجربہ کریں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ طلباء کو پرائمری سطح سے ہی عملی کام کا عادی بنایا جائے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکیں اور آنے والے دنوں میں ایک باہل اور ماہر کی حیثیت سے ملک و قوم کی خدمت کر سکیں اور وطن کی ترقی میں غیر معمولی کردار ادا کرنے کے قابل ہو سکیں تب ہی ہم حقیقی معنوں میں تعلیم کے فوائد سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

(ستارہ جمیں بٹ کا کالم جگ ڈاٹ کام سے)

(اقتباس)



نوشاہ اختر

پکھتاوے کا عذاب

بھائی کی باتیں سچ معلوم ہوتیں اور میں جوان سے چڑ جاتا تھا ان کے قریب ہو گیا۔ مجھے لگتا دنیا میں صرف وہ ہی میری ہمدرد و غمگسار ہیں۔ یہیں پر کبھی کبھار ماتم بھی آ جاتی۔ نفرتوں کے زہر کے قطرے بوند بوند کر کے میرے اندر اٹھ لیے جانے لگے۔

ایک شخص کا فسانہ جو انارکسی کا شکار ہو کر اپنی دنیا برباد کر بیٹھا تھا

اور پھر زمین پر اکڑ کر چلنے سے منع فرمایا جاتا ہے اور اس کے بعد فرمان خداوندی ہے ”ان سب باتوں کی بُرائی تیرے پروردگار کے ہاں بہت ناپسند ہے۔“ اور اس کے بعد آیت نمبر 53 میں فرمایا:-
”اور میرے بندوں سے کہئے کہ ایسی باتیں کیا

سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر 36 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
”اور اے بندے! جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے ضرور باز پرس ہوگی۔“

سوچا بند کردوں پھر آن کر کے کان سے لگایا تو کوئی جلدی میں بول رہا تھا۔

”آپ نوشاہہ اختر بول رہی ہیں نا میں ایک بہت پریشان حال انسان ہوں۔ آپ کو اپنا درد بول سنا کر کچھ سکون پالینا چاہتا ہوں۔ آپ کی کالی دھوپ سنہری چھاؤں کی کہانیاں پڑھی ہیں۔ یقیناً آپ میری کہانی بھی لکھیں گی۔ بتائیں کب کتاب زندگی کے اوراق آپ کے سامنے پیش کروں۔ اس وقت فون کرنے کے لئے معذرت دراصل میرا خیال تھا کہ اس وقت آپ سے ضرورت بات ہو جائے گی۔“

”وہیکم السلام“ کہہ کر میں نے جواب کا آغاز کیا۔ ”میں ضرور آپ کی زندگی کی ڈائری کے اوراق پڑھنا چاہوں گی لیکن بیٹا اس وقت نہیں آپ کل ساڑھے دس بجے دن فون کر لیں پھر ہم آئندہ کالائے عمل تیار کر لیں گے۔ اللہ حافظ۔“

”بس ایک شعر سنا کر فون بند کرتا ہوں

عجب سکتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتہ دار
دُور ہوں تو دھواں دین پاس ہوں تو جل اُٹھیں
انتہائی ذکھ بھرے انداز نے مجھ بتا دیا کہ وہ بھی
ایٹول کا ڈسا ہوا ہے اور میں رحمت اللعالمین صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی اپنی دھڑکنوں تک میں
سُن رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
”ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان مال اور
عزت حرام ہے اور اہل ایمان کی مثال باہمی محبت
وابستگی اور ایک دوسرے پر رحم و شفقت کے معاملے
میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کی حالت ہوتی ہے کہ انگلی
بھی ذکھ تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا
ہو جاتا ہے۔“

دل بہ محبوب مجازی بستہ ایم

کریں جو پسندیدہ ہوں۔ بے شک شیطان بدکلامی
کروا کر ان میں فساد ڈال دیتا ہے۔ واقعی شیطان
انسان کا کھلا دشمن ہے۔“

دراصل جموٹ سے پرہیز انسان کی بنیادی
ضرورت ہے کیونکہ اس کے برعکس صفت یعنی
مداقت جہاں اللہ کریم کا وصف اعلیٰ ہے وہیں انبیاء
کرام کا بھی اعلیٰ وصف یہی ہے۔ بندے کا اندر اور
باہر دونوں ہی پاک صاف ہونے چاہئیں۔

کسی کے خلاف جموٹی گواہی دینا بوقت
ضرورت حقیقت کو چھپانا کسی پاک دامن شخص پر
جموٹی تہمت لگانا وعدہ خلافی کرنا منافقت سے کام
لینا احسان فراموشی اور بے جا تعریف بہت کچھ
دراصل جموٹ کی فہرست میں آ جاتا ہے اور یہ سراسر
گھائے کا سودا ہے۔ حسد کی آگ میں جلتے ہوئے
کسی کے اچھے کردار کو بگاڑ کر پیش کرنا اور اسے رسوا
کرنا بھی ناقابل معافی جرم ہے۔

حسد دراصل دیمک کی طرح ہے۔ حسد کی
آگ اندر سے کھا جاتی ہے اور بندے کا قول و فعل
متضاد ہو جاتے ہیں اور اندر کی یہ ٹوٹ پھوٹ انتہائی
خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دراصل یہ جذبہ
کسی شخص کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ حقیقت میں یہ
مشیت الہی اور فتنائے خداوندی کے خلاف ہوتا ہے
کہ اس کو یہ ساری نعمتیں کیوں حاصل ہیں جو مجھے
نہیں ملیں اور یہ عدم اطمینان گویا تقدیر الہی کی خلاف
کینہ رکھنا ہے۔

رات کے تقریباً ساڑھے دس بج رہے تھے عموماً
میں اس وقت اپنے سارے کام سمیٹ کر سونے کیلئے
جاتی ہوں اور اس رات بھی یہی سب ہو رہا تھا کہ
فون کی صدا گونج اُٹھی۔ دیکھا تو ابھی سا نبر لگا

لگام چھوڑ دیتے ہیں اور پھر منہ کے بل دھڑام اور پھر بچتاؤں کی برکھا میں نہاتے ساری عمر گزر جاتی ہے۔

”خاصہ دلچسپ آدمی ہیں آپ بس اپنا تعارف ابھی تک آپ نے نہیں کروایا۔“

”میرا نام ابدال ہے باجی جان! جینکر ہوں اعلیٰ پوسٹ سے ابھی ابھی ریٹائر ہوا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کچھ کروں کیونکہ بیکار انسان اور اس کا ذہن شیطان کی آماجگاہ ہیں اور میں مزید شیطانی چالوں کے چنگل میں پھنسا نہیں چاہتا۔ ایک بیوی اور دو بچوں کا گھرانہ تھا لیکن سب کچھ ختم ہو چکا ہے اور میں تنہائی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ بہت ہی تکلیف دہ زندگی۔ آپ نے ہمیشہ عورت کو مظلوم اور مرد کو ظالم کے گہروں میں گھرا رکھا اگر حقیقت بیان کروں تو عورت بڑی ظالم چیز ہے۔ پہلے انتہائی خوبصورت خواب دکھاتی ہے اور پھر جی چاہے تو قدموں کے نیچے سے تختہ کھینچ کر سر راہ پھوڑ دیتی ہے۔

میری شادی پسند کی ضرورت تھی لیکن گھرانہ اتنا اچھا تھا کہ میرے والدین نے بڑی خوش دلی سے رشتہ مانگا اور بڑے چاؤ سے بیاہ کر لائے۔ مونا میری شریک حیات بہت خوبصورت تو نہیں تھی لیکن بہت اچھے اخلاق اور مزاج کی بی بی تھی اس نے اپنے خوش اخلاق طرز عمل سے سب کو اپنا گرویدہ بنایا۔

باجی جان! آج کا ماحول اور معاشرہ جانے کیوں شر پسند راہ پر استوار ہو چکا ہے بھئیہ یہ قرآن سے دُوری ہے ہم سارا دن نفس کی خواہشات کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ ذلیل و خوار بھی ہوتے ہیں مقصدیتیں بھی برداشت کرتے ہیں لیکن راہ حق کو حاصل کرنا نہیں بلکہ خواہشات کی پیروی بھی ہوتا

زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم
یعنی ایک دوسرے کے لئے ہر رُدی خیر خواہی
اور ایثار کے جذبات رکھیں اور ان تمام باتوں سے پرہیز کریں جن کے باعث باہمی تعلقات بگڑ جانے کا ڈر ہو۔ اس لئے ایک دوسرے کا مذاق اُڑانے سے طعن و تشنیع کرنے سے بُرے القاب دینے سے بدگمانی سے ٹوہ لگانے سے غیبت کرنے سے اور بہتان تراشی سے سختی سے منع فرمایا گیا ہے۔

عاجزی اور اکھاری اگر اس خاکی وجود میں سرایت کر جائے تو پھر ہی سیدی راہ ملتی ہے اور اس راہ کو کوئی بھی اپنا سکتا ہے اس میں اعلیٰ نسب ہونا کوئی شرط نہیں ہے۔

صبح جلدی جلدی کام سیٹھے اور فون کے ارد گرد پھرتا شروع کر دیا حالانکہ اس کی آواز خاصی بلند ہے۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور فون کی صدا بانگ درابن کر گونجی تو لپک کر فون اٹھایا۔ آواز جانی پہچانی تھی اس لئے سلام میں پہل کر دی۔ سلام کے جواب میں وہ ہنسا۔

”ثواب سیٹھے میں آپ نے پہل کر دی بہر حال بہت اچھا لگا۔ بات فون پر ہی ہوگی یا بالمشافہ ملاقات کی ضرورت ہے۔“ اس کا انداز استفہامیہ تھا۔

”آپ بات شروع کریں اگر ضرورت محسوس کی تو ملاقات بھی کر لیں گے۔ بس بہت تیز نہ بولنے کا۔“

”جی ضرور میں محتاط رہوں گا۔“

یہ لفظ محتاط بھی بڑا عجیب لفظ ہے جہاں ضرورت ہوتی ہے ہم احتیاط کا دامن اتھوں سے جھک دیتے ہیں اپنے ارادوں اور خواہشوں کے گھوڑے کو بے

ہے۔

جواب پا کر خوشی خوشی ہم مونا کو دلہن بنا کر اپنے گھر لے آئے اور پھر چند ماہ بعد ہی اماں نے میری پیشانی چومتے ہوئے مونا کو بہت پیار کیا اور فرمایا ابدی حیرتی چوائس تو پر فکھٹ ہے۔ اللہ جوڑی سلامت رکھے اور میں شاید اس گھڑی مونا کے حسن میں گم تھا کہ انشاء اللہ کہنا بھول گیا اور اسی لئے آج تجاہیل کی تلخ راہوں کا گم کردہ مسافر بن کر بھٹک رہا ہوں۔“

اس کی آواز کے سوز نے جس میں آنسوؤں کی نمی بھی شامل تھی مجھے پریشان کر دیا۔
”ابداً بیٹا! لیکن یہ سب کیسے ہوا کے آپ کو تو مونا بہت عزیز تھی۔“

”جی ہاجی جان!“ وہ بولا ”مونا مجھے ہی نہیں سبھی کو بہت عزیز تھی اور چونکہ اماں کو بہت زیادہ عزیز تھی اس لئے بھابی کو اماں کی اطاعت میں اسے قبول کرنا پڑا۔ ورنہ وہ تو کافی وقت اماں سے اس بات پر ناراض رہیں کہ آپ نے ابدی پر زور کیوں نہیں ڈالا اسے مجبور کیوں نہیں کیا کہ وہ ماہم سے شادی کرے۔ میری بہن کتنی آس لگائے بیٹھی تھی اور پھر ماہم اور ابدال میں انڈر شیڈنگ بھی بہت تھی ابدال نے اسے سبز باغ کیوں دکھائے۔

سبز باغ دکھانا دیے تو ایک استعارہ ہے لیکن اس کا استعمال ہم جیسے اور جہاں چاہے کر لیتے ہیں۔ جب گھروں میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہ ہو ماحول کھلا ڈھلا ہو شادی بیاہ میں ملی جلی بیٹھکیں لگتی ہوں تو ادھر ادھر بات چیت تو ہوتی رہتی ہے۔ اب اس بات چیت کو اپنے رنگ کے جس سانچے میں مرضی ڈھال لیں اس طرح تو بے شمار رشتہ دارائیں کہہ سکتی ہیں کہ فلاں کی فلاں سے بڑی انڈر

میں آپ کو بتا رہا تھا کہ مونا نے اپنی خوش اخلاقی اور خوش کلامی کی وجہ سے خاندان میں ایک منفرد حیثیت حاصل کر لی اور یہاں سے ایک ایسی دشمنی کی گرہ لگی جس نے ہمارا خرمن حیات جلا ڈالا میں سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ سب کیوں اور کس کے ایما پر ہو رہا ہے۔

دراصل میری بڑی بھابی جو دراصل مجھے ماؤں کی طرح عزیز تھیں میری شادی اپنی بھانجی سے کروانا چاہتی تھیں۔ ان کی بھانجی ماہم انہیں بہت عزیز تھی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی اور یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ سب اچھا تھا لیکن مجھے مونا پسند آگئی اس طرح کہ وہ اکثر بنگ میں اپنے والد کے کام سے آتی تھی۔ بہت مہذب اور بااخلاق بھی۔ ایک دو بار وہ اپنے والد کو بھی لائی جو وہیل چیئر پر ہوتے تھے۔ بارڈر پر کسی حادثے میں انکی بیک یون کا کوئی ایسا مسئلہ ہوا کہ وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے اس لئے کوئی بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے مونا اپنے والد کے کام کرتی تھی اور یونیورسٹی کی طالبہ بھی تھی۔ اب آپ دیکھیں تاشق و محبت تو بندے کا بنیادی حق ہے اور پھر اس کے لئے کوئی مشقت بھی نہیں کرنا پڑتی۔ کوئی بھی دل میں گھر بنا لیتا ہے اور ہم بھی ماہم اللہ خوبصورت کورے چٹے پڑھے لکھے جوان تھے تو اماں کو متا لیا اور اڑ گئے۔ بھابی کی مخالفت کے باوجود بھی۔ بھابی چونکہ اماں کے چچا کی بیٹی تھیں تو اماں ان کی مانق بھی تھیں لیکن ادھر ان کا لاڈ لہ بیٹا تھا۔ پھر بڑے بھیمانے کہہ دیا کہ ابدال کی خواہش کا احترام کیا جائے اور یوں مونا کے گھر کے دو چار پکروں کے بعد سوال ڈال دیا گیا اور پھر مثبت

ہے۔ عادات چونکہ بہت خوبصورت اور مکمل مل جانے والی تھیں اس لئے بہت جلد سارے خاندان میں مشہور ہو گیا ابدال تو 'ہیرا پیاہ کر لایا ہے۔ کچھ وہ خوبصورت بھی بہت تھی اور پھر کہتے ہیں تا کہ ہر بندے کا کردار اس کے گلے کا ہار ہوتا ہے چہرہ اس کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سواس کی نفس عادات کی جھلک بھی اس کے چہرے کا سنگھار تھی۔

اب بھابی نے دوسرا اختیار استعمال کیا 'اماں جانی کے کان بھرنے کا نیا اعزاز اپنالیا۔ "کیر ضرورت تھی اب ایم اے میں داخلہ لینے کی آرام سے گھر بیٹھتی گھر داری کرتی اماں جی آپ کی خدمت کرتی۔"

کبھی کہیں "آپ بھی تو بہت ظرف دکھاتی ہیں نا پھوپھو! اس حسین و جمیل جھمک چھلو کوڑکوں میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا" نہ میاں کو خبر وہ کیا کرتی پھرتی ہے نہ ہی آپ کو کسی بات کا علم ہے۔"

اماں جانی اکثر اس اعزاز گفتگو پر زچ ہوتیں اور کہہ بھی دیتی تھیں "نفیس! بلاوجہ باتیں نہ بنایا کرو وہ بڑی با کردار اور سلیمی ہوئی بچی ہے۔"

"آپ یوں ہی کہتی رہیں پھوپھو جی! جب وہ کوئی چاند چڑھنے والے گی تا پھر کف افسوس ملتی رہنا۔" کبھی کبھار تو ایسی گفتگو میں نے سنی بھی اور اماں جانی سے اس بات کی صفائی چاہی تو وہ مسکرا دیتیں۔ "تجے تو علم ہے ابدی عورت کسی کو اپنے سے برتر نہیں دیکھنا چاہتی۔ اب تیری دلہن کرے ماسٹرز اور بڑی بھابی ایف اے سے آگے نہ پڑے کی تو پھر کچھ نہ کچھ تو مخالفت جنم لے ہی لیتی ہے تو پرواہ نہ کیا کر۔"

ماسٹرز کے کچھ سسٹروں مونا کرکھی تھی ڈیڑھ سال میں اس کا ماسٹرز مکمل ہوا اور پھر اس نے ایک چمکا

سٹینڈنگ تھی نہ جی یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ ماہم بھابی کی بھانجی ہونے کے ناطے اکثر آتی رہتی تھی اور بھابی نے بھی اسے کلمے دل سے اجازت دے رکھی تھی کہ ابدال سے پڑھائی میں مدد لے لیا کرو اب جبکہ مابدولت تعلیم کے میدان میں بہت بلندی پر تھے یہ بات کہیں سے جائز بھی تھی لیکن بھابی کا ہمیں خلوت مہیا کرنا مجھے ہمیشہ ہی گراں گزرا۔ میں چاہتا تھا تھوڑی بہت جو بھی مدد درکار ہے دو چار لوگوں کے درمیان بھی دی جاسکتی ہے لیکن اندرون خانہ کیا کچھڑی پک رہی تھی میں اس سے لاعلم تھا۔

بہر حال جب میری خواہش کا احترام کرتے ہوئے اماں جانی نے مونا کے گھر آنا جانا شروع کیا تو ظاہر ہے بڑی بھابی ہونے کے ناطے وہ ان کو ساتھ لے جاتی تھیں۔ اماں جہاں ان کی تحریف کرتیں دے لفظوں میں بھابی کوئی نہ کوئی مٹی بات کر ہی جاتی تھیں لیکن ایسے اعزاز میں جو بیاز کی طرح کٹی پرتوں میں بند ہوتی اور جن کے متعلق اب میری سوچیں مجھے کوئی نہ کوئی مٹی خیر اعزاز میں چھپائی گئی ان کے اندر کی تھی ضرور دکھاتی ہیں۔ بیٹکروز کے متعلق تو آپ کو علم ہے کہ صبح کے گئے شام کو اور کبھی کبھار رات کو گھر لوٹتے ہیں۔ اس سارے وقت میں مصروفیت کے لئے مونا نے ایم اے کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اماں جانی سے اجازت لے کر میں نے اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلوا دیا۔ گھر میں گاڑی اور ڈرائیور موجود تھا اس لئے کوئی مشکل پیش نہیں آئی چاہے تھی۔

میں نے مونا کے ساتھ رہتے ہوئے اعزازہ لگایا کہ وہ ایک بہت مضبوط کردار کی ٹیک عادات کی مالک لڑکی ہے اور بلاوجہ دل و جسم کی لڑکی بالکل بھی نہیں

اندھا خرچ ہوتا ہے کبھی تو نے مڑ کر پوچھا ہے کہ بی بی! تم دولت کہاں لٹا رہی ہو۔“

بچوں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اخراجات کا بڑھنا ایک بہت ہی نارمل امر تھا اور پھر مونا تو بڑے کھلے دل کی مالک تھی۔ کام والوں کی مدد کرنا اس کا معمول تھا۔ بھائی جان کی قلیل آمدنی کا اسے علم تھا اس لئے ان کے بچوں کے لئے بھی ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتی تھی اور پھر اماں جانی نے کبھی اس پر انگلی بھی نہیں اٹھائی تھی۔ آخر وہ بھی تو سب کچھ دیکھتی رہتی تھیں کبھی ان سے کچھ پوچھا تو ان کا جواب ہمیشہ مثبت انداز میں ہوتا تھا۔

”ابدی! میری جان! نفیسہ کی باتوں پر نہ جاؤ وہ تو بس ایسی ہی ہے اچھی ہوگی تو جان لٹاؤ گے کی نہیں تو کچھ بھی کر سکتی ہے۔ تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو مونا بہت اچھی ہے اس پر شک نہ کرنا۔“

اور میں بھائی کی باتوں کو نظر انداز کرتا رہا لیکن مونا کو بہت اچھا کہنے والی ماں ایک روز چپکے سے اس فانی دنیا کو چھوڑ گئیں۔ ان کی موت ہمارے لئے بہت بڑا سانحہ تھی نہ بیمار ہوئیں نہ خدمت کروائی بلکہ سب کی مدد کرتے کرتے صرف ایک جملہ کہا ”اللہ میرے بچوں کو ہمیشہ راہ ہدایت پر چلائے اور کلمہ پڑھا اور بس۔“

برخس کا کردار واقعی اس کے گلے کا ہار ہے۔ نفیسہ بھابی نے اپنی پھوپھو جان کی موت کو بس اس طرح لیا کہ آخر ہم سب کو جانا ہے وہ ہر ایک سے کہتی تھیں ”لو بھلا اس سے اچھا کیا ہے کہ بندہ چلا پھر تادینا سے چلا جائے۔“

ادھر مونا تھی۔ اپنے بچوں کے ساتھ بھی دادی کی باتیں کرتی رہتی۔ ان کی اچھی اچھی باتیں انہیں

لگایا اور دادی کی گود میں دو گول مٹول بچے ڈال دیئے یہ میرے لئے دنیا کا نایاب ترین تحفہ تھے۔ ارسلہ اور ارسلان۔ ارسلہ تو باجی جان تھیں کیونکہ ارسلان سے دو منٹ بڑی تھیں۔ بہر حال میری مونا نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان دونوں بچوں کی بہترین پرورش کے میدان میں قدم رکھ دیا اور اس کے ساتھ ساتھ اماں جانی کی خدمت گزاری کو بھی اپنا شعار بنالیا اور پھر ہمارا گھر بہت بڑی جنت بن گیا۔ جانے اس کی تربیت میں کون سا میٹرل گندھا ہوا تھا کہ مسکراہٹ اس کے چہرے کی زینت بنی رہتی اور بھابی کی تلخ کلائی بھی اس کے چہرے کی اس رونق کو مٹا نہ سکتی۔

وقت گزرتا رہا ایک ہی محبت کے نیچے بلال بھائی کی فیملی اور میری فیملی ایک ہی دسترخوان سجاتی رہی۔ بھابی کے پھوپھو پرن اور تلخ کلائی کے باوجود مونا نے کبھی شکوہ شکایت نہ کیا۔ علیحدہ گھر میں رہنے کی خواہش ظاہر نہ کی حالانکہ میں اسے علیحدہ گھر میں رکھ سکتا تھا۔ پیک سے لئے والی سہولیات مجھے حاصل تھیں لیکن مونا بھی کہتی تھی کہ اماں جانی کیونکہ اس گھر سے شفٹ نہیں ہوں گی اس لئے مجھے یہیں رہنا ہے۔ وہ میرے لئے ایک بہت مضبوط ڈھال کا کام کرتی ہیں اور یہ حقیقت بھی تھی کہ جہاں بھابی نے کوئی تلخ بات کی اماں جانی نے اسے رو کر دیا اور شاید یہی وجہ تھی کہ بھابی مونا سے حسد کرنے پر صرف زیادہ آگے نہیں بڑھیں بہت مؤثر الفاظ میں برادری میں مونا کے کردار پر کچھ اچھا لٹا شروع کر دیا۔

”ابدی! تو تو غسل کا اندھا ہو چکا ہے سارا دن تیرے بچے روتے ہیں اور لاڈلی بیگم فون کا چوٹکا کان سے لگائے مسکراتی رہتی ہے۔ ابدی! آخر میں تیرے بھیلے کی بات کروں گی تا

زیر زمین جڑیں پکڑنے والا پراپیگنڈا بڑھتا جا رہا تھا۔ کیونکہ ماہم شادی کے پانچ سال بعد طلاق اور ایک بچی لے کر میکے آ چکی تھی۔ بڑبولی ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں بھی دوسروں پر کچھ اچھالنے کی عادت تھی۔ اس کو ان حرکتوں سے باز رکھنے والا اس کا شوہر جب تک آگیا تو اس نے آخری قدم اٹھا لیا اور جانے کیسے دائروں میں رقص کرتی یہ بریکنگ نیوز فضا میں آزادی گئی کہ مونا شادی سے پہلے نعمان یعنی ماہم کے میاں کو بہت پسند کرتی تھی اور اندرون خانہ ان کی بات چیت تھی جس کی وجہ سے ماہم کو طلاق ہوئی ہے۔

اتنے بڑے الزام کو سن کر مونا نے رو رو کر بُرا حال کر لیا اور یہ بات برادری میں چونکہ بہت زیادہ گردش کر رہی تھی اس لئے باہر کے دوست احباب بھی اس دھڑلے میں شامل ہو گئے اور بیٹھنا نا دانستہ طور پر میرا دل بھی بُرا ہونے لگا اور جب میں بھی اس فود میں آ کر پریشان ہوا تو مونا نے رو رو کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ”میں ایسی ہرگز بھی نہیں ہوں مجھے تو ابا جان کی خدمت گزاری کے دوران کبھی اتنی سہلوت ہی نہیں ملی کہ میں ادھر ادھر جھک مارتی۔ پڑھائی ابا جان کی دیکھ بھال اور بہنوں کا خیال رکھنے کے بعد میں چین کی نیند سو جاتی تھی۔ لیکن اب میری نیندیں مجھ پر حرام ہو چکی ہیں نہ جانے نفیسہ بھابی کو مجھ پر کچھ اچھالنے اور بہتان لگانے کا اتنا شوق کیوں ہے کیوں وہ مجھے بُرا د کرنے پر تپتی ہوئی ہیں۔“ اس نے قرآن ہاتھ میں لے کر قسمیں کھائیں اپنی پاکبازی کی اپنی سچائی کی اپنے اچھے کردار کی میں مان بھی جاتا تھا۔ وہ رو رو کر کہتی ”ابداً سارا زمانہ نفیسہ بھابی کے ساتھ

سناتی بچے بھی اب ماشاء اللہ سمجھدار ہو چکے تھے نو سال کی عمر میں اچھے بُرے کی تمیز ہو ہی جاتی ہے۔ اور جب بھابی نے مونا کے رونے کو ڈھکوسلہ بنا دیا اور مونا کو پیچھے کٹنی کے القاب سے نوازا تو وہ بہت روئی۔

”ابداً! اب یہاں رہنے کا مزہ ختم ہو گیا اماں جانی کے بعد اس گھر سے کل جانا ہی بہتر ہے۔ شاید کچھ دُور ہو کر رہے ہوئے ہم ہمیشہ ملتے رہیں۔“ اور میں نے سارے حالات دیکھتے ہوئے علیحدہ گھر کا انتظام کر لیا۔ بھیا نے بہت مخالفت کی۔ ”ہم دو ہی تو بھابی ہیں ایک ساتھ رہ سکتے ہیں اتنی بڑی حویلی میں ہم تو کم بھی ہو جائیں گے ابدی کوئی مسئلہ ہے تو بتا دو نفیسہ نے کچھ کہا ہے تو میں اسے سمجھاؤں گا۔“

”ہم کہیں دُور تو نہیں جا رہے نا بھیا! اور انشاء اللہ ہم ملتے رہیں گے۔ اماں ابا کے بعد اب آپ ہی تو میرے بڑے ہیں۔“ میں نے مصالحت کی راہ اختیار کی۔ اور سوچا چلو چین سکون سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وقت گزرے گا۔

مونا نے بڑی کفایت شعاری سے اس گھر کو چھوڑ دیا۔ حویلی سے کچھ بھی لانے سے اس نے منع کر دیا۔ آخر ہم وہاں جایا کریں گے نا تو اپنے کمروں کو بھی استعمال کریں گے انہیں خالی تو نہیں کر دیتا۔

قدم قدم پر اپنے بہترین اور باشعور کردار کی مہر ثبت کرنے والی مونا کے متعلق بھابی کا شقی رومل میری سمجھ سے باہر تھا۔ برادری میں کہیں کوئی فتنش ہوتا چار لوگوں سے باتیں سننے کو ملتیں ”تم آخر مونا بھابی کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے ہم نے ان کے متعلق جو کچھ سنا ہے الفاظ انہیں ادا نہیں کر سکتے زیب نہیں دیتا کہ ہم کچھ کہیں۔“

لگا لیتا ہے اور اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی ہر وقت معافی مانگتا رہتا ہے۔ میرے گناہوں کی لسٹ اللہ کے پاس ضرور ہوگی لیکن زمانہ گواہ تھا کہ میں نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی تھی سوائے موتا کے۔ میری زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آئی تھی ماں باپ اور رشتہ داروں کا ہمیشہ فرماں بردار اور عزت کرنے والا رہا پھر میرے کندھوں پر پریشانی اور دکھوں کی یہ بیماری صلیب کیوں رکھ دی گئی۔ میرے گلے میں میرے کون سے نمے کردار کا بار ڈال دیا گیا اور آپنی جان اچھے موتا سے نفرت ہوگئی۔ شدید نفرت۔ بھابی کی باتیں سچ معلوم ہوتیں اور میں جوان سے چڑ جاتا تھا ان کے قریب ہو گیا۔ مجھے گلہ دنیا میں صرف وہ ہی میری ہورد و نمکسار ہیں۔ بیٹیں پر کبھی کبھار ماہم بھی آجاتی۔ ”وہ تو شروع سے ایسی ہی تھی بس آپ کی امی نے ہی اپنی آنکھیں بند رکھیں اور آپ تو بے حد معروف رہتے تھے نا۔“ یہ نفرتوں کے زہر کے قطرے بوند بوند کے میرے اندر اڑیلے جانے لگے۔ میں نے پل بھر کو بھی نہ سوچا کہ ماہم سے اتنا ہی پوچھ لوں کہ تم جو اتنی اچھی بنی پھرتی ہو طلاق جیسی لعنت کا طوق گلے میں سجا کے والدین کے گھر کیوں آ گئیں۔ مجھے موتا کے آنسوؤں میں فریب جھلکتا نظر آتا۔ زبان خلق کو خوار خدا سمجھو کے صدق موتا کا کردار مشکوک ہونے لگا۔ شاید مجھ میں اتنا پرستی بڑھتی گئی۔ میں بہت نیک اور پاراسا ہوں کا احساس اُجاگر ہوتا چلا گیا۔ موتا کے سامنے یہ اعتراف کرنا کہ وہ اچھی ہے نامکن ہو گیا۔ اپنی برتری ’فوقیت‘ سرداری کو بچانے کی خاطر اس کی صداقتوں سے منہ پھیرے رکھا اور تاجی و بر بادی کے گڑھے میں گر گیا فریدا میں بھلاوا پگ دامت میلی ہو جائے

ہو جائے پلیز آپ میرے ساتھ رہنا۔ میں کبھی بھی بُری نہیں ہو سکتی۔ یہ سراسر بہتان ہے۔ ماہم کے میاں کو میں نے اس کا دولہا بنے دیکھا تھا۔ ٹھیک ہے وہ میرا کلاس فیلو تھا لیکن آپ اسی سے پوچھ لیں کہ میں نے کبھی اس سے یا کسی اور لڑکے سے کسی قسم کے بھی تعلقات رکھے تھے۔“

اس کی سچائی کی گواہی گھر کے کونے کونے سے مل رہی تھی۔ ڈرائیور ’کک‘ مالی اندر کام کرنے والی ماسی زبیدہ سبکی اس کے اچھے کردار کے گواہ تھے لیکن بقول بھابی وہ تو زرخیز غلام تھے جن کی جاو بے جا فرمائشیں موتا پوری کرتی رہتی گرا۔ وہ بھلا کیوں اس تکلف بولتے۔ کبھی کبھی اماں جانی کی آواز کانوں میں گونجتی ”ابدی! موتا پر کبھی شک نہ کرنا وہ بہت باکردار اور اچھی بیٹی ہے۔“

لیکن یہاں یہ آواز آتی ”بیٹی اور بیوی میں بہت فرق ہوتا ہے بعض بلکہ اکثر اچھی بیٹیاں ماؤں کو دھوکہ دے کر دوستیاں بھی لگا لیتی ہیں اتنا بھی اعتماد اچھی بات نہیں ہے۔“

اعتماد پر ہی تو گھروں کی عمارت قائم کی جاتی ہے۔ بیوی کوئی اٹنی بات کرے تو میاں صاحب سیدھا جواب دیتے ہیں۔ کیا جنہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ اور اسی اعتماد کی بنیاد پر اچھے گھرانوں میں محبت ایثار اور قربانی کے احساسات پلتے رہتے ہیں۔ کیا ہمارے اپنے گھر میں والدین اور بچوں کے درمیان اعتماد نہیں تھا ہم سب کا بھی اتنی بڑی برادری میں ہر قسم کے کزنز کا ساتھ ہوتا تھا۔

میری حالت جیل کے اس قیدی کی ہوتی جا رہی تھی جس کو عدالت سے چھائی کی سزا ہو چکی ہو۔ وہ یا تو بالکل خالی الذہن ہو جاتا ہے اور یا پھر اللہ سے لو

نہیں گزری ہوگی۔ ایک پاکیزگی کا نقاب تھا جو تم نے اوڑھ رکھا تھا۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں مونا! تم نے میرے لئے زندقہ کو جہنم بنا دیا ہے۔ میں تمہیں.....“ چستر اس کے کہ میں طلاق کا لفظ زبان سے نکالنا اس نے بڑھ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”نفیسہ بھائی کی لگائی ہوئی آگ میں اس گھر کو جلتے سے بچا لو ابدال! تمہیں اللہ کا واسطہ۔ اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لو کہ یہ بچے بھی تباہ ہو جائیں گے۔“

دونوں بچے رو رہے تھے مونا رو رہی تھی لیکن میری نگاہوں میں کچھ دیر پہلے بھائی نے جو ویڈیو دکھائی تھی وہ محسوس رہی تھی جس میں ماہم کے میاں نعمان کو مونا مہندی لگا رہی تھی اور ہنس رہی تھی۔ میں نے ہل بھر کو بھی نہ سوچا کہ ایسے موقعوں پر تو ساری کڑواہٹیں لگتی ہیں۔ بھائی کا تیرنشانے پر بیٹھ چکا تھا اور انہوں نے ہو کے رہی۔ ”مگر مجھ کے آنسو نہ بہاؤ میرے سامنے بڑھ کر دار عورت۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں۔“

وہ دھڑام سے گری بچوں کی چیخیں بلند ہوئیں لیکن میں نفرتوں کی بلند و بالا چٹان پر اپنے جلتے وجود کو ٹکھیتا اپنے بیزروم میں چلا گیا۔ میں بھی دھڑام سے گرا لیکن اپنے نرم و گداز بستر پر۔ کئی گھنٹے گزر گئے میں نے سڑ کے نہیں دیکھا کہ وہ کہاں ہے اور میرے بچے کہاں ہیں۔ اپنے خیال میں میں نے اپنے دکھوں کی صلیب کو اپنے کندھوں سے جھک دیا تھا آزاد ہو گیا تھا۔

لیکن نہیں۔ دکھوں کی عبرت ناک داستان تو اب شروع ہو رہی تھی۔ اتنا پرسکون مچھتوں سے بھرا بچوں کی صداؤں سے مہلکا گھر سائیں سائیں کر رہا

اور میں نے اپنی دانست میں اپنی پگ کو میلا ہوتا سے بچانے کے لئے مرد کا آخری ہتھیار اٹھا لیا۔ میں گھر میں داخل ہوا تو مونا بچوں کو ہوم ورک کر داری تھی۔ میں بڑی خاموشی سے جیسے کوئی جاسوس ہوتا ہے اس کی بچوں کے ساتھ بات چیت سن رہا تھا۔

”بیٹا! میری جان! آپ کا دھیان کہاں ہے آپ کیوں مجھے زنج کر رہے ہیں کام کیوں نہیں کر رہے۔“

”ماما! کچھ لوگ کہتے ہیں آپ بہت بُری ہیں لیکن آپ تو بہت اچھی ہیں ماما! میرا جی چاہتا ہے آپ کو لے کر کہیں دور چلا جاؤں۔ آپ نہ رو دیا کریں ماما!“ یہ نو سالہ ارسلان تھا۔

”وہ جو ماہم چھو پھو ہیں نا! وہ بہت گندی ہیں گندی باتیں کرتی ہیں آپ نے تو کبھی کوئی گندی بات نہیں کی۔“ یہ ارسلان تھی جس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی شامل تھی۔ ”بابا ایسے کیوں ہیں ماما! ہر وقت لڑتے ہیں۔“

اور میں کمرے میں داخل ہوا بہت غصے میں۔ ”اب تم نے بچوں کو بھی الٹی راہ پر چلا دیا ہے مونا! تم ساری حدیں کراس کر رہی ہو۔ میں نے تمہیں زندقہ کا ہریش دیا ہر سہولت دی اور تم۔“

”زک جائیں! ابدال! لوگوں کی باتوں میں آکر غصے کی آخری حد پر نہ جائیں۔ میں نے بھی اس گھر اس گلشن کی آبیاری میں اپنا سارا خلوص ساری محنتیں پوتی ہیں۔ میری زندقہ کا ہر لمحہ آپ کے سامنے ہے۔ میری پاکیزگی کی گواہی آپ کے گھر کا کوا کونادے رہا ہے۔“

”پاکیزگی! ہونہ! تم تو اس کے قریب سے بھی

چکی تھی میں کرسی پر گر سا گیا۔ میں نے اپنا سر تھام لیا
اُف خدایا! میں نے یہ کیا کر دیا لیکن اب بچھتا
سے کیا فائدہ۔

”سر! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا!“
”میرا موبائل لاؤ منصور!“

وہ جلدی سے موبائل لایا! میں نے مونا کا نمبر
ملایا اور ملاتا چلا گیا۔ آخر اس نے فون آن کیا۔ اس
کی سسکیاں اُبھر رہی تھیں۔ ”میں تمہیں لینے آ رہا
ہوں مونا! مجھے معاف کر دو۔“ میری آواز سن کر اس
کے ہاتھ سے موبائل اٹکلنے لگا۔

”تم جانتے ہو اب دل تم نے کیا کیا ہے تم نے نہ
صرف میری بیٹی کو تباہ کیا ہے بلکہ اپنے دو بچوں کے
لئے دنیا کی ہر خوشی جلا کے راکھ کر دی ہے اس راکھ کو
کریڈنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”نہیں اٹکل میں نے غصہ میں کچھ کہا تھا میں
مونا کو لینے آ رہا ہوں مجھے وہ معاف کر دے گی۔“

”اب تم معافی کی حدود سے خارج کر دیے
گئے ہو آئندہ یہاں فون نہ کرنا اپنی بتائی کے تم خود
ذمہ دار ہو اللہ تمہارے لئے بہتر کرے۔“

وہ عظیم ہستی جاتے جاتے بھی مجھے وعادے گئی
اور یہ دعائے خیر ہی میرے وجود کو جلا گئی۔ کہ ان کی
نسکی کی عادت اس بُرے وقت میں بھی ان کے
ساتھ تھی اور میں نادان گمراہ کی ایسی دلدل میں کود
گیا جہاں سے واپسی ممکن ہی نہیں۔

میں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے میں نے علماء
کی طرف بھی رجوع کیا لیکن بے سود۔ میں نے غصہ
درگزر سے کام لیا نہ ہی مونا جیسی صابر و شاکر بیوی
پاکر رب کا شکر ادا کیا۔ نہ میں اس کے معاملے میں
سوچ سمجھ سے چلا۔ نہ ہی میں نے اصل کو پہچان کر

”باس“

ایک شخص نے چائے کا آؤر دینے کے لیے غلطی سے
اپنے پاس کا نمبر ملا دیا۔ اور غصے سے بولا: ”لو چھوٹے،
دو منٹ میں میرے فون میں چائے لیکر آ“
باس آفس کا نمبر دیکھ کر غصے سے: ”تمہیں پتا ہے میں
کون بول رہا ہوں۔“

آدی: نہیں۔
باس: میں تمہارا پاس بول رہا ہوں۔
وہ شخص پہلے گھبرا یا پھر بولا: اوئے تمہیں پتا ہے میں
کون بول رہا ہوں۔
باس: نہیں۔

آدی: شکریہ ہے۔ اور فون بند کر دیا!!

تھا۔ ہر طرف ہوائیں بین کر رہی تھیں تاریکی کا راج
تھا۔ کسی نے روشنی بھی نہیں جلائی تھی میرا غصہ پھر
بڑھ گیا۔

”منصور! آفاق! کہاں مر گئے تم لوگ لائٹ
کیوں آن نہیں کی۔“

میری آواز پر ڈرائیور اور کلک بھاگتے آئے۔
”ساری لائٹیں تو جی مونا بی بی خود آن کرتی
تھیں اور وہ تو روتے ہوئے بچوں کو لے کہیں چلی گئی
ہیں۔ انہوں نے فوجی گاڑی بھی نہیں نکلوای کچھ بتایا
بھی نہیں۔“

میرا خیال ہے کہ گھر کے ملازم گھر کے ہر راز
سے آگاہ ہوتے ہیں اور وہ جان چکے تھے کہ کوئی
حادثہ ہوا ہے۔ ورنہ مونا کا یوں گھر سے جانا
ناممکنات میں سے تھا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ مونا
یوں میری زندگی سے بناتائے لٹل جائے گی۔

”آفاق! چائے کا ایک کپ“ میں اپنا جملہ بھی
پورا نہ کر سکا شاید اس تلخ حقیقت کے اندر جھپی بجلی

اندھا دھند سرکشی کے گھوڑے دوڑاتا دُور نکل جاتا ہے اور پیچھے صرف خاک اور دھول کی آندھی رہ جاتی ہے اور عورت کا دُسا مرد تو پاگل ہو جاتا ہے۔

میں اسے صرف یہ کہہ سکتی تھی کہ اپنے معذور سر پر ان بچوں کی پرداخت کا بوجھ نہ ڈالے۔ وہ ان کی مالی معاونت کر سکتا ہے کرے بہترین سکولوں میں ان کی تعلیم جاری رکھے یہ اس کا فرض ہے۔ وہ انہیں اچھی رہائش دے سکتا ہے یعنی جو بھی بہترین کر سکتا ہے ان کے حق میں کرے اور ان کی بہترین تربیت ان کی ماں کے سپرد کر دے۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھے اور اس کے بتائے راستوں میں چل کر کوشش کرے کہ زندگی بھر ان بچوں کی کفالت کو اپنی ذمہ داری سمجھے۔

”باجی جان!“ اس کی آواز اُبھری۔ وہ رو رہا تھا ”پچھتاوے کی یہ آگ عذاب بن کر مجھ پر مسلط ہو چکی ہے۔ بھائی نصیب نے ایسی آگ لگائی کہ میں اس چنگل میں پھنس کر تباہ و برباد ہو گیا۔ آپ کی نصیحتیں اپنے پلو سے باندھ کے رکھوں گا مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت رہے گی لیکن وہ جو کام ہم دونوں نے مل کر کرنے تھے وہ تھا کر رہی ہے اللہ اس کو ہمت دے اور ثابت قدم رکھے۔“

اور میں پچھتاوے کے اس پہل صراط پر چلنے والے ابدال جیسے لوگوں کو نصیحت کرتی ہوں کہ اتنا کی بلند سیرجی پر قدم رکھتے ہوئے سوچ ضرور لیں کہ بادشاہی اللہ رب العزت کی ہے اور کوئی بھی انتہائی اقدام جاہی و بربادی کا نام ہے کیونکہ

اب بچھائے کیا ہوت
جب چڑیاں چک گئیں کھیت

.....

حقیقت کو جاننے کی کوشش کی نہ ہی میں یہ سمجھ سکا کہ بھابی کے ساتھ ماہم بھی مل کر موتا پر بہتان تراشی کر رہی ہے اور تباہ و برباد ہو گیا۔

مولانا نے فرمایا ”اگرچہ بہتان باندھنے والا اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہوں میں بری الذمہ قرار دے لیتا ہے اور بے قصور بن جاتا ہے لیکن عظیم و خیر اللہ کی نظر سے بچ نہیں سکتا۔ دنیا میں سزا پاتا ہے۔ اور بھابی کے ساتھ اس وقت بہت برا ہوا جب پاؤں پھسلا اور کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بہت بڑا آپریشن ہوا اور بستر ان کی منزل بن گیا۔ ماہم کو تو لوٹ کر جانا ہی تھا خود ان کے تین بیٹے اور ان کی بیویاں انہیں چھوڑ چھاڑ کر اپنی دنیا میں مست ہو گئے اور کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں تھا سوائے ان کی ملازمہ کے اور مجھے موتا یاد آ رہی تھی۔ اسی جان کو بخار ہو جاتا تو وہ ان کے ہر کام کو اپنی ذمہ داری سمجھتی اور دل و جان سے خدمت کرتی اور بھابی کی ہائے واویلا اس گھر کی چار دیواری میں گونجتی رہتی۔“

باجی جان! شیطانی بہکادے سے میں جس گناہ کا مرتکب ہوا وہ تو یقیناً مستوجب سزا ہے لیکن مجھے بتائیں میری توبہ، میری گریہ زاری، میری طلب، معافی، عذرت، درگزر کی انتہا بخشش کی طلب کے عوض کیا میرا یہ گناہ معاف ہو سکتا ہے۔ کیا مجھے موتا واپس مل سکتی ہے۔“

وہ رو رہا تھا۔ اس کی سسکیاں اس کی عذرت کی گواہی دے رہی تھیں لیکن میں اسے کیا کہتی ”اللہ رب العزت غفور الرحیم ہے معاف کرنے والا ہے لیکن اس راہ پر چلنے والے کی واپسی کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ مرد عقل و خرد میں عورت سے بلند ہوتے ہوئے بھی ماورائے عقل ہو کر



URDU TUBE

URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdu-tube.com

الغوراء منصوبہ



جاوید راضی

ہمارے حوصلے اتنے بڑھ چکے تھے کہ پولیس کو ہر بار پکھڑے کر ہم نکل جاتے تھے۔ جوں جوں بڑی بڑی رئیس ہاتھ لگنے لگی تھیں ہماری بد قاشیاں عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ شراب اور شایب ہم چاروں کی کمزوری بن چکی تھی۔ جب تک لوٹی ہوئی رقم کی پالی پائی خرچ نہ ہو جاتی تھی ہم اٹھتے نہیں تھے۔

جرم کی راہ پر چلنے والوں کی کہانی 'جنن' کے پاس واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا

کہ گورا قبرستان میں کچھ مٹھکوں لوگوں کی سرگرمیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ چنانچہ پولیس نے اپنا ایک خاص خبر اس قبرستان کی نگرانی پر لگا دیا جو ایسے مقام پر گھات لگا کر بیٹھ گیا کہ قبرستان میں آنے جانے والا ہر کوئی اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ کافی عرصہ ریزی کے بعد مجھ نے دو تین ایسے

ایس پی صدر عبداللہ احمد صاحب نے گزشتہ کئی ماہ سے ضلع ساؤتھ میں بڑھتی ڈیمٹی اسٹریٹ کرائم اور قتل و غارت کے واقعات کی روک تھام کے لیے ایس ایچ او عدیل رضا کو خصوصی ٹاسک دیا جس پر مذکورہ تھانہ صدر پولیس حرکت میں آ گئی۔ دن رات کی نگرانی اور خاص ریکی کے نتیجہ میں پولیس کو خبر ملی

نام بھی بتائے۔ اُن گت ڈکیتوں، چوریوں کے علاوہ ایسے قتل بھی گنوائے جو پولیس کے لیے در دوسرے بنے ہوئے تھے۔ تفتیش میں روہان عرف بمبئی نے کئی قتلوں کی حدود میں راہزنی، چوری، موہاں اور زہرات چینی کے علاوہ زیادتی کی وارداتیں گنوائیں۔ جن قتلوں کے علاقوں میں اس نے اپنی دہشت گردی کا بازار گرم کر رکھا تھا ان میں تھانہ پرڈی، صدر، ڈیفنس، کلفٹن، گزری، بریگیڈ، فیروز آباد، سوہج بازار، گلستان جوہر، شاہراہ فیصل، ٹیپو سلطان، رضویہ، لیاقت آباد اور گھبار کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ شخص کون ہے اور اس نے اسٹریٹ کرائم میں اپنا سہ کیسے بٹھایا۔ ایک مختصر ملاقات میں اس نے ہمیں تفصیل بتائی جو نئے قارئین ہے:-

”دیکھیں صاحب! میں نے اُن گت وارداتیں کی ہیں۔ میں ٹارگٹ کلر، قاتل بنا۔ جب ہوش سنبھالی تو گھر سے لاپرواہ ہو گیا۔ کب تک والدین باز پڑھی کرتے وہ تھک گئے اور مجھے گھر سے چٹا کیا۔ سانول چڑیا میرا کافی پرانا دوست تھا اور تو کوئی نظر میں نہ آیا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ سانول بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا اور مجھے اپنے ہاں رہنے کی جگہ دے دی۔ ہم دونوں محنت مزدوری کر کے اپنے آپ کو پال رہے تھے کہ ہماری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس کے گھر ہم دونوں مستری کے ساتھ بطور مزدور کام کرنے گئے تھے۔

سب سے آسان کام راج گیری میں تھا، روز کے روز نقد مزدوری، میں اور سانول محنت سے کام نکالتے تھے۔ ہمیں اس کے گھر کام کرتے تیسرا دن تھا، دوپہر کو وہ کھانا بھی دیتا تھا۔ شام جب ہم فارغ ہو کر اپنی مزدوری وصول کر کے گھر جانے لگے تو اس نے روک لیا کہ کوئی بات کرنی ہے۔ میں نے سانول کی جانب اور اس نے میری طرف سے

افراد کی اطلاع دی جو دو تین دن سے قبرستان کے مختلف حصوں میں گھوم پھر رہے تھے۔ چنانچہ پولیس پارٹی اگلی گرفتاری کے لیے پہنچ گئی۔ طرمان جو گورا قبرستان میں واردات کے لیے موجود تھے جب ان کی نگاہ قبرستان میں داخل ہونے والی پولیس پارٹی پر پڑی تو اپنی گرفتاری سے بچنے کیلئے انھوں نے مزاحمت کرتے ہوئے پولیس پر اے آئی فائرنگ شروع کر دی۔ پولیس مقابلہ میں ایک انتہائی خطرناک اسٹریٹ کریمین روہان عرف بمبئی ولد مبارک علی جوانی فائرنگ سے شدید زخمی ہو گیا جسے پولیس پارٹی نے دبوچ لیا اور اس کے دوسرے ساتھی فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

گرفتاری کے بعد روہان عرف بمبئی کو پولیس کی سخت نگرانی میں ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ قتل ڈیوٹی اور دیگر کئی وارداتوں کا مجرم روہان عرف بمبئی قریب 1000 مقدمات میں مطلوب تھا اور اس کو مفروضہ قرار دیا جا چکا تھا۔

روہان بمبئی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک اہل تشیع شخص جہانگیر حسین ولد سید حسن رضا کو گولیاں مار کر بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔

مقدمہ بالا میں طرم کا ایک ساتھی سانول عرف چڑیا ولد رانا محمد اسحاق کو سال 2015ء میں CTD نے گرفتار کیا تھا۔ سانول عرف چڑیا کو معزز عدالت نے مقدمہ بالا میں سزائے موت کا حکم سنایا تھا جبکہ طرم روہان عرف بمبئی روپوش ہو گیا تھا۔

کراچی کی پولیس مسلسل اس کی تلاش میں تھی، طرم روہان عرف بمبئی نے ہسپتال میں ایک ملاقات میں بتایا کہ وہ ایک بڑی سیاسی جماعت کے لیے عرصہ دراز سے کام کرتا آ رہا تھا۔ ابتدائی تفتیش میں گرفتار طرم روہان عرف بمبئی نے اپنے ساتھیوں کے

”ٹھیک ہے کل سے تیار ہو کر تم دونوں یہاں آ جانا میں تمہیں پارٹی کے دفتر لے کر چلوں گا۔ وہاں اور بھی لوگ ہوں گے۔“

دوسرے دن ہم تیار ہو کر شا کر صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ سسٹری ہمیں دیکھ کر برا سامنہ بنا کر رہ گیا کیونکہ اسے دوبارہ جا کر نیا چالی اڑے سے دو دنے مزدور لانے پڑے تھے۔

”آگے تم!“ جی صاحب نے باہر آتے ہمیں دیکھ کر کہا۔
”جی صاحب۔“

جی صاحب اپنے ملازم کو ضروری کام سمجھاتے ہوئے، گاڑی اشارت کی اور ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں کچھ سیٹ پر بیٹھ گئے اور وہ آگے چل پڑے۔ جس علاقہ میں ہم آ کر رُکے تھے وہ حکومتی محفلین کا گڑھ کہلاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ہم دونوں سے کیا کام لیا جائے گا۔

پارٹی آفس ایک بڑی اور پرانی طرز کی کوشی میں بنایا گیا تھا۔ کافی بڑا لان تھا اور بے ترتیب گریسیاں یہ پتہ دے رہی تھیں کہ ہر وقت استعمال میں رہتی ہیں۔ بڑے سارے پورچ میں آگے پیچھے دو نئے ماڈل کے جدید ڈالے کھڑے تھے۔ کوشی کے باہر دونوں جانب کئی اور گاڑیاں پارک تھیں۔ جی صاحب اپنی گاڑی بھی سڑک پر کھڑی کر کے ہمیں ساتھ لیے کوشی کے اندر داخل ہو گئے۔ باہر پڑی کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے جی صاحب نے ہمیں بیٹھنے کا کہا اور خود کوشی کے صدر دروازے کے اندر داخل ہو گئے۔

زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا، وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم اُٹھ کر ان کے قریب آئے اور پیچھے چل پڑے۔ اندر کئی لوگ ادھر ادھر بیٹھے نظر آئے۔ کوشی کے اندر کئی

پریشانی سے دیکھا کہ کہیں ہم سے کوئی بھول تو نہیں ہوئی۔ گھر کے مالک کا نام شا کر صاحب تھا مگر وہ جی صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ ہم دونوں گھر کے برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے اس کے باہر آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ٹرے میں چائے کے تین کپ اور پلیٹ میں بسکٹ رکھے چلے ہو ہمارے قریب آ بیٹھا۔ ٹرے اس نے میز پر رکھ کر ہمیں چائے پینے کا اشارہ کیا۔

نام وہ ہمارے پہلے سے جانتا تھا کیونکہ اس نے کام کرنے والوں کے نام کاپی میں حاضری کے لیے چننا رکھے تھے۔

”بھئی اتم لوگوں کے کام کرنے کا انداز سسٹریوں کے ساتھ کام کرنے والوں جیسا نہیں؟“
سانول مجھ سے پہلے بول اُٹھا۔ ”جی بس کہیں اور کام ملا نہیں تو سوچا محنت مزدوری ہی کر دیکھیں۔“
جی صاحب نے اپنا کپ واپس رکھ کر مجھے مخاطب کیا۔ ”بھئی تم دونوں میرے ساتھ کام کرو گے؟“

”جی کیا کام ہوگا؟“
”بس صاف سترے رہنا اور میرے ساتھ جہاں میں جاؤں چلنا ہو گا۔ دونوں کو دس دس ہزار ماہانہ اور دو دو سو روپے خرچہ روزانہ کا اور ناشتہ کھانا، چائے کی کوئی گھر نہیں چاہے دن میں دس دفعہ پیو۔“
میرے بولنے سے پہلے سب سابق سانول چرچا کر میں کود پڑا۔

”جی منظور ہے۔“ چرچا اس کو اسی لیے کہتے تھے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے ہانک دیتا تھا۔
”ہاں بھئی تم کیا کہتے ہو؟“

”صاحب ٹھیک ہے جو اس نے بول دیا۔“ میں نے بھی سانول کی طرف دیکھتے جی صاحب کو ہاں کر دی۔

جاتا تھا کیونکہ ہم صحت میں اور ذلیل ڈول میں اپنے تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ہم دونوں آپے سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ اسلحہ کے استعمال اور نمائش کی بدولت ہمارے دل بڑے ہو چکے تھے۔ ضروریات کی آسانی اور روپے پیسے کی ریل پیل نے ہمارے دماغ خراب کر دیئے تھے۔ لڑائی مار کٹائی میں ہم اس قدر مشہور ہو چکے تھے کہ جی صاحب اور بڑا سائیل ہم دونوں پر بڑا ہی بھروسہ کرنے لگے تھے۔ اب تو دکالوں، مکانوں کے قبضہ جات بھی ہمارے بغیر ممکن نہیں تھے۔

ایک اندر کا گروپ کھلاتا اور دوسرا باہر کا، ابھی تک ہم دونوں باہر والے گروپ میں تھے۔ اندر والا گروپ بقول جی صاحب کے بہت اہم تھا۔ یہ لوگ سیاسی جوتوڑوں کے علاوہ دیگر انتہائی حساس کام یعنی کسی کو مارنا، اغوا، امدادیں تاوان جیسے بڑے بڑے کام سرانجام دیتے تھے۔ حکومتی ہاؤس میں اس پارٹی کا خاص اثر تھا۔ پولیس کچری تک ان کی ذاتی رسائی تھی۔ جیسے جیسے ہمارے ہاتھ میں پیسے کی ریل پیل ہو رہی تھی اسی تناسب سے ہم جرائم کی رفتار تیز کر رہے تھے۔ پارٹی کے اندر رہتے ہمارے ذہن سے قانون کی بلا دہشتی ختم ہو چکی تھی اور ہم دن دہاڑے ڈکیتیاں کرتے، مار پیٹتے اور قانون شکنی ہم نے دھیرہ دھیرہ کیا رکھا تھا۔

ایک روز بڑے سائیل نے مجھے خود فون کر کے بلایا۔ یہ بات میرے لیے انتہائی خوشی کی تھی کیونکہ پہلے ہر کام جی صاحب کی وساطت سے کیے جاتے تھے مگر آج پہلی بار انہوں نے براہ راست میرے موبائل پر کال کر کے مجھے بلایا تھا۔ میں نے سائل کو تیار ہونے کا کہا جو ابھی تک سوپا ہوا تھا۔ ہم دونوں تیار ہو کر بڑے سائیل کے پاس پہنچ گئے۔ ”بھئی تمہارا ساجھی کتنا بااِعتدال ہے۔“

کمرے ایک ساتھ بچوے ہوئے تھے۔ جس دروازے پر انہوں نے ہلکی سی دستک دی تھی وہ دروازہ ایک خوبصورت خاتون نے کھولا۔ جی صاحب پر نظر پڑے ہی وہ ایک طرف ہٹ گئی اور وہ ہمیں لے کر اندر آ گئے۔ سامنے بیڈ پر ایک بڑا وقار نوجوان دراز تھا۔ ہمارے سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس نے ہمیں غور سے دیکھا اور پولا ”دیکھنے میں تو دونوں ہی ہوشیار لگ رہے ہیں۔ باقی ختم نل کرلو۔“

”سر، آپ کا فون۔“ اس خاتون نے موبائل اس کی جانب کرتے ہوئے کہا۔ اس نے موبائل پکڑ کر سر کے اشارے سے ہمیں باہر جانے کا کہا، ہمارے ساتھ وہ خاتون بھی کمرے سے باہر نکل آئی۔

”آؤ میرے پیچھے۔“ جی صاحب ہمیں لے کر اوپر جانے والے زینے کی طرف آ گئے۔ اوپر ایک بڑا سا ہال تھا جہاں لمبی ساری میز کے دونوں جانب کرسیاں ترتیب سے لگی ہوئیں تھیں اور کئی لوگ بیٹھے چائے اور مشروب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

جی صاحب ہمیں لے کر ایک طرف آ بیٹھے، ہمارے بیٹھے ہی باوردی بیواہاری سامنے چائے اور دیگر لوازمات رکھ گیا۔ جی صاحب ہم دونوں کو پارٹی ڈسپلن کے بارے میں بتاتے لگ گئے۔

اب یہ معمول ہو گیا۔ ہم دونوں صبح آ کر پارٹی آفس میں بیٹھ جاتے اور مختلف مقامات پر کسی ٹاکسی کے ساتھ آتے جاتے رہتے۔ پھر یہ ہوا کہ ہم جہاں اور جس کے پاس بھی جا کر ٹرکے وہ بغیر کسی تکرار کے خود بخود پیسے نکال کر ہاتھ پر رکھ دیتا۔ میں اور سائل یہ سب دیکھتے۔ ہمیں اپنی ڈیوٹی کا چہرہ چل گیا کہ ہم دونوں کو دہشت کی علامت بنا کر ساتھ لایا

کے لیے۔“

میں نے بڑے سائیں سے روپے پکڑ کر اپنی جیب میں ڈالے اور ان کو سلام کر کے ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

سانول اٹھ کر میرے قریب آ گیا اور بے صبری سے بولا۔ ”خیر تھی؟“

”ہاں بتاتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے مہتر سائیکل سنبھالی اور سانول کو بٹھا کر کوٹھی سے باہر سڑک پر آ گیا۔

ایک ریسٹورنٹ میں ٹک کر میں نے چائے وغیرہ کا آرڈر دیا اور ساری بات سانول کو بیان کر دی۔ چند لمبے کی خاموشی کے بعد اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔

”بھئی، یاد اگر تم نے اتنے بڑے کام کی حامی بھر لی ہے تو میرا مشورہ مانو اور ان دونوں کو ساتھ شامل نہ کرو۔ ہم اس کام کو بڑی آسانی سے کر لیں گے؟“ چائے پینے تک میں نے ہر زاویے سے سانول کے مشورے پر غور کیا اور آخر کار کسی نتیجے پر پہنچ کر اس کی بات کو تسلیم کر لیا۔

دوسرے روز دوپہر کو میرے فون پر ایک کال موصول ہوئی، نمبر نامعلوم تھا۔ دوسری جانب سے کسی نے میرا نام لے کر اپنا تعارف یوں کر لیا کہ ”بڑے سائیں جی نے تمہارا نمبر دیا تھا مجھے، ایک کھتے بعد ایچ پی سی مارکیٹ کے باہر فٹ ہاتھ پر بنے نلام گھر کے قریب ملو۔ میں نے تمہیں دیکھا ہوا ہے اس لیے میں خود ہی تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی۔

میں نے سانول کو موٹر سائیکل ٹکانے کا کہا اور تیار ہو کر باہر سڑک پر آ گیا۔ ادھر ادھر گھومتے پھرتے جب چالیس منٹ گزر گئے تو میں نے آرام باغ والا موڈ کر اس کر کے موٹر سائیکل کو سڑک سے

میں نے بے خبری میں بول دیا۔

”سائیں ہم چار لوگ ہیں اور مل کر سب کام بڑی دلیری سے سرانجام دیتے ہیں۔ آپ کو ہم مانوس نہیں کریں گے۔“

”سانول کو دیکھا ہے مگر دوسرے دو کو تم نے کبھی ملوایا نہیں؟“

”جی دراصل وہ ہمارے ساتھ ایک ڈکیتی کے دوران پولیس نے قاپو کر لیے تھے حالانکہ وہ جھڑا لو تھے، ڈکیت نہیں۔ ہمارے پیچھے تو کوئی تھا نہیں مگر ان کی پیٹھ پر کسی کا ہاتھ تھا۔ ہم تو یہ نہیں جانتے کہ وہ کون تھا مگر ان کے ساتھ ہمیں میں بھی فارغ کر دیا گیا۔ اسی دن سے ہم ان دونوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے اور مکالموں، دکانوں کے قبضے اور خالی کروانے میں ساتھ ہوتے ہیں۔ آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا کئی ڈکیتیاں بھی کی ہیں ہم نے۔“

”ٹھیک ہے اگر تمہیں ان پر پورا بھروسہ ہے تو ایک بندے کو اٹھا کر پہلے کسی ایسی جگہ لے جانا ہے جہاں تم سارے محفوظ رہو۔ جب اسے اپنے قبضہ میں کر لو تو مجھے فون پر رابطہ کرنا۔“

”جی بہتر مگر وہ بندہ کہاں سے اٹھاتا ہے ہم نے؟“

”یہ تمہیں کل پتہ چل جائے گا۔ ایک لڑکا تمہیں فون کر کے اپنے ساتھ لے جائے گا تم اس کا ٹھکانہ اور اسے دیکھ لینا پھر اسے کیسے وہاں سے یا جہاں تم مناسب سمجھو اٹھا کر کہیں گم کرنا ہوگا، یہ تمہارا کام ہے۔ جب یہ کام کر لو تو مجھے اپنا سارا اند پتہ بتا دینا باقی کام میرا ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے اس کے کھانے پینے کا بندوبست تم لوگوں کو کرنا ہوگا۔“ بڑے سائیں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس ہزار روپے نکال کر میرے ہاتھوں میں دیے اور پھر کہا ”یہ کھانا اپنے کھانے پینے اور پٹرول وغیرہ

میں نے اسے غور سے دیکھا لیا تھا۔ دکان میں دو ملازم تھے اور تیسرا وہ خود۔ پچاس سے اوپر کا شریف آدمی لگ رہا تھا۔ میں نے ہر طرح سے اسے اپنے ذہن میں فٹ کرتے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ سائلوں نے مجھے مخاطب کیا۔

”یار بھئی ہم اس کو کیسے قابو کریں گے؟“

”یار ایک روز اس کی عمرانی کرتے ہیں اس کے آنے جانے کا راستہ، اس کے گھر وغیرہ پھر میں کوئی نتیجہ نکالوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“

وہ سارا دن ہم نے آس پاس کی دکانوں کا جائزہ لیتے گزرا دیا۔ شام کو اس نے دکان بند کی اور اپنی موٹر سائیکل لے کر اس مارکیٹ کے پھرونی راستے پر چلا باہر سڑک کی جانب گھوم گیا۔ تھوڑے فاصلے پر ہم اس کے پیچھے چل رہے تھے۔

مختلف راستوں پر چلا وہ آگرہ کالونی میں آ گیا۔ ایک اسٹور پر ٹوک کر اس نے اپنی موٹر سائیکل باہر کھڑی کی اور اندر چلا گیا۔ ہم ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ایک شاہجہاں بیک تھا جسے باہر آیا اور دوبارہ چل پڑا۔ جس گھر کے آگے آ کر وہ رُک گیا تھا اس سے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ وہ کھانا پیتا سرابہ دار ہے کیونکہ جب اس کے گھر کا گیٹ کھلا تو سامنے کیراج میں نیو ماڈل پراڈو کھڑی تھی۔

اچھی طرح سارا عمل وقوع اپنے ذہن میں یاد کرتے ہوئے میں نے موٹر سائیکل واپسی کے لیے موڑ لی۔ اپنے اڈے پر آ کر میں نے اسے انخوا کرنے کے لیے پلاننگ شروع کر دی۔ یہ میرا پہلا ایسا کیس تھا حالانکہ قبل ازیں کئی ڈکیتیاں، لڑائی جھگڑے، بہت خوری جیسے اقدام کیے تھے مگر انخوا کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مجھے تو گاڑی چلانی بھی نہیں آتی تھی مگر سائلوں بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ اس کام سے

دوسری جانب گھما لیا۔ بمبینو سینما والی گلی کے اندر جاتے ہوئے رُخ ایمپر لیس مارکیٹ کی طرف کر لیا۔ حسب سابق نیا گھر کے باہر پولی والوں کا رش تھا۔ ایک کونے میں موٹر سائیکل روک کر میں نے سائلوں کو اترنے کا کہا اور موٹر سائیکل کو بڑے شیڈ پر کھڑا کر لیا۔ میری نظریں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں مگر مجھے کوئی بھی ایسا آدمی نظر نہ آیا جس کی نگاہ ہم پر ہو۔ ادھر ہی رُکے ایک گھنٹہ پورا ہو گیا۔ مزید پندرہ منٹ بعد میری فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب سے وہی آواز آئی ”سامنے کی طرف دیکھو۔“

میں نے دیکھا کہ سڑک کے دوسری جانب ایک درخت کے نیچے موٹر سائیکل پر ایک لڑکا بیٹھا فون پر بات کرتے ہوئے میری جانب ہاتھ ہلاتا رہا تھا۔ میں نے سر ہلاتے اس کے اشارے کی تائید کی اور موٹر سائیکل اشارت کر کے دوسری جانب جانے والے راستے کی طرف گھوم گیا۔ قریب آنے پر اس نے سر کے اشارے سے اپنے پیچھے آنے کا کہا۔ آگے آگے وہ تھا اور ہم اس کے پیچھے جا رہے تھے۔ وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر بند روڈ سے نیچے جانے والی سڑک پر ہو گیا۔ یہ نالے کے ساتھ ساتھ جاتی وہ سڑک تھا جس کے دونوں جانب چھوٹی چھوٹی دکانوں میں مختلف کاروبار چل رہے تھے۔

ایک موٹر کاٹ کر لڑکے نے موٹر سائیکل آہستہ کر دی، میں سمجھ گیا کہ وہ ہمیں رُکنے کا کہہ رہا ہے۔ ہمارا فاصلہ برائے نام تھا اس کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

”وہ سامنے دیکھو جس آدمی نے نیلا کوٹ پہن رکھا ہے۔ یہ اس کا روہاری مرکز کا صدر ہے۔ نام اس کا محبوب علی ہے مگر حاجی صاحب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اچھی طرح اس کو ذہن میں اتار لو، میں اب چلا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

فاصلے پر اس کا چپچا کر رہے تھے۔ جس طرف وہ جارہا تھا اور اور بھی لوگ گھوم بھر رہے تھے۔ ایک پارک کے آٹار دور سے نظر آ رہے تھے۔ وہ آبادی والے راستے کو چھوڑ کر جب پارک کی جانب گھوما تو میں نے سائول کو ہوشیار کیا اس نے فوراً اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

”میں تیار ہوں بھئی۔“ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے بین حاجی کے سر پر ہینچ کر بریک لگائی۔ سائول بھرتی سے اتر کر حاجی کے پاس ہینچ کر دھاڑا۔

”آرام سے موٹر سائیکل پر بیٹھو۔ کوئی حرکت کی تو ابھی تمہارا بیجا اڑا تا ہوں۔“ حاجی ہمیں دیکھ کر سہم گیا اور بغیر خیل و حجت کے گھبرا کر میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ سائول اسے دھکا لگا کر آگے کرتے اسے پستول کی زد میں لیتے ایسے بیٹھ گیا کہ حاجی ہم دونوں کے درمیان سینڈویچ بن گیا۔ میں نے موٹر سائیکل آگے بڑھادی۔

حاجی کا پورا جسم ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔ میں مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا منگو پیر روڈ کی جانب اڑا جا رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق حاجی کو لے کر ہم پہاڑوں کی طرف جاتے راستے پر آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک مناسب جگہ پر ڈک کر میں نے موٹر سائیکل روکی اور حاجی کو مخاطب کیا۔

”دیکھو کوئی حرکت نہیں چاہیے۔ آرام سے بیٹھ جاؤ؟“

”مجھے کوئی نقصان مت پہنچانا۔ میں ہر طرح کی ڈیماڈ پوری کرنے کو تیار ہوں۔“

”بس اگر تم نے کوئی گڑبڑ نہ کی تو بالکل محفوظ رہو گے۔“ میں نے اُسے سمجھہ کرتے ہوئے سائول کو اس پر نظر رکھنے کا کہا۔ ذرا ڈور آ کر میں بڑے سائیں کو فون کرنے لگا۔ جلدی رابطہ ہو گیا، میں نے

پہلے وہ اسکول دین پر پہنچے لانا لے جاتا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے سائول کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ کسی طرح کرایہ پر سوزو کی ڈبہ حاصل کرے باقی سارا کام میرا۔ اس نے بتایا کہ میرے کئی جاننے والے ہیں کسی سے میں ویسے ہی چار پانچ گھنٹوں کے لیے ڈبہ مانگ لاؤں گا۔

”تو ٹھیک ہے صبح پانچ بجے ہم دونوں گھر سے نکل کر اس کے گھر کی گھرانی کریں گے تاکہ ہمیں یہ چل جائے کہ اس کے اوقات کار کیا ہیں۔ پھر کوئی مناسب پروگرام بتالیں گے۔“ صبح منہ اندھیرے ہم دونوں اپنے اپنے ریلوے سنبھالتے موٹر سائیکل نکال کر آگرہ کالونی کی طرف چل پڑے۔

سڑکوں پر رش کم تھا اس لیے بغیر کسی رکاوٹ کے ہم اس گھر سے کچھ فاصلے پر آڑکے۔ اندازاً ایسا ہی تھا جیسے ہم اور ڈرک کر کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اندر لائٹ روشن ہوئی۔ ہم دونوں الرٹ ہو گئے۔ دروازہ کھلا اور حاجی صاحب و انگل سوٹ میں باہر نکل کر گیٹ بند کر کے ایک طرف چل پڑے۔

وہ اسی انداز سے تیز تیز چل رہے تھے جیسے وہ صبح کی سیر کے عادی ہوں۔ فوراً میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے سائول کو ایک ہی سانس میں اپنے دماغ میں اٹھنے والے خیال سے مطلع کر دیا۔ ”سائول! میں موٹر سائیکل اس کے قریب لے کر جاؤں گا تم فوراً اتر کر حاجی صاحب کو پستول کی زد میں لیتے میرے پیچھے بیٹھنے کا حکم دو جب وہ بیٹھ جائیں تو تم اس کے پیچھے بیٹھ کر اس کی کمر سے پستول کی تالی لگا دینا۔ اگر کوئی گڑبڑ کرے تو فائر ٹھوک دینا۔“ یہ سب میں نے ایک ہی فیصلے میں سوچ لیا۔

حاجی اپنے گھر سے کافی آگے نکل آیا تھا ہم ذرا

رہے کہ خاموشی سے بیٹھے رہنا۔ ہم تمہیں واپس چھوڑنے جا رہے ہیں۔ اگر کسی سے کوئی بات کی، خاص کر پولیس سے بات کی تو تمہیں پار کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ صرف سرک جنٹل دے کر رہ گیا۔ اونچے نیچے راستے سے نکل کر ہم منگو چر روڈ پر آ گئے۔ ٹریفک برائے نام تھی۔ ایک جگہ ٹک کر ہم نے حاجی صاحب کو اتارا اور عیڑی سے آگے بڑھ گئے۔ میں موٹر سائیکل چلانے میں ماہر تھا۔ اس لیے طوفانی رفتار سے اڑتا ہوا اس علاقہ سے کافی دور نکل آیا۔ جس وقت ہم اپنے ڈپرہ پر آئے فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ چاروں جانب دیکھ کر یقین کر لیا کہ کوئی ٹکڑ بڑ نہیں۔ موٹر سائیکل کھڑی کر کے اپنے اپنے بستر پر ڈھیر ہو گئے۔

تھکاوٹ سے ہمارا حال تھا۔ بستر پر پڑتے ہی نیند نے دبوچ لیا۔ جب آنکھ کھلی تو دوپہر سر پر تھی۔ فوراً فون چیک کیا، کوئی مس کال نہیں تھی۔ سائیکل کو بڑی مشکل سے چکایا اور کھانے کا بندوبست کرنے کا کہا۔ وہ جانی لیتے اٹھا اور موٹر سائیکل اٹھا کر قریبی ہوٹل کی طرف چلا گیا۔ اس کے آنے تک میں نہا کر تیار ہو چکا تھا۔ اس نے بس منہ ہاتھ دھویا اور میرے سامنے کھانا لگاتے ہوئے بولا۔ ”بھئی اب کتنے دن امدادی گزارنے ہوں گے۔“

”بس دو تین دن۔“

”ایک بات کروں؟“

”ہاں بولو۔“ میں نے نوالہ منہ میں ڈالتے اس کی جانب استہمامی نظروں سے دیکھا۔

”یار ایک ہل سوچو۔ ہمیں بڑے سائیکل نے صرف دس ہزار دیئے اور ہم نے ریوٹ کی طرح اس کے اشارے پر ایک مالدار تاجر کو آسانی سے خوار کر لیا۔ خدا معلوم پندرہ میں گھنٹے اسے اپنی گمرانی میں

خوشخبری سنائی کہ ہم نے حاجی کو قابو کر لیا ہے۔ دوسری طرف سے شاپاش کے بعد کہا گیا کہ میری کال کا انتظار کرو اور فون کاٹ دیا۔

دوپہر تک بڑے سائیکل کے فون کا انتظار رہا مگر کوئی رابطہ نہ ہوا۔ جس جگہ ہم نے حاجی کو کھرا ہوا تھا وہ خاصی محفوظ تھی۔ حاجی کے چہرے پر خوف اور بھوک کے آثار نمایاں نظر آ رہے تھے۔ میں نے سائیکل کو کہا ”تم جا کر پانی اور کھانے کے علاوہ پھل وغیرہ بھی لے آؤ مگر بڑی احتیاط سے جانا اور آنا۔ میں ادھر ہی ہوں۔“ حاجی کو پھاڑ کے اندر جاتی کھوہ میں اس طرح بٹھا دیا تھا کہ باہر سے اس پر نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا تو ہم اس کو ڈانٹ کر چپ کر دیتے۔ سائیکل جلدی لوٹ آیا تھا۔ اس کے لائے شاپنگ بیگز میں کھانے کے علاوہ بھی کافی کچھ تھا۔

ہم نے حاجی کو مکمل یقین دلایا تھا کہ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جوں ہی کوئی اطلاع آئی اسے واپس چھوڑ دیا جائے گا۔ رات گئے بڑے سائیکل کا فون آیا کہ حاجی صاحب کو کسی مناسب جگہ پر چھوڑ دینا اور خود اس وقت تک باہر نہیں آنا جب تک تمہیں آنے کا نہ کہا جائے۔

”جی۔ جو حکم آپ کا۔“ کہتے ہوئے میں نے فون کی جانب دیکھا۔ کال کاٹ دی گئی تھی۔ میں نے حاجی صاحب کو آواز دی کہ ”باہر آ جاؤ“ اور سائیکل سے کہا ”موٹر سائیکل اٹھاؤ۔“ جو ہم نے ایک جھاڑی کی اوٹ میں اس طرح کھڑی کر رکھی تھی کہ اس پر نظر پڑنی مشکل تھی۔ حاجی صاحب سب سے ہوئے پھاڑی کی عمووی کھوہ سے نکل کر نیچے کی جانب اتر آئے۔ میں نے موٹر سائیکل اشارٹ کی اور اسی طرح جیسے ہم آئے تھے واپسی کے لیے چل پڑے۔ تمام راستے ہم حاجی صاحب کو سمجھہ کرتے

رکھے کے عوض بڑے سائیں نے اس کے دروازے
کیا ڈیل کی ہوگی۔“

”سانول تم اپنا مدعا بیان کرو کہ تمہارے دل
میں کیا چل رہا ہے؟“

”میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ تم تو
پہلے ہی ہمارے لیڈر ہو کیوں نہ ہم الگ سے اپنا کام
شروع کر دیں۔“

”یار وہ تو ہم کب سے کر رہے ہیں۔“
”میرا مطلب یہ ہے کہ پہلے ہماری سرپرستی
کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب ملک کی سرگرم پارٹی
کی چھتر چھاؤں میں جگہ ل گئی ہے۔ سرکاری سطح پر
اس پارٹی کا خاصا دبہ ہے۔ کیوں نہ ہم کوئی ایسی
نئی واردات کریں۔“

سانول کی بات میرے دل کو گئی۔ میں نے
اسے حتمی کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے بڑی آسانی
سے حاجی صاحب کو اپنی موٹر سائیکل پر انوا کر لیا
تھا۔ ان دونوں کو ڈکیتی اور مار دھاڑ میں شامل رکھتے
ہیں اور انوا برائے تاراوان والا دھندلہم خود کرتے
ہیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ سانول نے سر ہلاتے
میری بات کی تائید کی۔

”ابھی تو ہماری واردات ہی ہے کچھ دن بعد اس
پر غور کرتے ہیں۔ جب تک کسی معقول آسامی پر بھی
نظر رکھتے ہیں۔“

ہمیں اندر بند ہوئے تقریباً بارہ روز ہو چکے تھے
اس دوران بڑے سائیں نے بھی کوئی رابطہ نہ کیا۔
ججی صاحب کو کبھی بار بار فون کیا مگر ان کا نمبر مسلسل
بند تھا۔ اس رویہ سے ہم دونوں کافی دلبرداشتہ ہوئے
مگر کیا کر سکتے تھے۔ اس دوران رات کو دو چار
معمولی نوچیت کی ڈکیتیاں کہیں۔ کوئی بڑی رقم ہاتھ
نہیں لگی تھی۔ دن بھر کمرے میں پڑے رہنے سے

طبیعت پور ہو چکی تھی۔ ڈرتے ڈرتے بڑے سائیں
کو فون لگایا ان کا نمبر بھی بند ملا۔ میں سمجھ گیا کہ
دونوں اصحاب نے دیدہ دانستہ اپنے موبائل میں
دوسری سیمیں ڈال رکھی تھیں۔ بڑی کوفت ہوئی۔ میں
نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے رابطہ کر کے بڑی
ڈکیتی کا منصوبہ بنایا، وہ ریڈی تھے۔ رات کے چھپلے
پہر ہم چاروں اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل کر حسب
پردگرم ڈرگ روڈ پر اکٹھے ہو گئے۔ سانول نے ناکہ
لگا کر لوٹنے کا عندیہ دیا۔ سو ہم نے ایک لکڑی ٹال پر
سے دو بڑے بڑے لکڑی کے لٹھے اٹھائے اور چھوٹی
سڑک سے اندر جانے والے راستے پر درمیان میں
رکھ دیئے اور خود تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اپنی موٹر
سائیکل درختوں کی اوٹ میں چھپا کر الٹ ہو کر اس
طرح بیٹھ گئے کہ سڑک پر سے آنے والے کی ہم پر
نظر نہ پڑے۔ ایک گاڑی اسی راستے پر آئی۔ بس
جونہی وہ درمیان میں پڑی لکڑیوں کے قریب پہنچ کر
رکی ہم چاروں اوٹ سے نکل کر اپنے ہتھیار لہراتے
گاڑی چلانے والے کے سر پر پہنچ گئے۔ گاڑی میں
کل تین لوگ تھے۔ اچانک ہمارے سامنے آ جانے
پر وہ اتنا کہم گئے کہ بغیر مانگے وہ اپنے اپنے پرس،
موبائل وغیرہ نکال کر ہماری طرف بڑھاتے گاڑی
سے نیچے اتر آئے اور گاڑی کی چابی بھی میری طرف
بڑھا دی۔ سانول نے تینوں کی ٹٹل تلاشی لیکر میری
طرف دیکھا۔ میں نے گاڑی کی چابی سڑک کے
درمیان پھائی گئی گرین بلٹ میں اچھال دی اور موٹر
سائیکل اسٹارٹ کر کے ہم موقع واردات سے دور
نکل آئے۔

اُن کے موبائل بھی جیتی تھے اور پرس میں بھی
خامے نوٹ تھے۔ سب مل کر پونے تین لاکھ بنے جو
میں نے براہِ تقسیم کر دیے۔ موبائل کی سیمیں نکال کر
پھینک دیں اور موبائل اپنے پاس رکھ لیے۔ ہم نے

پٹرول پمپ پر کامیاب ڈاکہ ڈالنے کے بعد بائیں موٹع واردات سے نکل کر تھانہ صدر کی حدود میں اگلے کے زور پر دو الگ الگ مقامات پر راگیدروں سے ڈکیتی کر کے آگے پیچھے اڑے جا رہے تھے کہ کسی نے پولیس تھانہ صدر کو اطلاع کر دی۔

پولیس پہلے ہی پورے علاقے میں دن رات گشت پر مامور تھی۔ میں اور سائل موٹر سائیکل پر آگے اور وہ دونوں ہمارے پیچھے تھے۔ میری نظر سامنے آتی پولیس دین پر پڑی۔ میں نے جنوبی راستہ بدلا تو ان کو ٹک ہو گیا اور گاڑی پر نصب سائرن کی آواز نے چاروں جانب لہلہ چا دی۔

راہ چلتے لوگ ہمیں اور ہمارے پیچھے تعاقب میں آتی پولیس پارٹی کو دیکھ کر راستہ چھوڑ دیتے تھے جس راستے پر ہم پولیس سے ڈر کر بھاگ رہے تھے وہ قبرستان کی جانب جا رہا تھا۔ بجائے ہم آبادی کی طرف جاتے میں نے موٹر سائیکل قبرستان کے اندر جانے والے راستے پر ڈال دی۔ اسی دوران پیچھے سے فائرنگ ہونے لگی۔ ہم موٹر سائیکل پھینک کر اپنا اپنا ہتھیار سنبھالتے پولیس پر جوابی فائرنگ کرنے لگے مگر پیچھے سے آنے والی دوسری پولیس پارٹی نے چاروں جانب سے گھیرا ڈال لیا تھا۔ ہم چاروں بے بس ہو گئے۔ میں شدید زخمی حالت میں گر پڑا اور پولیس ہم پر حاوی ہو گئی۔ گرفتاری کے بعد مجھے زخمی حالت میں ہسپتال لایا گیا ہے۔

رودھان عرف بمبئی یہ سب بتا کر خاموش ہو گیا۔ لیکن میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان ایک بار جرم کی راہ پر چل پڑے تو پھر کسی قدر غرر اور بے خوف ہو جاتا ہے۔ اس کے جرائم بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور واپسی کی کوئی راہ باقی نہیں بچتی۔ جب واپسی ہوتی ہے تو کچھ باقی نہیں بچتا۔

یہ اصول بتایا تھا کہ جس علاقہ میں ڈکیتی کرتے وہاں دوبارہ کم ہی آتے جاتے تھے۔ اسی دوران مزاحمت کی وجہ سے آنے سامنے فائرنگ سے ہمارے ہاتھوں نکل بھی ہوئے مگر ہم موٹع واردات سے نکل بھاگے تھے۔

یکدم ٹارگٹ کلرنگ نے پورے ایریا میں دہشت پھیلا دی۔ اسی دوران جی صاحب اور بڑے صاحب کا فون موصول ہوا۔ دونوں نے ہمیں فوراً پارٹی کے آفس آنے کا کہا۔ میں نے آنے کا کہا مگر چاہتے ہوئے بھی نہ گیا۔ دونوں نے ہمارے پیچھے اپنے آدمی لگا دیے۔ آنے سامنے فائرنگ ہوئی۔ ان کا ایک کارندہ میری گولی سے لڑھک گیا۔ تھانوں میں ہمارے خلاف ان گنت مقدمات درج ہو چکے تھے مگر ہمارے حوصلے اتنے بڑھ چکے تھے کہ پولیس کو ہر بار چکمہ دے کر ہم نکل جاتے تھے۔ جوں جوں بڑی بڑی دقتیں اچھوٹنے لگی تھیں ہماری بدتماشیاں عروج پر پہنچ چکی تھیں۔

شراب اور شاب ہم چاروں کی کمزوری بن چکی تھی۔ جب تک لوٹی ہوئی رقم کی پانی پانی خرچ نہ ہو جاتی تھی ہم اٹھتے نہیں تھے۔

ہمیں ایک بڑی ڈکیتی کا لوٹا ہوا مال بے دریغ خرچ کرتے نوواں دن تھا۔ سائل نے مجھے بتایا کہ ”خرچہ کم رہ گیا ہے، اس لیے کوئی بندوبست کرنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے آج ہی کچھ کرتے ہیں۔ دونوں کو فون کر کے آنے کا بلو۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور ان دونوں کو فون کر کے شام کو ڈیرے پر آنے کا بلوا۔ مگر خود کھانا لینے مارکیٹ چلا گیا۔

دن کا اُجالا اندھیرے کی چادر اوڑھ چکا تھا۔ ہم چاروں ڈسٹرکٹ ساؤتھ کی حدود میں واضح ایک

سابقہ تمام ایڈیشنز کی طرح یہ بھی بھرپور اور دلچسپ ہے



قیمت 700 روپے



کانیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

عمدہ طباعت، ضخامت ۲۰۰ صفحات، چار جلدوں پر مشتمل دیدار زیب پبلیک

مکمل قیمت 700 روپے

قاریتین کرام بہراہ راست، بذریعہ منی آرڈر یا وی پی پی منگوا سکتے ہیں

سوارہ ڈاجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواڑ گاؤں لاہور۔ فون: 37245412



URDU TUBE

A HOME OF ENTERTAINMENT

WWW.URDU.TUBE.COM

انتقام

محمد سلیم اختر

بھگتی پھرتی ہوں اب میں تمہاری راہوں میں
دل و نگاہ میں اک شوق بے قراری لئے
اس نے مر کے اس شعر کو بچ ثابت کر دکھایا اور قبر میں بھی بے چین رہی پھر ایک
موقع ایسا آیا کہ.....

آگرہ کے قبرستان کی اس قبر سے ایک بچہ نکلا جو زندہ تھا۔ دل ہلا دینے والی کتھا

سمانے پر اصرار کرتے۔ اس کی سائی ہوئی بعض
کہانیاں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں کہ لڑکے رات بھی
اس کی کتیا میں گزار دیتے۔

مجھے بھی کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا اس لئے
میں بھی اکثر وہاں چلا جاتا۔ وہ فقیر بہت ہی باتونی

وہ فقیر برسوں سے پرانے قبرستان میں ایک کتیا
میں رہ رہا تھا۔ ارد گرد کے لڑکے اکثر اس سے عجیب
وغریب کہانیاں سننے آیا کرتے تھے۔ قبرستان شہر
سے دو کوس کے فاصلے پر تھا ارد گرد جنگل تھا۔ شام کو
کئی لڑکے اس کی کتیا میں آ جاتے اور فقیر سے کہانی

ہماری نیند حرام ہوگئی اور ہم رات بھر الاؤ کے قریب سہے ہوئے آگ تاپتے رہے۔ وہ آواز مسلسل آ رہی تھی مجھ پو پھٹنے کے قریب وہ بھی ایک آواز بند ہوگئی۔ اُجالا ہوتے ہی ہم وہاں سے بھاگ نکلے۔

ہم نے وہ واقعہ اپنے ایک اور دوست کو سنایا تو وہ طو آ میز انداز میں فحس کر بولا ”گورکن طبقہ بھی لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے کیسی کیسی کہانیاں گھڑتا ہے۔ ایسے دیران مقامات پر رات کے وقت گیدڑ بندر اور دوسرے جنگلی جانور اکثر بھرتے رہتے ہیں جن کی آوازیوں سے یہ لوگ دوسروں کو ڈرا کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔“

میں نے اپنے دوست کی بات سے اختلاف کیا اور اسے مختلف دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔ اسے قائل کرنے کے لئے میں نے اسے ایک رات قبرستان میں گزارنے کو کہا تو وہ فوراً راضی ہو گیا۔

وہ قبرستان شہنشاہ اکبر کے مقبرے سے میل بھر کے قاصطے پر تھا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ فقیر کی کنیا اس دن خالی تھی شاید وہ فقیر آبادی کی طرف گیا ہوا تھا۔ ہم نے کنیا کو صاف کیا اور بستر لگا کر لیٹ گئے۔ خزاں کا ناساز موسم تھا۔ ہوائیں بے کل اور فضا میں ایک عجیب قہر قہراہٹ سی تھی۔ دیئے کی روشنی کوٹھری کی سیاہ دیواروں میں گویا جذب ہو کر رہ گئی تھی۔ ہم دم سادے ہوئے فقیر کے خستہ اور بدبودار بستر پر لیٹے پڑے تھے۔

اچانک آدمی رات کے قریب ایک مہیب آواز نے ہمیں خوفزدہ کر دیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ فرشتہ اجل کے پھنکارنے کی آواز ہے یا داروغہ جہنم کے ان کوڑوں کی جو کسی گناہ گار روح

تھا۔ ایک رات میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ رات کو فقیر کے پاس گیا تو اس کی دلچسپ باتوں میں کھو کر بہت دیر ہوگئی۔ ہم نے رات وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ سردیوں کے دن تھے اور شدید سردی پڑ رہی تھی اس لئے ہم دیکھتے ہوئے الاؤ کے قریب بیٹھے تھے۔ الاؤ کا دھواں آنکھیں جلا رہا تھا مگر مجبوری تھی پھر نہ جانے کب ہم لوگ سو گئے۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی رات کا نہ جانے کون سا چہرہ تھا اچانک مجھے انتہائی بھیانک آواز سنائی دی۔ وہ آواز اتنی لرزہ خیز تھی کہ میری روح تک کانپ اُٹھی۔ یوں لگا جیسے کوئی جاں بلب مریمیں انتہائی اذیت ناک انداز میں کراہ رہا ہے۔ وہ آواز قبرستان کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں نے خوف زدہ ہو کر اپنے ساتھی کو جگا دیا۔ وہ بھی اس لرزہ خیز آواز کو سن کر بدل گیا۔ اس وقت الاؤ بھی جھجکا تھا حرارت کی آخری رشت بھی مفقود تھی۔ ہمارے دل گویا حلق میں دھڑک رہے تھے مگر وہ فقیر دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک کونے میں محو خواب تھا۔

ہم نے گھبرا کر اسے جگا دیا۔ اس نے بیزارگی سے ہمیں دیکھا پھر آہستگی سے اٹھا اور دوبارہ الاؤ روشن کر کے دیوار سے ٹک لگا کر اطمینان سے جتنے کے لیے لمبے کش لینے لگا۔ وہ خزانہ آواز اب بھی آ رہی تھی۔

میں نے فقیر سے پوچھا ”یہ کیسی آواز ہے؟“ وہ ہنستے ہوئے بولا ”اس گھر میں مت پڑو ایسی آوازیں قبرستان سے اکثر آیا کرتی ہیں شاید کسی گناہ گار روح کو عذاب دیا جا رہا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کی بات سن کر ہم مزید خوف زدہ ہو گئے

جیسے ان قبروں سے مُردے اپنی بے نور آنکھیں بھاڑ
بھاڑ کر ہمیں گھور رہے ہیں اور ابھی اپنے استخوانی
ہاتھ بڑھا کر ہمیں پکڑ لیں گے۔

مجھے اپنے سائے سے بھی خوف آرہا تھا مگر
رشید اور سری تاجہ بے خوف تھے۔ وہ قبروں کو
بھلاکتے ہوئے ایک پرانی سی قبر کے پاس جا
کھڑے ہوئے۔ قبر کا کتبہ انتہائی بوسیدہ ہو چکا تھا۔
اس کا کئی زندہ قبر پر خود بخود بھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔
کتبے پر متونی کا نام کندہ تھا مگر کافی روشنی کی وجہ
سے پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ خوفناک آواز اسی قبر
سے آ رہی تھی۔

رشید نے کدال سے اس قبر کو کھودنا شروع
کر دیا مگر وہ نہایت ہی مضبوط لگ رہی تھی۔
اچانک سری تاجہ کا پاؤں ایک گڑھے میں جا پڑا وہ
گھبرا کر چیخے بھاڑا تو اسے تاریح کی روشنی میں قبر
کے پاس ایک سوراخ نظر آیا۔ رشید نے اسی
سوراخ کے نزدیک کھدائی شروع کر دی کچھ نیچے
جانے کے بعد خوفناک آواز آنی بند ہو گئی۔ سری
تاجہ تاریح سنبھالے کھڑا تھا اور رشید بلا خوف
کھدائی کر رہا تھا۔ میں کھدائی سے نکلنے والی مٹی کو
ایک طرف بٹا رہا تھا ایک کھٹے بعد اس نے قبر کی
ایک طرف کی بنیاد اکھیر کر رکھ دی۔ اس کے بعد
رشید نے تعویذ بھی نکال کر ایک طرف پھینک دیا
اب ہمارے سامنے کھلی ہوئی قبر تھی۔

اُف وہ خوفناک منظر دیکھ کر ہمارے دل دھلے
گئے۔ قبر میں ایک عورت کی لاش پڑی تھی ایک بچہ
اس عورت کے سینے سے لگا دودھ پی رہا تھا۔ اس
بچے کی شکل نہایت ہی مکروہ تھی۔ میرے منہ سے چیخ
نکل گئی۔ سری تاجہ بھوت بھوت کہہ کر پیچھے ہٹ گیا

پر برساتے جا رہے ہیں ہم سب پر خوف و ہراس
طاری ہو گیا۔

میرے دوست رشید پر خوف کے بجائے قہج کا
غمر غالب تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تاریح اٹھا کر
کٹیا سے باہر نکل گیا۔ ہم دونوں میں اس کے پیچھے
جانے کی جرأت نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گیا
اور کٹیا سے قبر کھودنے والی کدال اٹھا کر دوبارہ باہر
جانے لگا تو ہم نے اسے روک لیا لیکن وہ نہایت ہی
ضدی تھا وہ جس بات پر اڑ جاتا اسے کر کے ہی رہتا
تھا۔ اس رات بھی وہ اس آواز کے اسرار تک پہنچنا
چاہتا تھا۔ اس نے خود کو چھڑایا اور بولا ”تم لوگ
میری فکر چھوڑو اپنی فکر کرو۔“

”رشید! یہ کام تم بھی تو کر سکتے ہو اس وقت
یہ کرنا مناسب نہیں ہے۔“ میں نے کدال کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
اس کی ایک ہی ضد تھی کہ جو کچھ کروں گا ابھی
کروں گا۔

ہمارا تیسرا دوست ہندو تھا۔ وہ رشید کے ساتھ
جانے کو تیار ہوا تو میرے لئے تیار رہتا مشکل ہو گیا۔
مجبوراً میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ خوفناک آواز
اسی طرح سنائی دے رہی تھی۔ اس کی ناکوڑ گونج دل
دہلائے دے رہی تھی۔ ہمارے پیروں کے نیچے
خشک چے چر مر رہے تھے۔ ایک ٹڈ منڈ سے
درخت کے کھوکھلے تنے میں سوتے ہوئے سبجے
سروں والے گدھ تاریح کی روشنی پڑتے ہی لمبی لمبی
گروئیں باہر نکال کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ تاریح
کی روشنی سے ہمارے سائے لمبے اور ڈراؤنے
ہو رہے تھے۔ سبھی ہوئی فضا میں قبریں خوف سے
سکرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا

خدا شکار کیا۔

”کیوں؟ اس میں خطرے کی بھلا کیا بات ہے۔ میں نے اکثر بڑی بوڑھیوں سے سنا ہے کہ قبرستان سے ایسے بچے بھی ملے ہیں جنہیں ان کی دوس نے مرنے کے بعد قبروں میں ختم دیا ہے۔“
”وہ سب قصے کہانیوں کی باتیں ہیں۔ بھلا ایسی باتوں پر یقین کیا جاسکتا ہے؟“ سری تھوڑا بولا۔

”لیکن یہ کہانی نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔“
رشید نے بچے کی طرف اشارہ کر کے فخر سے کہا۔
اس کی بات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ رشید بچے کو اٹھا کر قبرستان سے باہر نکل گیا پھر اس نے شہر میں ایک بیوہ کو تلاش کیا اور مقتول معاوضے پر بچہ پرورش کی غرض سے اس کے سپرد کر دیا۔

رشید نے بچے کا نام قاروق رکھا۔ ہم تینوں ہی اس بچے کے نکل گئے تھے۔ بیوہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی ہم نے اسے یہ نہ بتایا کہ بچہ ہم قبر سے نکال کر لائے ہیں بلکہ اسے یہی بتایا تھا کہ بچے کے ماں باپ فوت ہو گئے ہیں۔ چند ماہ گزرنے کے بعد بچے کی شکل میں واضح تبدیلی آ گئی۔ اب وہ بچکانا ہی نہ جانتا تھا۔ اس کے چپکے ہوئے گال گوشت سے بھر گئے تھے۔ اس کی آنکھیں خوبصورت اور چمکیلی ہو گئی تھیں وہ نہایت ہی خوبصورت ہو گیا تھا۔ رشید اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ بچہ کی صحت روز بہ روز بہتر ہو رہی تھی۔ وہ تین سال کا ہوا تو اس کی عادات و اطوار میں نمایاں تبدیلی آنے لگی۔ یوں لگا تھا جیسے وہ ڈینی طور پر اب نارمل ہو۔ وہ بیوہ کو بہت ہی تنگ کرنے لگا تھا۔ نہ وہ اسے اپنے پاس بیٹھنے دیتا نہ سونے دیتا وہ علیحدہ چارپائی پر سوتا تھا۔ اس کے

لیکن رشید نے جرات اور بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بچے کو اٹھایا اور ککھری میں لے آیا۔

دیسے کی روشنی دیکھ کر بچہ گھبرا گیا اور رونے لگا اس کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ میں اور سری تھو ڈر گئے یہ وہی سکروہ آواز تھی جو قبرستان سے آتی تھی۔ اس آواز میں اتنی کرختگی تھی کہ خدا کی پناہ۔ وہ ایک ننھے بچے کی آواز لگتی ہی نہیں تھی۔

رشید بھی بولکھلا گیا لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو پایا اور بولا ڈر نے کی ضرورت نہیں لگتا ہے یہ بھوکا ہے اسے غذا کی ضرورت ہے۔

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور ایک بھارے سے ملاٹھے میں رکھے ہوئے مٹی کے ٹوٹے پوٹے برتنوں میں کھانے کی کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔ آخر ایک برتن میں اسے تھوڑا سا مٹی مل گیا اس نے بچے کو وہ مٹی چٹایا تو اس نے رونا بند کر دیا۔

ہم نے وہ رات آنکھوں میں کاٹ دی صبح کی اذان ہوئی تو میں اور رشید قبرستان گئے اور رات کی اکھڑی ہوئی قبر کے تعویذ کو قبر پر رکھ کر اس کا سوراخ مٹی سے بھر دیا۔ سرہانے کی طرف لگی ہوئی سل سے متوفیہ کا نام وغیرہ پڑھنا چاہا مگر حروف معدوم ہو چکے تھے۔ بڑی مشکل سے صرف تیس التواء پڑھا تھا باقی حروف پڑھے نہیں جا رہے تھے۔ ہم قبر بند کر کے واپس آئے تو رشید کہنے لگا ”فقیر کے آنے سے نکل ہی ہمیں اس قبرستان سے نکل جانا چاہیے فی الحال ہم کسی کو بھی اس بچے کے بارے میں نہیں بتائیں گے ورنہ دنیا اسے دیکھنے کو ٹوٹ پڑے گی۔“

”مگر ہم اس بچے کا اب کریں گے کیا؟ یہ تو ہمارے لئے عذاب بن جائے گا۔“ میں نے اپنا

مجھے بھی بلا لایا۔ ہم دونوں ہی فاروق کی یہ پراسراریت دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے۔

فاروق اس بیوہ کو بھی بہت ہی تنگ کرنے لگا ایک روز وہ روتی ہوئی رشید کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اب وہ فاروق کو نہیں سنبھال سکتی کیونکہ وہ روز بروز پراسرار ہوتا جا رہا ہے۔ وہ راتوں کو بھیا تک آوازیں نکال کر اسے ڈراتا ہے۔

رشید نے بیوہ کو تسلی دی کہ وہ اسے نقصان نہیں پہنچائے گا وہ چلی گئی لیکن اسی رات وہ مر گئی۔ ہمیں اس کے مرنے کا بہت دکھ ہوا۔

رشید فاروق کو اپنے گھر لے آیا۔ اب وہ بھی فاروق کی حرکات و سکنات دیکھ کر پریشان رہنے لگا تھا کبھی کبھی یہ کہتا کہ اسے قبر سے نکال کر میں نے غلطی کی ہے۔

پھر فاروق کی دیوانگی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ وہ کمرے میں گھومنے کے بعد بے ہوش ہو جاتا۔ اس کے تین سائے دیکھ کر ہم بھی پریشان ہو جاتے۔ ہم نے تو اس کا علاج کرانے کی کوشش کی مٹلوں سے رجوع کیا اس کے لئے تعویذ لائے مگر کوئی اثر نہ ہوا۔

بے ہوشی کے عالم میں فاروق کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے تھے ”میں قسم پوری کروں گا میں بدلہ لوں گا۔“

ہم اس کی زبان سے یہ الفاظ سن کر حیرت پریشان ہو جاتے۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے کچھ یاد نہ رہتا ہم اسے بتاتے کہ تم بے ہوشی میں ایسی باتیں کر رہے تھے۔

وہ کہتا ”مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

بلاخر ایک نہایت ہی چپخے ہوئے عامل نے

روپے میں بھی تھی اور تھری آگئی تھی۔ وہ بات بات پر خند کرنے لگا تھا۔

جوں جوں اس کی عمر بڑھ رہی تھی اس کے اطوار میں تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ اس کے شوق بھی نرالے تھے وہ بڑے کپڑے پہننے اور صلیات لگانے کا بہت شوقین تھا۔ جب تک دسترخوان پر کچی قسم کے کھانے نہ ہوں وہ کھانا نہیں کھاتا تھا۔ وہ روٹھ جاتا تو ہم اسے بڑی مشکل سے مٹا پاتے۔ وہ ہمیشہ اپنی ٹوپی میں پھول یا کسی پرنے کا پر لگا کر گاؤں جھکے کے سہارے بیٹھ جاتا اور تنہا پیشانگوں کچھ سوچا کرتا تھا۔ وہ فطری طور پر شاعرانہ حراج رکھتا تھا خاصا حاضر جواب بھی تھا۔

دس سال کی عمر میں ہی وہ بہت اچھے شعر کہنے لگا لیکن تعلیم کی طرف توجہ کم تھی۔ اس کی طبیعت میں فحاشی اور سفاقت بھری ہوئی تھی۔ اس کا انداز بھی شاہانہ تھا۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر ہم حیران ہوتے۔ ہم نے اسے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کسی پراسرار شخصیت بنے نہ یہ کہ ہم نے اسے قبر سے نکالا تھا مگر اس کی حرکات سے یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچوں میں اتنا کم ہو جاتا کہ اس پر دیوانگی سی طاری ہو جاتی وہ دنیا سے بے خبر سا ہو جاتا۔ بعض اوقات بالکل پاگلوں جیسی حرکتیں کرتا۔ کبھی وہ دیواروں اور کبھی اپنے سائے سے عجیب طرح کی باتیں کرنے لگتا۔

کبھی وہ دائرے کی شکل میں کمرے میں گھومتا شروع کر دیتا۔ ایک روز وہ تیزی سے دائرے کی شکل میں گھوم رہا تھا۔ رشید نے دیکھا کہ دیواروں پر فاروق کے تین سائے نظر آرہے تھے۔ رشید نے

ہمیں بتایا کہ فاروق کی ماں شمس النساء کا تعلق آگرہ کے ایک ہندو خاندان سے ہے۔ اس نے ہمیں ایک ہندو پنڈت مادھورام سے ملنے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ وہی ہمیں حقیقت بتا سکتا ہے۔

سری ناتھ کہنے لگا ”مادھورام آگرہ کی مشہور شخصیت ہے اس سے ہماری دور کی رشتہ داری بھی ہے۔ اس کے بارے میں میں نے سن رکھا ہے کہ سائے دور ہو جاتے ہیں اور وہ دیواروں سے ٹکریں مار مار کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔

اس خبر نے ہمیں مزید حیرت زدہ کر دیا۔

ہم سری ناتھ کی کوششوں سے پنڈت مادھورام سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فاروق بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ آٹھ سال کا ہو گیا تھا مگر رشید کا بچپن نہ چھوڑتا تھا۔ رشید اس سے بہت پیار کرتا تھا اور اس کی ہر ضرورت کا خیال بھی رکھتا تھا۔

مادھورام ایک راجپوت خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ آگرہ میں اس کے خاندان کے کافی گھرانے آباد تھے جن میں سے اکثر بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے آگرہ میں اس خاندان کا ایک وقار اور احترام تھا۔ مادھورام بڑی خوش اخلاقی سے ملا کر اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ واقعی آسیب زدہ انسان تھا۔ سری ناتھ نے پہلے اپنا اور پھر ہم تینوں کا تعارف کرایا۔ سری ناتھ نے فاروق کے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا کیونکہ ہم نے اسے منع کر دیا تھا۔ ہم مادھورام سے اس کی تیاری کے بارے میں پوچھتے رہے۔ جب ہم نے آسیب اور ان کے دو اور تین سائے ہو جانے کے بارے میں پوچھا تو اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور غلاؤں میں گھومتے ہوئے بولا ”یہ سب ارٹلا کی کھائی ہوئی قسم کا نتیجہ ہے

کاش ہم نے اسے زعمہ رہنے دیا ہوتا۔“
”کون ارٹلا؟“ رشید نے پوچھا۔

”ارٹلا ہماری برادری کی حسین و جمیل لڑکی تھی۔“
مادھورام نے ماضی کے ورق پلٹے شروع کئے۔

”ارٹلا کا باپ اتنا امیر نہ تھا پھر بھی وہ اپنی اکلوتی بیٹی ارٹلا کا بہت ہی خیال رکھتا تھا۔ ارٹلا کو وہ

اپنی جان سے بڑھ کر چاہتا تھا۔ ارٹلا لاکھوں میں ایک تھی اس کا سر اپنا ایک نازک خیال شاعر کے تصور کی مانند تھا۔ گوری رنگت، شریقی مسکراتی ہوئی چمکدار آنکھیں کتابی چہرہ پتلی ناک، دلکش دل آویز نقوش

مناسب قد و قامت، آواز میں شائستگی اور لگاؤ تھی حسن اور رعنائی تو اس پر فخر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے چاہنے والے بے شمار تھے۔ میں بھی اس کا طلب

گار تھا۔ اس کے آنٹی حسن نے میری بھی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ میں نے اس کے حسن بلاخیز سے

سیراب ہونے کا عہد کر رکھا تھا مگر نہ جانے کیوں وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی تھی۔ وہ کسی کو

اہمیت ہی نہ دیتی یوں لگتا جیسے وہ چمک مورت ہے جس پر مردی گری اور کسی کی آہ فریاد کا اثر ہی نہیں

ہوتا ہے۔ میں کئی بار اس پر اپنی چاہت کا اظہار کر چکا تھا اس کے حسن کے قسیدے بڑھ کر اسے زعمہ کی بھر

پھولوں کی مانند رکھنے کا دعویٰ کر چکا تھا مگر ارٹلا کی نظروں میں میری کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ لگتا تھا وہ

مال و دولت اور شان و شوکت سے نفرت کرتی ہے اس کی نفرت کی وجہ ہمیں کافی دیر بعد معلوم ہوئی۔

ہمارے محلے میں مسلمانوں کا ایک ہی خاندان آباد تھا۔ نواب علی یار اس کا سربراہ تھا۔ نہایت ہی

امیر گھرانہ تھا۔ بہت بڑی حویلی نوکر چاکر زمینیں اور باغات وہ سچ جج کے نواب تھے۔ آگرہ میں ان

مسلمانوں نے ہماری غیرت کو لٹکا رہا تھا ہم بھلا کیسے یہ برداشت کر لیتے کہ ہماری دھرم کی لڑکی ایک سٹے سے شادی کر لے۔ ہماری برادری کا اشتعال میں آنا فطری تھا ہر وہ نوجوان جو ارطلا کی چاہت کا طلب گار تھا نہایت ہی غصے میں تھا۔

یہ خیر جنگ کی آگ کی مانند آگرہ میں پھیل گئی نہ صرف راجپوتوں بلکہ تمام ہندوؤں میں نفرت و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اسی رات اس امام مسجد کو قتل کر دیا گیا جس نے ارطلا کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا تھا اور ارطلا اور شہریار کا نکاح پڑھایا تھا۔ اگلی رات راجپوت برادری کی ایک خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں سب سے آگے آگے تھا۔ اس میٹنگ میں شامل ہر فرد کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ ہر فرد شہریار اور ارطلا کا خون کرنے کے درپے تھا۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کی ایسی لہر دوڑنے لگی تھی کہ اسے روکنا مشکل تھا۔ اس رات یہ طے ہوا کہ آگرہ میں مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا جائے انہیں جن جن کر مارا جائے اور سب سے پہلے نواب خاندان کو ایسا سبق سکھایا جائے کہ کوئی مسلمان آئندہ بھول کر بھی ہندو لڑکی کی طرف نہ دیکھے۔ نواب خاندان کو ہمارے انتقامی فیصلے کی بھگ لگنی تھی اس لئے شہریار اور ارطلا آگرہ چھوڑ کر سکندریہ چلے گئے۔ سکندریہ میں بھی شہریار کی جاگیر اور حویلی تھی ان دونوں نے یہ سفر اچھی رازداری سے کیا کہ کسی کو کانون کان خبر نہ ہوئی۔ اگلی رات مختل ہندو نوجوانوں نے نوابوں کی حویلی کو آگ لگا دی۔ میں نے رام لال کے ساتھ مل کر ایسی مضبوط منصوبہ بندی کی تھی کہ حویلی کا کوئی بھی فرد باہر نہ نکل سکا۔ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ اب ہمارے سینے کی آگ بھی ٹھنڈی ہو گئی۔

کا ایک اعلیٰ مقام تھا۔ ہمارے خاندان کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات تھے۔ ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے سانجھی تھے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آجاتا تھا۔

ارطلا نواب خاندان کے ایک لڑکے شہریار سے محبت کرتی تھی۔ نواب شہریار مردانہ حسن و جمال کا نمونہ تھا۔ وہ خوب رو خوش گفتار اور خوش لباس نوجوان تھا اور ہر ایک کو اپنے حسن اخلاق اور حفظ مراتب کے نظارے سے مرعوب کر دیتا تھا۔

صنف نازک کے لئے اس کی شخصیت میں عجب سی کشش تھی گویا وہ ایک ایسا مقناطیس تھا جس کی کشش سے ہر لڑکی اس کی جانب کھینچی چلی جاتی تھی۔ ہمارے دھرم کی کئی حسین اور امیر لڑکیاں اس کی دیوانی تھیں مگر وہ کسی کو نزدیک نہ آنے دیتا تھا۔ اس کی سچی ادا ہماری برادری کو بھی بھلی لگتی تھی مگر وہ ارطلا کے حسن بلا خیر کا مقابلہ نہ کر سکا۔ شہریار اور ارطلا دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے مگر وہ اتنی رازداری سے کام لے رہے تھے کہ کسی کو کانون کان خبر نہ تھی۔ ان کی محبت میں ہوس اور آلودگی نہ تھی۔

ہمیں ان کی بیکراں محبت کا علم اس وقت ہوا جب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ گیا۔ ارطلا نے اسلام قبول کر کے شہریار سے شادی کر لی اس کا اسلامی نام محض التمام رکھا گیا۔

اس خبر نے نہ صرف میرے اربابوں پر بجلی گرائی بلکہ کئی اور نوجوانوں کے اوسان بھی خلا کر دیئے۔ یہ ہماری عزت، شان اور غیرت کو مٹی میں ملانے والی بات تھی۔ اس سے قبل اس قسم کا کوئی واقعہ کم از کم ہمارے علاقے میں نہیں ہوا تھا۔

اگلے روز یہ خبر شہر بھر میں پھیل گئی کہ نوادوں کی حویلی کو اس کے کینوں سمیت جلا کر رکھ دیا گیا۔ یوں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ مسلمانوں نے بھی ہمارے کئی افراد مار ڈالے مگر پھر بھی زیادہ نقصان انہی کا ہوا۔ شہر میں پولیس اور فوجی دسے گھنٹے کرنے لگے بڑی مشکل سے حالات پر قابو پایا گیا۔ اب ہمیں چھن آ گیا تھا ہم نے اپنی رسوائی کا بدلہ لے لیا تھا۔ ہم تو بھی سمجھ رہے تھے کہ شہریار اور ارطلا بھی جل کر راکھ ہو گئے ہوتے اب ہم ان دونوں کو بھولی بھری داستان سمجھ کر یاد کرتے تھے۔ شہریار اور ارطلا ایک دوسرے کو جان سے بڑھ کر چاہتے تھے محبت کی آگ اتنی آغا فنا لگی تھی کہ انہیں کچھ سوچنے اور سمجھنے کی مہلت ہی نہ ملی کہ ان کے اس قدم سے کتنا خوفناک طوفان اٹھے گا کیسی قیامت آئے گی انہیں تو بس ایک دوسرے سے غرض تھی۔

یوں ہی آٹھ ماہ بیت گئے۔ ایک روز سکندر سے آنے والی ایک عورت نے یہ انکشاف کیا کہ شہریار اور ارطلا زندہ ہیں اور سکندر میں رہ رہے ہیں۔ اس انکشاف نے ہمیں عمامت میں جلا کر دیا۔ نفرت اور انتقام کی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ مجھے اس عورت کی بات پر یقین نہ آیا تو میں نے رام لعل اور اس کے دو ساتھیوں کو سکندر روانہ کر دیا کہ وہ اس حقیقت کا کھوج لگائیں۔ وہ دوسرے دن ہی واپس آ گئے کیونکہ اس عورت نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا۔ حیرت تھی کہ آگرہ والی حویلی جل کر خاک ہو گئی مگر شہریار اس موقع پر بھی آگرہ نہ آیا۔ لگتا تھا وہ ارطلا کی زلفوں کا اسیر ہو کر صرف اسی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ اس کی اور ارطلا کی محبت کی انتہا تھی مگر ہمارے لئے مرجانے کا مقام تھا۔

چند دنوں کی سوچ بچار کے بعد ہم نے شہریار اور ارطلا کو چالیا۔ انہیں وہم و گمان بھی نہ ہوا کہ ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ ہمارے گڑے ہوئے تپور دیکھ کر شہریار خوفزدہ ہو گیا۔ وہ ایک تھا اور ہم چار وہ ہمارا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے خوشامدانہ لہجے میں بولا ”مادھورام اب میرا اور ارطلا کا چچا چھوڑ دو۔ ارطلا اب مسلمان ہو چکی ہے اس کا اسلامی نام شمس النساء ہے یہ ہماری محبت کی انتہا ہے کہ اس نے میری خاطر اسلام قبول کر لیا ہے۔“

”تم نے ہماری توہین کی ہے شہریار میں اس محبت کو نہیں مانتا جو اپنے پیچھے بربادی اور جہاں کے نشان چھوڑ جائے۔ تم نے ہم راجپوتوں کی غیرت کو لٹکا رہے“ میں نے بھر کر کہا۔

”محبت کو تو قاتل عالم کہا گیا ہے مادھورام یہ تو ایک آفاقی جذبہ ہے۔ دنیا کا ہر مذہب محبت کا درس دیتا ہے محبت تو نفرتیں، کدورتیں اور دشمنیاں مٹاتی ہے۔“ شہریار نے مجھے قائل کرنا چاہا۔

مگر میں اس کی کوئی بات سننے کو تیار ہی نہ تھا۔ ارطلا کو رام لعل نے ایک کمرے میں بند کر دیا تھا اس کے پیچھے اور چلانے کی ہم نے پروا نہ کی۔ شہریار نے ہمارے آگے نہ ہاتھ جوڑے اور نہ ہی معافی مانگی۔ جب اس نے بات بتی نہ دیکھی تو ہمارا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی مگر ہم نے اسے زیادہ پر مقابلہ نہ کرنے دیا ہم نے جلد ہی اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔

جب ہم نے اس کمرے کا دروازہ کھولا جہاں ارطلا کو بند کیا گیا تھا تو وہ دوڑ کر شہریار کی لاش سے لپٹ گئی۔ پھر اس نے کانپتے ہاتھوں میں شہریار کا چہرہ لے لیا۔ نکا ایک اس کی ایک دلدوز پیچ فضا

آکھوں میں آنسو نہ تھے۔ وہ نفرت سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی "شہریار کا پیتا تم سے میری پامالی اور اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے گا۔" مجھے پھر حسد آ گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر زرد دار تھپڑ دے مارا اور کہا "تم زندہ رہو گی تو شہریار کی نشانی کو ختم دو گی ناں۔"

"نہیں مادھو رام بس کرو اب مجھ پر رحم کرو مجھ سے شہریار کی نشانی نہ چھینو۔" ارطلا کا لہجہ خوشامدانہ ہو گیا۔

ہم نے اس کی کسی آہ اور فریاد کا اثر نہ لیا۔ اس لئے مجھ پر دردنگی طاری ہو گئی تھی۔ میں نے گلا دبا کر اسے مار ڈالا۔

پھر ہم ارطلا کی لاش مکان کے اندر ہی چھوڑ کر بھاگ آئے۔ بعد میں اس کے محلّہ والوں نے اسے دفن کر دیا تھا۔ کئی دن تک شہریار اور ارطلا کی موت کے چرچے رہے۔ لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے رہے مگر کوئی یہ نہ جان سکا کہ میں اور رام لعل ان کے قاتل ہیں۔ آہستہ آہستہ لوگ اس قصے کو بھول گئے۔ نوابوں کی آگرہ اور سکندر والی حویلی گورنمنٹ کی ملکیت بن گئی۔

دس سال بیت گئے ہیں۔ آگرہ کے لوگ اس سانحہ کو بھول گئے ہوں گے مگر میں کوشش کے باوجود اسے نہ بھول پایا۔ ارطلا کی روح میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ میں اپنے تین سائے دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔ پھر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی فیٹی طاقت میرا گلا دبا رہی ہو تو میں بے ہوش ہو جاتا ہوں۔ میں اس کا علاج کرانے کی غرض سے جالوں اور جادو ٹوٹا کرنے والوں سے ملا ہوں مگر کہیں سے بھی فائدہ نہیں ہوتا۔

میں بلند ہوئی اور وہ ایک اجڑی ہوئی شاخ کی طرح شہریار کے اوپر گر پڑی۔ بڑی دیر بعد اسے ہوش آیا تو وہ مجھ سے اُلجھ پڑی۔ اس نے مجھے گالیاں دیں "برا بھلا کا مگر میں نے اس کی کسی بھی بات کا جواب نہ دیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ میں نے شہریار کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا اور ارطلا کو اسی کمرے میں قید کر دیا۔ رام لعل اور اس کا ایک لہانتی اس کی نگرانی کر رہے تھے۔

ایک ہفتے بعد میں اس کے سامنے گیا اور اسے کہا "ارطلا ماضی کو بھول جاؤ میرے ساتھ چلو میں اب بھی تمہارے ساتھ شادی کرنے کو تیار ہوں۔" "تم قاتل ہو میرے شہر کے شہریار کے جس

کی خاطر میں نے اپنا دھرم چھوڑ دیا۔ اب میں دوبارہ اس دھرم کی طرف لوٹ کر نہیں آؤں گی۔ میں مسلمان ہوں میرا مذہب اسلام ہے اور اسلام غنا سکھاتا ہے جھکا نہیں۔"

"ارطلا! مجھے مذہب کا قلفہ مت سمجھاؤ۔ تم میرے ساتھ لوٹ چلو تو ماضی کی تمام غلطیاں معاف کر دی جائیں گی ورنہ تمہارا حشر بھی شہریار جیسا ہی ہوگا۔"

وہ شہریار کی امانت میں خیانت نہ کرنا چاہتی تھی کہنے لگی "میری کوکھ میں شہریار کی نشانی پرورش پا رہی ہے تم سے وہ اپنے باپ کا بدلہ لے گا۔" جب وہ کسی طور نہ مانی اور چیخ چیخ کر ہمیں برا بھلا کہنے لگی تو مجھے بھی حسد آ گیا۔ میں اتنا مشتعل ہوا کہ میں نے اسے پامال کر دیا۔ جب میں اس دلدل میں گر گیا تو رام لعل کیوں پیچھے رہتا۔

ارطلا بے بسی کی حالت میں پڑی تھی مگر اس کی

بات پر سچ پا ہو جاتا۔ یوں لگتا جیسے اس میں کسی خونی درندے کی روح طول کر گئی ہے۔ سچ تو یہ تھا کہ ہم تینوں دوست اس سے خوف کھانے لگے تھے کیونکہ اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی شونیاں اور شرارتیں تو وہ بھول ہی گیا تھا۔

ایک رات رشید کی آنکھ کھلی تو فاروق اپنے بستر پر موجود نہیں تھا وہ پریشان سا ہو گیا اور اس کے انتظار میں جا گئے لگا۔ صبح سورج طلوع ہونے سے قبل فاروق لوٹ آیا۔ اس کی حالت دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ کسی تھا کو دینے والے سفر سے لوٹا ہے۔

”کہاں سے آرہے ہو فاروق؟“ رشید نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔
”قبرستان سے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”وہاں کیا کرنے گئے تھے؟“

”اپنی ماں سے ملنے گیا تھا۔“

”وہ تو عرصہ ہوا مر چکی ہے۔“

”میرے لئے وہ زندہ ہے۔“

”کیا مطلب؟“ رشید حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

”رشید اکل آپ مجھ سے زیادہ سوالات مت کریں آپ سب کچھ جانتے ہیں مگر آپ نے کبھی میری اصلیت مجھے نہیں بتائی مگر میں جان گیا ہوں کہ میں کیا ہوں؟ کون ہوں؟“

”کون ہوتم؟ کیا جانتے ہو اپنے بارے میں؟“ رشید صحت لہجے میں بولا۔

”بھئی کہ میں نواب شہریار اور شمس النساء کا بیٹا ہوں جن کو مادھورام اور رام لعل جیسے کینے لوگوں نے محبت کرنے کی سزا دی تھی۔ میں اپنی ماں کی قسم پوری

مادھورام نے بات فحش کی تو ہم تینوں دوست یہ جان گئے کہ فاروق اسی ارٹلا کا بیٹا ہے جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہم نے ادھر ادھر دیکھا فاروق وہاں سے غائب تھا۔ وہ چپکے سے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا اور ہمیں احساس تک نہ ہوا۔ ہم نے مادھو رام سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی اور وہاں لوٹ آئے مگر فاروق وہاں بھی نہ تھا۔ اس کی غیر حاضری سے ہم پریشان ہو گئے۔ رات بھی اسی عالم میں گزر گئی مگر فاروق کی کوئی خبر نہ تھی۔

اگلے روز شام ڈھلے فاروق واپس آ گیا تو ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ ہم نے اس سے بہت پوچھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا مگر اس نے ہماری بات کا معقول جواب نہ دیا۔ ہم نے فاروق میں کافی تبدیلی محسوس کی تھی۔ اب وہ نہایت ہی سنجیدہ اور خاموش خاموش رہنے لگا ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہر وقت کسی گہری سوچ میں غرق رہتا ہے۔

پہلے کے برعکس اب وہ کم ہی بے ہوش ہوتا تھا ہم اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگے۔ روز بہ روز اس کی عادات اور شکل و صورت میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ اس کے حسین چہرے پر اب کرختگی کے آثار نظر آتے آنکھوں میں وحشت کی ناچنی دکھائی دیتی۔

مادھورام اور رام لعل نے اس کی ماں اور باپ کے ساتھ بہت ظلم کیا تھا۔ مادھورام تو اس کی سزا بھگت رہا تھا رام لعل اسی شہر میں تھا میں نے اور رشید نے اس کی بھی تلاش شروع کر دی تاکہ ظلم ہو کہ وہ کس حال میں ہے۔

فاروق کے تین روزہ روز گزارتے جا رہے تھے اب وہ میرے اور رشید کے ساتھ بھی الجھنے لگا۔ بات

اس کا طریقہ واردات سمجھ میں آرہا تھا کہ اس کے پاس کون سی طاقت آگئی ہے کہ وہ اپنے باپ اور ماں کے قاتلوں کو جن جن کر مار رہا ہے۔

ایک رات ہم تینوں دوست اس کی تلاش میں اسی قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ قبرستان کا وہی مظهر تھا گھٹتے قبروں کا دردناک منظر ہمارے رونگٹے کھڑے کر رہا تھا۔ ہم محسوس النساء کی قبر کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ ابھی ہم اس کی قبر سے کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ ہمیں باتوں کی آواز سنائی دی۔ وہ فاروق کی آواز تھی وہ اپنی ماں کی قبر کے قریب بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ قبر بندھی مگر اس کی ماں کی آواز باہر آرہی تھی۔

”ماں میں نے اپنے باپ اور تمہارے قاتلوں اور ان کے خاندان والوں سے انتقام لے لیا ہے۔ میں ان لوگوں کے لئے دہشت کی علامت بن گیا ہوں۔“

”فاروق بیٹے!“ اس کی ماں محسوس النساء کی آواز اتنی واضح تھی کہ ہم نے بھی سن لی۔ وہ کہہ رہی تھی ”ابھی کچھ لوگ زندہ ہیں ان سے بھی انتقام لینا ہے میں تم سے بہت خوش ہوں تم نے میری قسم پوری کی ہے میرا مان رکھا ہے۔“

”ماں میں دنیا میں اکیلا ہوں میں تمہارے دشمنوں سے انتقام لے کر تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔“ یہ فاروق کی آواز تھی۔

”ضرور آؤ بیٹا! میں تمہاری منتظر ہوں۔ تمہارے بن مجھے بھی یقین نہیں ہے۔“ اس کی ماں کی آواز سنائی دی ہم خوفزدہ سے ہو کر لوٹ آئے۔

سری ناٹھ تو تھر تھر کاہنے لگا اور کہنے لگا ”گتا ہے فاروق مجھے بھی زندہ نہ چھوڑے گا۔“

کردوں کا لیکن آپ میرے راستے میں نہیں آئیں گے۔“ فاروق یہ کہہ کر بستر میں گھس کر سو گیا۔

اگلے روز معلوم ہوا کہ مادھورام کو کسی نے گلا دبا کر مار ڈالا ہے۔ اس کے گلے پر کسی بچے کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ مگر پولیس اس کے قاتل کا سراغ لگانے میں ناکام رہی ہے۔

رشید جان گیا تھا کہ مادھورام کو فاروق نے ہی موت سے ہمکنار کیا ہوگا مگر وہ خاموش تھا جیسے اس کی زبان کو تالا لگ گیا ہو۔

پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ ہر دو چار دن بعد مادھورام کی برادری کا کوئی نہ کوئی فرد موت کے منہ میں جانے لگا ہر ایک کی موت گلا دبانے ہی سے ہوتی تھی۔

فاروق نے رشید کے گھر آنا بھی چھوڑ دیا۔ نہ معلوم وہ دن اور راتیں کہاں گزارتا تھا۔ گلا دبا کر جان سے مار ڈالنے کی وارداتوں نے آگرہ کے ہندوؤں کی نیندیں حرام کر ڈالیں۔ پولیس والوں کی دوڑیں لگ گئیں مگر انہیں مجرم کے بارے میں ایک فیصد بھی کامیابی نہ ہو رہی تھی کسی کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ وہ کون ہے؟ پھلاوا ہے جن ہے یا بھوت۔

آج تک کوئی بھی اپنی آنکھوں سے قاتل کو نہ دیکھ پایا تھا۔ سوتے میں وہ گلا دبا کر قاتل ہو جاتا تھا۔ ہر طرف خوف پھیل گیا تھا۔

آگرہ کے بعد سکندریہ میں بھی ایسے ہی واقعات رونما ہونے لگے۔ رام لعل بھی مارا گیا تھا۔ اس کی موت بھی گلا دبانے سے ہوئی تھی۔ فاروق کو گھر سے قاتل ہوئے دو ماہ کا عرصہ بیت گیا تھا اس دوران میں ہم نے ایک بار بھی اسے نہ دیکھا تھا نہ ہی ہمیں

تھپڑے ہمیں دھکیل دھکیل کر پیچھے کی طرف ہٹا رہے تھے۔ آدمی کا غبا ہمارا راستہ روکنے کے درپے تھا اور درخت غصی غصب سے دوہرے ہو ہو کر گویا ہمیں پکڑنے کو دوڑ رہے تھے۔ فاروق قبرستان کے اندر ہی گیا تھا۔ پولیس والوں نے اسے قبرستان میں داخل ہوتے دیکھا تھا لیکن اب وہ کہیں نظر نہ آ رہا تھا۔

میں اور رشید بھی قبرستان پہنچ گئے تھے۔ پولیس والے بڑی بڑی نارچوں کو روشن کر کے اسے ڈھونڈ رہے تھے لیکن انہیں فاروق نہ ملا۔ بلا آخر وہ ناکام ہو کر لوٹ گئے۔

میں اور رشید گھر لوٹ آئے مگر رات ہم نے جاگتے ہوئے گزار دی تھی۔ ہمیں فاروق ہی کی فکر لگی ہوئی تھی۔ صبح ہوئی تو ہم پھر قبرستان پہنچے۔

ایک جھاڑی کے قریب ہمیں فاروق کا ایک جوتا ملا اسے دیکھ کر ہمیں قہقہے سی ہو گئی کہ فاروق یہیں کہیں قرب و جوار میں ہوگا۔ وہ اپنی ماں کی قبر پر ضرور آ بیٹھا۔ جب ہم اس کی ماں کی قبر کے پاس پہنچے تو اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ قبر کے صحن درمیان ایک لمبی سی لکیر نمودار ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے قبر شق ہو کر دو پارہ ملی ہو۔ پھر ہمیں یہ یقین ہو گیا کہ فاروق اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اب اسے پولیس گرفتار نہیں کر سکے گی۔ سرہانے کے قریب قبر کی لکیر نما درز سے فاروق کی قمیص کا ایک کونا باہر لٹک رہا تھا۔

دو دن بعد ہم نے پھر دیکھا تو قبر کی درزیں بند ہو چکی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ برسوں پرانی قبر ہے اب اس قبر کے کتبہ پر دو نام لکھے ہوئے ہیں۔ نواب زادی شمس النساء اور نوابزادہ فاروق۔

”ہمیں سری ناتھ وہ ایسا نہیں کرے گا۔“ رشید نے اسے تسلی دی مگر وہ مطمئن نہ ہوا اور اگلے روز آگرہ چلا گیا جہاں اس کے کچھ عزیز رہتے تھے۔

آنے والی رات کو میں اور رشید پھر قبرستان چلے گئے۔ فاروق اس رات بھی ماں کی قبر کے قریب بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔

”ماں یہ دنیا بہت ہی ظالم اور بے درد ہے۔ میں اس دنیا میں نہیں رہنا چاہتا میں تمہارے پاس آ کر رہنا چاہتا ہوں۔“

میں اور رشید اس کے پاس چلے گئے۔ وہ ہمیں دیکھ کر چمک گیا ہم اسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ فاروق کے چہرے کو دیکھ کر ہمیں اس سے خوف آنے لگا۔ لگتا تھا اس کی رگوں میں خون کی جگہ شعلے دوڑ رہے ہیں۔ سوچوں کی پر خار دادیوں نے اس کے پاؤں لپو لپا کر دیئے ہیں اور صحرائی ٹکڑیوں کی طرح جتنی ہوئی اسکی سانسوں میں آندھیاں چل رہی ہیں۔

سری ناتھ نے دوستی کا مجرم توڑ دیا اور پولیس کو بتا دیا کہ فاروق مادھو رام اور دیگر لوگوں کا قاتل ہے۔ پولیس فاروق کو گرفتار کرنے کے لئے آگئی۔

شام ڈھل چکی تھی جب پولیس والوں نے ہمارے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے رشید گیا تھا۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا اس کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی..... ”پولیس“۔

میں نے اور فاروق نے اس کی آواز سن لی فاروق پچھلے دروازے سے بھاگ نکلا۔ اس کا رخ قبرستان کی طرف تھا۔ پولیس والے اس کے پیچھے تھے میں فہریدہ بھی اسی طرف بھاگ رہے تھے۔ شہر سے باہر اندیرا پھیل چکا تھا جیر ہوا کے

نواز خان



نواز خان

کالی حویلی گوری لڑکی

اس خانوادے کی کہانی جس نے ایک علاقے میں ظلم کی انتہا کر رکھی تھی۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ”یوم حساب“ کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

اشفاق میری زمیگی میں آنے والے ان کرداروں میں سے ہے جنہیں میں آج تک بھول نہیں سکا۔ اشفاق سے میری پہلی ملاقات امرتسر کے ہی ایک تھانے میں ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ پولیس کالج میں تربیت حاصل کر رہا تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ لمبا لکڑا ہوا قد، اچھے نقش، چوڑی چھاتی اور سفید کپڑوں جیسے دانت جو مسکراتے ہوئے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ ایک ذہین اور خوش

اشفاق میرا ماتحت بن کر میرے ہی تھانے میں آیا تھا۔ بہت جلد وہ تھانے کے عملے سے مکمل مل گیا۔ چھوٹے عملے سے اس کی بہت بڑی تھی۔ لیکن جہاں تک افسروں کا تعلق ہے وہ اسے زیادہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ جس روز اشفاق نے میرے تھانے میں حاضری لگوائی امرتسر سے ڈی ایس پی صاحب کا فون آیا۔

”انکیز نو اڑا یہ جو نیا منڈا تیرے پاس آیا ہے پورا کھوٹے کا پتر ہے۔ خبیث کے دماغ میں فرض شناسی کا کیڑا کھسا ہوا ہے۔ خواہوا تیرے لئے کوئی معصیت کمزری نہ کروے ذرا دھیان رکھنا اس کا۔“

”میں نے کہا آپ بے فکر رہیں جناب ا“

ڈی ایس پی صاحب بھڑک کر بولے ”میں تو بے فکر ہوں لیکن تم بے فکر نہ ہو جانا..... بد بخت اوپر خط لکھ دیتا ہے ڈی آئی جی صاحب کو۔ ایک تھانیدار کو معطل کرا کے آیا ہے تیرے پاس۔ ڈی آئی جی سے گہرا لگا لگتا ہے اس کا۔“ ڈی ایس پی صاحب کافی دیر اشفاق کے بارے زہر اگلتے رہے۔ میں بھی زور شور سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ ویسے

اشفاق سے میری دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ اپنی ماں کی خواہش پوری کرتے ہوئے اسے ایس آئی بن چکا تھا۔ اور وردی جین کر خوش

تھانیدار دھوبی کو چھوڑتا تھا اور نہ اس کے وارثوں کو۔ روز تھانے بلا کر نکک کرتا تھا دھوبی کی جوان بیوی دو دو گھنٹے تھانے میں بیٹھی ہال کرشن کے نقش مذاق سبتی رہتی تھی۔ ایک روز دھوبی کی بوڑھی ماں نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ تھانے دار ہم سے دوسرو پیہ مانگتا ہے لیکن یہ دوسرو پیہ لے کر وہ طرم کو چھوڑے گا نہیں صرف اس کے خلاف پرچہ کاٹنے گا۔ نواز صاحب ذرا انصاف ملاحظہ فرمائیے دوسرو پیہ طرم کتلاف صرف پرچہ کاٹنے کے لئے مانگے جارہے تھے اور پرچہ بھی وہ جس میں سچائی و صوغٹنے سے نہ ملے۔ میں اس معاملے کو بہت دنوں سے برداشت کر رہا تھا لیکن اس روز میرا داغ گھوم گیا۔ میں نے ہال کرشن کو آخری بار سمجھانے کی کوشش کی اور وہ نہیں مانا تو میں نے سب کچھ ڈی آئی جی صاحب کو لکھ دیا اس کے ساتھ ہی اپنا استعفی بھی لکھ کر رکھ لیا بعد میں جو کچھ ہوا اس کا آپ کو بھی پتہ ہوگا۔

میں نے اشفاق سے پوچھا ”پولیس لائن میں آئے تمہیں کتنی دیر ہوئی ہے۔“ اس نے بتایا ”بچی کوئی آٹھ مہینے ہو گئے ہیں۔“ میں نے کہا ”سال پورا کرنے کا ارادہ ہے یا نہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا ”کیوں نہیں ہے بھانگے کے لئے تو نہیں آیا ہوں۔“

میں نے کہا ”کام تو تمہارے بھانگے والے ہیں۔“ پھر اسے سمجھاتے ہوئے کہا ”بھلے مانس زیادہ تیز بھانگنے سے انسان کبھی کبھی اونٹ سے منہ کر پڑتا ہے۔ ابھی اپنے پاؤں جماؤ راستے کی اونچ نیچ دیکھو دوسروں کا چال چلن ملاحظہ کرو پھر اگر ہمت رہے اور دوڑنا چاہو تو دوڑ لینا جس دور سے تم گزر رہے ہو میں اس سے گزر چکا ہوں میں جانتا ہوں تمہارے

دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ ڈی ایس پی صاحب جو کچھ بھی فرما رہے تھے اسے سن کر اشفاق کی قدر میری نگاہوں میں بڑھتی جا رہی تھی۔

ٹیلی فون پر گفتگو ختم ہوئی تو میں نے اشفاق کو بلالیا۔ اس نے اندر آ کر بڑا کڑک دار سلوٹ کیا اور اجازت لے کر سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی وردی صاف ستھری اور استری شدہ تھی۔ وہ کمر ہائل سیدھی رکھ کر بیٹھتا تھا اور پیشا ہوا بھی انجین شین لگتا تھا۔ میں نے اس سے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں باتوں باتوں میں میں نے پوچھا۔

”وہ شاہ آباد کے تھانیدار ہال کرشن کا کیا چکر تھا یار؟“ ہال کرشن کا نام سن کر اشفاق چونکا پھر اس نے بڑے انداز سے سر ہلایا جیسے اسے پہلے سے پتہ ہو کہ میں جلد یا بدیر اس سے یہ سوال پوچھوں گا۔ کہنے لگا۔

”نواز صاحب! ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اپنے سے بڑے ہر افسر کی عزت کریں لیکن افسر کا جرم دیکھ کر انھیں بند کر لیتا تو عزت میں شامل نہیں اور اگر کبھی عزت ہے تو میں ایسی بے عزتی سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہمارا قانون یہ کہتا ہے کہ ہم ریمائنڈ کے بغیر کسی شخص کو چھین گھٹے سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتے لیکن کیا آپ یقین کریں گے ہال کرشن نے ایک شخص کو ساڑھے تین مہینے سے حوالات میں رکھا ہوا تھا۔ نہ اس کی گرفتاری ڈالی تھی نہ اس کتلاف کوئی رپورٹ درج کی تھی۔ یہ ایک دھوبی ہے اس پر ایک زمیندار نے چوری کا الزام لگایا تھا۔ وہ چوری پکڑی بھی گئی ہے چور بھی پکڑے گئے ہیں لیکن دھوبی کی مصیبت ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کا قصور یہ تھا کہ وارثوں نے تھانیدار کو غدرانہ نہیں دیا تھا

دماغ میں قوم کی خدمت کا سودا سایا ہوا ہے لیکن خدمت کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک تو تم پولیس میں رہو دوسرے زعمہ رہو۔“

وہ مذاق کی بات کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس سے لطف بھی اٹھاتا تھا۔ میری بات سن کر مسکرانے لگا۔ میں نے کہا ”میری باتوں کا برا نہ ماننا کچھ عرصہ بعد تم یہ مان لو گے کہ میں نے اچھی نصیحت کی تھی۔“

اشفاق میرے پاس قریباً تین مہینے رہا، اس دوران میرے اور اس کے تعلقات بہت اچھے رہے۔ اس میں بہت صلاحیتیں تھیں اور جوش و خروش بھی بے پناہ تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی طرح پولیس لائن میں ٹپک گیا تو خاطر خواہ ترقی کرے گا۔ اس میں غامی بس ایک ہی تھی قانون پسند نوجوانوں کی طرح وہ بالکل ناک کی سیدھ میں چلنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ یہ کوئی سکاٹ لینڈ کی پولیس نہیں ہے یہاں کے آدمے سے زیادہ تمہارا صحیح طرح لکھ پڑھ بھی نہیں سکتے۔ اسے ان ہی تمہانیداروں، سب انسپکٹروں اور سپاہیوں کے ساتھ زعمی گزارنی ہے اس لئے وہ زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ خود کو ماحول کے مطابق ضرور ڈھال لے۔ میری ماقمتی کے دوران ایک دو مرتبہ اس کی ڈی ایس پی صاحب سے بھی جھڑپ ہوتے ہوئے رہ گئی۔ میں جانتا تھا کہ اشفاق حق پر ہے اور اس کی جگہ کوئی بھی انصاف پسند شخص ہوتا یہی کرتا لیکن بات پھر وہیں پر آ جاتی ہے آدمی کو جس ماحول میں رہنا ہو اس کے مطابق خود کو تھوڑا بہت بدلنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے اشفاق کو سمجھا بھجا کر بڑی مشکل سے یہ معاملے نالے ورنہ ممکن تھا ڈی ایس پی کا خضمہ اسے ڈسچارج

ہی کر دیتا..... چند کیسوں میں اشفاق نے بے حد سمجھداری سے میری مدد کی تھی میں نے اس کی کارکردگی کو بڑھا چاڑھا کر ڈی ایس پی صاحب سے بیان کیا اور یوں ڈی ایس پی صاحب کی بھڑکتی آگ پر ٹھنڈے پانی کے چھینے پڑ گئے۔ تین مہینے بعد میرے تھانے سے اشفاق کی ٹرانسفر ہو گئی اور وہ چوکی انچارج بنا کر برٹالہ بھیج دیا گیا۔

ان دنوں برٹالہ رائے کوٹ اور ٹھنڈہ وغیرہ کے علاقے دور دراز علاقے شمار ہوتے تھے زمین کم زر خیز تھی آبادی بھی زیادہ نہیں تھی کئی علاقوں میں تو پولیس نام کی کوئی چیز ہی نہیں پام بجاتی تھی اب انگریز گورنمنٹ کوشش کر رہی تھی کہ ان علاقوں میں قانون کی عملداری قائم کی جائے اور زیادہ سے زیادہ چوکیاں اور تھانے بنائے جائیں اشفاق کو بھی ایک ایسی ہی دور دراز چوکی میں بھیجا گیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات اس وقت نہیں آئی تھی اور اب بھی نہیں آئی کہ کم تجربہ کار ملازمین کو ایسے تجرباتی نیشنوں پر کیوں بھیج دیا جاتا ہے۔ قریباً ایک ماہ بعد مجھے یہ خبر ملی کہ اشفاق کے کسی یار دوست کو اس کا خط آیا ہے جس سے پتہ چلا ہے کہ اشفاق کا وہاں کے کسی ڈیرے سے پھڑا چل لکھا ہے اور ڈیرے کے کارندوں نے چھپ کر اشفاق پر گولی چلائی ہے جس سے اس کا ایک ہاتھ زخمی ہو گیا ہے۔ یہ اطلاع سن کر مجھے سخت ڈکھ ہوا اور اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ اشفاق کو اس چوکی میں بھیج کر سخت نا انصافی کی گئی ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ سازش اسی انسپکٹر کی وجہ سے ہوئی ہو جسے اشفاق نے معطل کر لیا تھا۔ پولیس میں ایسے کیس بہت عام ہوتے ہیں دشمنیاں چلتی ہیں گروپ بندیاں ہوتی ہیں لوگ دل میں خار

سارے گمراہوں کی مخالفت مول لے کر پھوہی زاد سے منگنی کرانی تھی اور امید تھی کہ جلد یہ شادی ہو جائے گی۔ حوالدار نے لڑکی کا نام یاسمین بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ اشفاق کو بہت چاہتی ہے۔ جب اشفاق جاندھر میں تھا اور حوالدار کے ساتھ سرکاری کوارٹر میں رہتا تھا تو وہ دو دفعہ امرتسر سے اسے چپکے چپکے لئے آئی تھی۔ جب وہ تیسری مرتبہ آئی تو اشفاق کی ٹرانسفر برنالہ ہو چکی تھی۔ وہ برنالہ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ حوالدار نے اسے سمجھایا کہ وہ دُور دراز علاقہ ہے وہاں پہنچنا آسان نہیں۔ آنے جانے میں کم از کم دو دن لگ جائیں گے یہ تمہارے حوالدار نے اسے واپس بھیجا۔ حوالدار لڑکی کی تعریفیں کرنے لگا اور کہنے لگا کہ وہ بڑی خوبصورت اور تیز دار لڑکی ہے اشفاق کی جوڑی اس سے خوب بچے گی۔ سات آٹھ روز بعد کی بات ہے جاندھر کے پولیس ہیڈ کوارٹر میں اعلیٰ افسروں کا اجلاس ہوا اس اجلاس کی صدارت انگریز ڈپٹی کمشنر کر رہا تھا۔ اس اجلاس میں وہ چار ایس ایچ او چنے جانے تھے جنہوں نے برنالہ کے اس دُور دراز علاقے میں چار تھانوں کا چارج سنبھالنا تھا۔ نجانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے رضا کارانہ طور پر اپنا نام اس چٹاؤ کے لئے پیش کر دیا۔ اجلاس کے دوران میں نے ڈپٹی صاحب سے کہا۔

”جناب آپ چاہیں تو مجھے رنگ کوٹ والے تھانے میں تعینات کر سکتے ہیں۔ رنگ کوٹ کے چند بااثر لوگ میرے جاننے والے ہیں۔ چند سال پہلے میں وہاں ایک گرفتاری کے لئے گیا تھا اور مہینہ ڈیڑھ مہینہ وہاں گزارا تھا۔“

ڈپٹی صاحب نے مجھ سے چند سوال کئے جن

رکتے ہیں۔ بدلہ لینے کے لئے قانونی جھگڑنے استعمال ہوتے ہیں۔ اب ایک نوجوان اے ایس آئی کو انچارج بنا کر دُور دراز علاقے میں پھنکوا دینا بھی تو قانونی جھگڑا ہی تھا۔ میں نے اس معاملے کی مزید سن گن لینے کی کوشش کی تو اس خط تک پہنچ گیا جو اشفاق نے اپنے ایک حوالدار دوست صفدر خان کو لکھا تھا۔ اس خط سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ جس شخص سے اشفاق کا چھٹا پڑا ہے اس کا نام بدر کا ہے اور وہ ٹھانوں کے خاندان سے ہے۔ میں برنالہ کے ٹھانوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا وہ بڑے دُور والے لوگ تھے۔ علاقے میں ان کی بے شمار زمین تھی اور وہ بڑے دھڑلے سے رہتے تھے۔

40ء کے شروع میں ایک کیس کی تفتیش میں مجھے وہاں جانا پڑا تھا اور اس وقت مجھے پتہ چلا تھا کہ اس علاقے میں ٹھانوں کا کس قدر اثر و رسوخ ہے۔ میں ایک قبائلی مجرم کو پکڑنے وہاں گیا تھا۔ اس سلسلے میں پرکاش سنگھ ٹھانہ نے میری بہت مدد کی تھی۔ ٹھانوں کے خاندان میں پرکاش سنگھ ٹھانہ سب سے بزرگ آدمی تھا اور نئی نسل اس کی بہت عزت کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ٹھانوں کے کسی آدمی کو اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ مجرم کو چھپا سکے۔ اشفاق کا خط پڑھ کر مجھے وہ سارے واقعات یاد آنے لگے اور مجھے دلی رنج ہوا کہ اشفاق جیسا نیا آدمی ٹھانوں سے متعلق جیسا ہے۔ اشفاق کے دوست حوالدار سے میں نے کافی بات چیت کی اس سے اشفاق کے بارے میں کئی معلومات حاصل ہوئیں۔ اشفاق کی رہائش جیسا کہ میں نے بتایا ہے امرتسر میں تھی وہاں قریب ہی اس کی پھوہی کا گھر تھا۔ پھوہی غریب تھی لیکن اشفاق بچپن سے اپنی پھوہی زاد کو چاہتا تھا۔ اس نے اپنے

کے میں نے تلی بخش جواب دیئے۔ ڈپٹی صاحب کے چہرے سے نظر آنے لگا کہ انہوں نے تجرباتی طور پر مجھے وہاں بھیجے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بعد ازاں یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ چند روز بعد جب تہذیبوں کا اعلان ہوا تو میرا نام رنگ کوٹ تھانے کے لئے موجود تھا۔ جالندھر کا یہ تھانہ کچھ ایسا بُرا نہیں تھا۔ میرے سارے ساتھی حیران تھے کہ میں نے رنگ کوٹ میں تہذیبی کیوں کرائی ہے۔ سب اپنے اپنے اندازے قائم کر رہے تھے کسی کا دھیان اشتقاق کی طرف نہیں کیا جو رنگ کوٹ تھانے کی ایک چوکی میں انچارج تھا اور جس نے خواخواہ اپنی جان خطرے میں ڈال رکھی تھی۔ تہذیبی کہیں نہ کہیں تو ہوتا تھی میں نے یہ سوچ کر رنگ کوٹ میں کرائی تھی کہ شاید اس طرح میں اشتقاق کی کوئی مدد کر سکوں۔

دو مہینے بعد میں رنگ کوٹ تھانے کا چارج سنبھالنے پر تالہ کھینچ گیا۔ رنگ کوٹ کا تھانہ بہت پرانا تھا اور تھانے کی عمارت اس سے بھی پرانی تھی۔ شاید بہادر شاہ ظفر کے دور کی کوئی حویلی تھی۔ جس کے ایک حصے میں لکڑی کا ایک بہت بڑا ٹال تھا اور دوسرے میں تھانہ قائم تھا۔ اس تھانے کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ فرنچیز لٹا پھوٹا تھا، چیتیں بچتی تھیں۔ دیواروں سے پلستر چھڑتا تھا۔ علیہ کاغذوں میں تو پورا تھا لیکن تھانے میں ایک آدھ سنتری یا حوالدار ہی نظر آتا تھا۔ وہ چوکی جس میں اشتقاق کی ڈیوٹی تھی تھانے سے قریب دس میل کے فاصلے پر تھی۔ کہنے کو تو یہ فاصلہ دس میل کا تھا لیکن جسے طے کرنا ہوتا تھا اسے آٹے دال کا بھاد معلوم ہو جاتا تھا۔ بہت دشوار گزار راستہ تھا، گھوڑے اور بتل گاڑی کے علاوہ کوئی تیسری سواری وہاں نہیں چلتی تھی۔ بہر حال اشتقاق کو

میرے آنے کی خبر پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اس نے رات بچھلے پھر دس میل کا فاصلہ طے کر کے صبح سویرے میرا استقبال تھانے کے دروازے پر کیا۔ اس کے ایک ہاتھ پر پٹیاں باندھی ہوئی تھیں لیکن چہرہ ہمیشہ کی طرح تروتازہ نظر آتا تھا۔ میرے یہاں آنے پر وہ بے حد خوش تھا اور یہ خوشی اس کی باتوں سے بھی جھلک رہی تھی۔ میرے ساتھ مل کر دو روز میں اس نے خستہ حال تھانے کا حلیہ بدل دیا۔ فرنچیز مرمت ہوا، دیواروں پر سفیدی ہوئی، چھتوں پر مٹی ڈالی گئی، حوالات کے ٹولے ہوئے دروازے دوبارہ کارآمد بنائے گئے اور تھانے کی پیشانی پر ٹین کا ایک بڑا سا بورڈ لگا دیا گیا جس پر لکھا گیا رنگ کوٹ تھانہ۔ ان میں سے زیادہ تر کام اشتقاق نے ہی انجام دیئے جب میں اسے اس تکلف سے منع کرتا تو وہ جھٹ کہتا ”جناب آپ افسر ہیں میں آپ پر کوئی احسان نہیں کر رہا“ اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔“

تیسرے روز شام کو اس نے مجھے اپنا پروگرام سناتے ہوئے کہا ”جناب میں نے فیصلہ کیا ہے آپ کے یہاں آنے کی خوشی میں کل ایک زبردست پارٹی ہو جائے۔ یہاں بھاڑوں کی دو ٹولیاں بہت مشہور ہیں آپس میں ان کا خوب مقابلہ چلتا ہے۔ جس محفل میں یہ مقابلہ ہو جائے اس میں لوگ ہنس ہنس کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ رنگ کوٹ کے چودھری شو بھاسکھ نے کہا ہے کہ یہ سارا پروگرام اس کی حویلی میں ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے علاقے کے معززین بھی آجائیں گے اس طرح ان سے ملاقات ہو جائے گی اور تفریح بھی رہے گی۔“

اشتقاق بڑے جوش و خروش سے باتیں کر رہا تھا لیکن میری نظریں اس کے ذہنی ہاتھ پر جمی تھیں۔

اور اس چوکی کا کیا فائدہ تھا جو یہاں بنائی گئی ہے؟“
میں نے اشفاق سے پوچھا ”کون بوڑھا تھا وہ؟“

اشفاق نے کہا ”اس کا نام سورج سنگھ ہے لیکن سب اسے بابا میدا کہتے ہیں۔ بابا میدا لوہار ہے زمینداروں کے مل پنجاہ لیاں ٹھیک کرتا ہے ان کے کنوؤں کی مرمت کرتا ہے۔ اس کے بدلے اسے فصل میا سے حصہ دیا جاتا ہے۔ بابے میدے کی ایک جوان شادی شدہ لڑکی بدروک سنگھ ٹھانہ کے قبضے میں ہے۔ وہ اسے ڈیڑھ برس سے اپنی حویلی میں رکھ کر اس سے زیادتی کر رہا ہے۔ حویلی میں ہی وہ بدروک کے دو بچوں کی ماں بھی بن چکی ہے۔ اس بات کا علم سارے گاؤں کو ہے بلکہ پورے علاقے کو ہوگا لیکن کسی نے کوشش نہیں کی کہ اس مظلوم عورت کو بدروک سنگھ کے چنگل سے نکالے نہ ہی بدروک سنگھ اسے چھوڑنے پر آمادہ ہے۔ درحقیقت یہاں ایسی باتوں کو زیادہ اہمیت ہی نہیں دی جاتی۔ چودھری، وڈیرے زمیندار اور ان کے گماشتے آئے دن ایسے کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ ظلم سہ سہہ کر لوگوں کی چڑی موٹی ہو چکی ہے اب تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عام لوگوں سے پالتو جانوروں کا سا سلوک کرنا چودھریوں اور وڈیروں کا حق ہوتا ہے۔“

میں نے کہا ”جناب اشفاق صاحب آپ کوئی نئی بات نہیں کر رہے۔ ہمارے دور درواز دیہات میں حالات اس سے بھی خراب ہیں۔ یہ سب کچھ وقت کیساتھ آہستہ آہستہ بدلے گا۔ میرے یا تمہارے بے قرار ہونے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں..... بہر حال تم بابے میدے کے متعلق بتا رہے

میں نے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔
”اشفاق! شاید تمہیں احساس نہیں کہ تم کتنے خطرناک حالات سے گزر رہے ہو..... تم نے حوالدار صفدر خان کو جو عطا لکھا تھا وہ میں نے سارا پڑھا تھا تم نے ٹھانوں سے کلر لے کر اچھا نہیں کیا۔“
وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا اس کے سفید دانت چمکنے لگے اور تھوڑی کا گڑھا کچھ اور نمایاں ہو گیا کہنے لگا۔

”نواز صاحب معافی چاہتا ہوں آپ وہ باتیں کر رہے ہیں جو میری ہونے والی بیوی کیا کرے گی آپ ایسی باتیں کریں گے تو آپ کے ماتحتوں میں کیا حوصلہ رہ جائے گا۔“

میں نے چڑ کر کہا ”اشفاق زیادہ بہادر بننے کی کوشش نہ کرو تم کچھ نہیں جانتے ہو ان لوگوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تمہیں، تمہیں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے کسی سے مشورہ کر لیتا چاہئے تھا۔“
وہ ہنس کر بولا ”نواز صاحب آپ کیسی بات

کر رہے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے جرم ہو رہا ہو اور مجھے یہ بھی پتہ نہ ہو کہ مجھے کیا کرتا ہے۔ مجرم کو پکڑنے کے بجائے میں انہروں سے مشورہ کرتے دوڑ پڑوں۔ آپ کا یہ خیال غلط ہے کہ میں جلد باز ہوں یہاں آ کر میں نے جو کچھ دیکھا ہے میں ہی جانتا ہوں اور جتنا صبر کیا ہے شاید آپ بھی نہ کر سکتے۔ اب آپ ہی بتائیے بدروک سنگھ ٹھانہ کا

ملازم کالوا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک پیار بوڑھے کے کپڑے پھاڑ رہا تھا اور اسے سرا بازار الف بچا کرنا چاہتا تھا۔ میں وردی میں تھا اور موقع پر موجود تھا اب اگر میں چپ رہتا یا آنکھ بچا کر پاس سے گزر جاتا تو پھر میرے یہاں آنے کا کیا فائدہ تھا

تھے کیا نام ہے اس کی لڑکی کا؟“

اشفاق نے کہا ”گلاب کو عرف گلاباں۔ اپنی شادی کے چار پانچ ماہ بعد کی بات ہے وہ میکے آئی ہوئی تھی۔ رات کو بدروک ٹمانہ کا ملازم خاص کالو اپنے ساتھیوں کے ساتھ بابے میدے کے مکان میں ٹھس گیا اور باپ بیٹی کو زبردستی سردار بدروک کی حویلی میں لے گیا۔ پھر بابا میدا تو چند گھنٹے بعد واپس آ گیا لیکن گلاباں اور حویلی میں ہی رہی اور اب اس بات کو ڈیڑھ برس گزر چکا ہے۔ گلاباں کا خاوند شرمندگی کے مارے منہ چھپا کر گھٹن جاچکا ہے اور بابا میدا پاگلوں کی طرح گلیوں میں پھرتا رہتا ہے۔ ہر کسی کو روک کر پوچھتا ہے ”تم سردار بدروک کی حویلی میں گئے تھے میری گلاباں کیسی ہے؟“ لوگ اس کا سوال سن کر خاموشی سے آگے بڑھ جاتے ہیں جیسے یہ کوئی غور کرنے والی بات ہی نہ ہو۔ کبھی کبھی وہ مددے سے ہانکل آؤٹ ہو جاتا ہے۔ شراب خانے میں جا کر کرنی بھر کر شراب پیتا ہے پھر کوئی لکڑی، اینٹ، پتھر یا ایسی ہی کوئی چیز اٹھا کر گاؤں کے چوراہے میں آ جاتا ہے وہ چیز لوگوں کو دکھا کر کہتا ہے ”دیکھو یہ بدروک ہے۔“ اس چیز کو زمین پر پھینک دیتا ہے اور بے تماشا ٹھوکر مارنے لگتا ہے۔ ساتھ ساتھ چپٹا رہتا ہے۔ اس روز بھی یہی ہوا تھا۔ گاؤں کے چوک میں گردوارے کے سامنے بابا میدا رو پھٹ رہا تھا۔ اوپر سے بدروک کے کچھ کارندے آ گئے۔ ان میں کالو بھی تھا۔ انہوں نے بابے میدے کو زمین پر گر کر نرمی طرح مارا چپٹا پھر اس کے کپڑے پھاڑنے لگے۔ ستر ڈھاپنے کے لئے بابا زمین پر گھڑی ہو گیا۔ وہ اسے ٹھوکر مار مار کر کھڑا ہونے پر مجبور کرنے لگے۔ مجھ سے یہ سب

کچھ برداشت نہ ہوا میں نے کالو اور اس کے ساتھیوں کا ہاتھ روکا۔ وہ مجھ سے اُلجھ پڑے۔ میں نے بھی ان میں سے ایک کی ٹھکانی کر دی۔ کالو اور اس کے ساتھی مجھے خونی نظروں سے گھورتے اور دھمکیاں دیتے ہوئے چلے گئے۔ شام کو سردار بدروک ٹمانہ نے مجھے حویلی بلالیا، وہاں کالو اور دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ بدروک ٹمانہ نے اپنی طرف سے بڑا بن کر میری اور کالو کی صلح کرا دی۔ بہر حال میں نے صاف کہہ دیا کہ میری چوٹی کی حدوں میں جہاں بھی قانون کی خلاف ورزی نظر آئے گی میں اپنا فرض ضرور ادا کروں گا۔ میری کسی سے ذاتی دشمنی نہیں، یہ قانون اور جرم کی دشمنی ہے۔۔۔۔۔ اس واقعہ کے چھ سات روز بعد میں صبح نہر سے نہا کر واپس آ رہا تھا کہ کئی کے کھیت میں سے کسی نے مجھ پر گولیاں چلائیں۔ میرے اعضاء کے مطابق دو رائفلیں تھیں۔ انہوں نے کم از کم آٹھ رائفل فائر کئے۔ ایک گولی یہاں میری کلائی سے ذرا اوپر لگی۔ میں دوڑ کر ایک کھال کے اندر لیٹ گیا اسے میں دو تین کھیت مزدوروں سے پہنچ گئے اور انہوں نے میرا حال احوال پوچھا۔ ویسے میں سمجھتا ہوں کہ حملہ آوروں نے صرف مجھے ڈرانے کے لئے فائرنگ کی تھی ورنہ وہ مجھے مارنا چاہتے تو یہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔“

میں پوری توجہ سے اشفاق کی روداد سن رہا تھا، میں نے کہا ”اچھا یہ بتاؤ سردار بدروک ٹمانہ لڑکی کے بارے کیا کہتا ہے؟“

اشفاق نے غصے سے کہا ”وہ ایک نمبر کا جھوٹا ہے جی صاف مکر جاتا ہے۔ کہتا ہے میں تو اس نام کی لڑکی کو جانتا بھی نہیں حالانکہ بچے بچے کو معلوم ہے

بہت موقع ملتا ہے۔ اس وقت بھی میں یہی شغل اختیار کرنے کے بارے سوچ رہا تھا کہ ایک گھڑ سوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا تھا نے کے دروازے پر پہنچا۔ وہ اشفاق کی چوکی کا ہیڈ کانسٹیبل تھا راستے کے گرد و غبار سے اس کا چہرہ اور لباس اٹے ہوئے تھے۔ مجھے کچھ کر وہ فوراً گھوڑے سے نیچے اتر آیا سیٹ مار کر تیزی سے بولا۔

”جناب! میں ایک اہم خبر لایا ہوں۔“

اس کا چہرہ متاثر رہا تھا کہ خبر بہت اہم ہے اور وہ سب کے سامنے سنانا نہیں چاہتا۔ میں اسے لے کر کمرے میں آ گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ہانپتے ہوئے لہجے میں بتایا ”جناب آپ کو فوراً ہماری چوکی چلنا ہوگا وہاں بڑی بگڑ ہو گئی ہے۔ ٹمنوں نے دمکی دی ہے کہ وہ چوکی کو آگ لگا دیں گے اور محلے کو قتل کر دیں گے۔“

یہ خبر بے حد پریشان کن تھی میں نے کانسٹیبل سے پوچھا ”ہوا کیا ہے؟“

وہ بولا: ”جی کوئی ڈاکے وغیرہ کا جھگڑا تھا اسی سے بات بڑھ گئی۔ مجھے تو ٹھیک طرح پہنچ نہیں کل شام بدروک ٹمنانہ کے کارندوں نے ایک سمندر پر ہمارے محلے سے ہاتھ پائی کی۔ سپاہی خدا بخش کے سر پر دوٹیاں اُتارتے والی کمری لگی جس سے اس کا سر پھٹ گیا وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ اشفاق صاحب کمری مارنے والے کو گرفتار کر کے تھانے لے آئے اس شخص کا نام مرلی دھر ہے۔ ٹمنوں نے کہا ہمارے آدمی کو چھوڑ دو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ اشفاق صاحب نے انکار کر دیا اب وہ دمکیاں دے رہے ہیں کہ چوکی کو آگ لگا دیں گے۔“

مجھے ٹمنوں پر تو ختمہ آتا ہی تھا اشفاق پر بھی

با بے میدے کی بیٹی اس کی حویلی میں ہے۔“
میں پریشانی کے عالم میں ہی کبھی کبھار سگریٹ پیا کرتا تھا میں نے اشفاق سے ایک سگریٹ لے کر سلکا چاند ایک گھرے شل لینے کے بعد کہا۔

”اشفاق! میں سمجھتا ہوں یہ چوکی تمہارے لئے بالکل مناسب نہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم یہاں سے اپنی تبدیلی کراؤ۔“ وہ مسکرایا ”تو از صاحب میں جانتا ہوں آپ یہ کیوں کہہ رہے ہیں لیکن اگر میں اس چوکی میں کام نہ کر سکتا تو پھر مجھے ساری زندگی کام نہ کر سکوں گا۔ باقی جہاں تک آپ کے مشوروں کا تعلق ہے میں ان کی قدر کرتا ہوں اور ان پر عمل بھی کروں گا۔ آپ کو مجھ سے زیادہ شکایت جلد بازی کی ہے نا؟ انشاء اللہ اب یہ جلد بازی نہیں ہوگی۔“

میرے سمجھانے بجھانے کا اشفاق پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ تاہم مجھے اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ میں نے اسے پارٹی وغیرہ کے پروگرام سے روک لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ علاقے کے چودھریوں اور وڈیروں کو چہرے پر جموٹی خوشی سجا کر اس پارٹی میں شریک ہونا پڑے۔ ظاہر ہے ہم ان چودھریوں کے بے بہا اختیارات میں کنوٹی کرنے کے لئے یہاں آئے تھے ان کا ظاہر کچھ بھی کہتا ان کا انداز ہماری طرف سے ٹھنڈا کیسے ہو سکتا تھا۔

دس بارہ روز بعد کی بات ہے دو پہر کے وقت دھوپ ٹپکی تو میں نے اپنی کرسی تھانے کے صحن میں لگوالی۔ کافی سہانا موسم تھا کوئی خاص کام بھی نہیں تھا۔ صبح صبح دو پارٹیوں میں صلح نامہ کروا کے میں فارغ ہو چکا تھا۔ فارغ وقت میں میں عموماً گاؤں کے کسی عام فرد کو بلا کر اس سے گپ شپ شروع کر دیتا تھا اس سے اپنے علاقے کے لوگوں کو سمجھنے کا

اشفاق نے کہا ”بس جی بچی خط سردار بدروک
 شک کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے بات کا جھگڑ بٹا لیا
 ہے۔“
 میں نے پوچھا ”لیکن سردار کے ہاتھ یہ کیسے
 لگا؟“

”اس ڈاکے حرا حرا دے کی حرا حر دی۔ وہ سردار
 کے خاص بچوں میں سے ایک ہے۔ میرے خط کھولنا
 تھا یہ خط اس نے چا کر سردار کو دکھا دیا۔ سردار نے
 بچوں کو اکٹھا کر لیا اور انہیں بھڑکایا کہ یہ دیکھو جو بندہ
 تم پر تھانیدار بنا کر بھیجا گیا ہے اس کے لچمن کیا
 ہیں۔ وہ پرائی بیوٹیوں سے عشق چنے لڑاتا ہے۔
 اب آپ انصاف کریں یہ میری عکیت کا خط ہے اور
 آپ نے پڑھ کر دیکھ ہی لیا ہے اس میں ایسی کون سی
 بات لکھی ہے۔ میرا یہ ذاتی خط سردار بدروک اور
 پورے گاؤں کے سامنے کیوں پہنچا؟ کیوں سب
 کے سامنے میری تذلیل کی گئی؟ میں یہاں تھانیدار
 بن کر آیا ہوں اگر میں چودھریوں سے اپنی عزت
 محفوظ نہیں رکھ سکتا تو دوسروں کی عزت کیا خاک
 بچاؤں گا۔“

میں ڈاکے سے باز پرس کرنے اس کے گھر پہنچا
 تو پتہ چلا وہ حویلی میں ہے۔ میں حویلی چلا گیا۔ وہاں
 محفل جمی ہوئی تھی میں نے ڈاکے سے بات کرنی
 چاہی تو سردار بدروک شک خود بچ میں کود پڑا۔ سردار
 سے ٹوٹو میں میں ہوئی۔ اس نے مجھ پر لوفر پن کا
 الزام لگایا تو میں بھی چپ نہ رہ سکا۔ میں نے کہا
 ”لوفر اور بے حیائی کا پتہ تو اس وقت چلے گا جب
 با بے میدے کی کشیدہ بنی برآمد ہوگی اور وہ عدالت
 میں بتائے گی کہ اب تک وہ کس کے ظلم سہتی رہی
 ہے۔“ میں اور بھی بہت کچھ کہہ سکتا تھا اور میں جو کچھ

آ رہا تھا۔ میرے بار بار سمجھانے کے باوجود وہ
 حماقت سے باز نہیں آیا تھا۔ وہ ایک نادان بچے کی
 طرح ثنائوں کے بجائے ہوئے جال میں پھنستا
 جا رہا تھا۔ میں نے اسی وقت ضروری عملے کو ساتھ لیا
 اور ہم گھوڑوں پر سوار چوکی روٹک کی طرف روانہ
 ہو گئے۔ وسط علاقہ اونچی نیچی زمین اور دشوار راستہ
 تھا۔ دس میل کا سفر ہم قریب آتین گھنٹے میں طے کر کے
 شام کے وقت روٹک پہنچے۔ سورج اس وقت دُور
 ایک بڑے سرخ قمال کی طرح سرسوں کے کیتوں
 میں چھپ رہا تھا۔ پورے گاؤں پر مُردنی سی طاری
 تھی جیسے کوئی طوفان آنے والا ہو۔ ہم سیدھے چوکی
 پر پہنچے وہاں اشفاق اور اس کا عملہ موجود تھا۔ سب
 کے چہرے تنے ہوئے تھے۔ اشفاق مجھے لے کر
 ایک چھوٹے سے کمرے میں آ گیا۔

میں نے اسے کڑی نظروں سے گھور کر پوچھا
 ”ہاں کیا بات ہوئی ہے؟“
 وہ بولا ”آپ مجھے تو قصور وار سمجھتے ہیں بہتر ہے
 ثنائوں سے ہی پوچھ لیں۔“
 میں نے جھڑک کر کہا ”یہ چنیں کرنے کا وقت
 نہیں ہے جو بات ہوئی ہے وہ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔“
 اشفاق نے ایک خط میرے سامنے رکھ دیا۔
 میں نے پوچھا ”یہ کیا ہے؟“
 وہ بولا ”پڑھ کر دیکھ لیں۔“

میں نے پڑھا یہ دس پندرہ سطروں کا مختصر سا خط
 تھا۔ لکھنے والی نے اپنا نام نہیں لکھا تھا۔ بس خط کے
 آخر میں تمہاری لکھ دیا تھا۔ اشفاق کے بتائے بغیر
 ہی میں سمجھ گیا کہ یہ اس کی عکیت یا سین کا خط ہے۔
 عام سا خط تھا دیا ہی خط جیسا ایک پیار کرنے والی
 اپنے محبوب کو لکھ سکتی ہے۔

کے مالک ہوتے۔ انہیں سب پتہ ہے کہاں جوش دکھاتا ہے اور کہاں کچی مار دانی ہے۔

میں نے اشفاق سے کہا ”دیکھو اشفاق یہ کہات جتنی پرانی ہے اتنی ہی بچی ہے کہ دریا میں رہ کر گھر چھ سے بھر نہیں رکھنا چاہئے۔ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ بالکل الٹ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم اس طرح مجھے کے لئے کوئی نیک نامی کماؤ گے۔“

اشفاق نے لاپرواہی سے کہا ”نواز صاحب جب آپ ایسی بات کرتے ہیں تو مجھے افسوس ہوتا ہے کیونکہ میں آپ کو دوسرے پولیس والوں سے مختلف سمجھتا ہوں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں جموٹا ہوں اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر میں کسی ٹمائے ٹھا کر رائے یا چودھری سے کیوں ڈروں؟ کیوں اپنی گردن جھکا کر رکھوں اور قانون کھنکوں سے نظر بچا کر گزر جاؤں؟۔ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔ زیادہ سے زیادہ میری بچی اتر جائے گی میری جان چلی جائے گی لیکن میں پیچھے نہیں ہٹوں گا میرے دل میں جو تھوڑا بہت خوف تھا اب اللہ کے فضل سے وہ بھی دور ہو گیا ہے۔ میں اب لمالوں کو بتاؤں گا کہ قانون سے کیسے ٹکری جاتی ہے۔ آپ دیکھ لیتا اب یا ان کی خرمستیاں رہیں گی یا میں رہوں گا۔“

جوش سے اشفاق کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے اس کی دلیری نے اور بھی پریشان کر دیا۔ اٹھنے میں اشفاق کا ایک بھر چوکی آ گیا اس نے علیحدگی میں جا کر اشفاق کو کوئی اطلاع دی۔ اشفاق نے آ کر مجھے بتایا کہ سردار بدروک شہر سے واپس آ گیا ہے۔ وہ اس وقت حویلی میں ہے اور وہاں کوئی کچھڑی پک رہی ہے۔

میں نے اشفاق کو سمجھا بجا کر کچھ شٹا کیا اور

کہتا اس میں سے کسی بات کا جواب سردار بدروک کے پاس نہیں تھا اس لئے ڈاکے سے بات کے بغیر واپس آ گیا۔ اسی روز شام کو میری چوکی کے چار سپاہی کھانا کھانے گاؤں کے مندور پر گئے تو لمالوں کے کارندے وہاں آ گئے انہوں نے پیچھے چھاڑی تو لڑائی ہو گئی۔ ایک شخص مرلی دھر نے مندور کی آہنی سنج سپاہی خدا بخش کے سر میں ماری وہ دھم کھا کر گر گیا میرے ایک سپاہی کے پاس رائفل تھی اس نے ہوا میں فائرنگ کی تو بدروک سنگھ کے کارندے بھاگ گئے۔ سپاہی بے ہوش خدا بخش کو اٹھا کر تھانے لائے میں نے جا کر مرلی دھر کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا وہ اس وقت حوالات میں ہے۔ سردار بدروک سنگھ خود تو برتالہ گیا ہوا ہے اس کے کارندے کالو کے ساتھ دو تین دفعہ میرے پاس آ چکے ہیں۔ وہ دھمکیاں دے رہے ہیں کہ میں مرلی دھر کو چھوڑ دوں ورنہ وہ زبردستی چھڑا لیں گے۔ صبح ایک خبر نے آ کر مجھے بتایا کہ وہ چوکی کو آگ لگانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔“

اشفاق کی زبانی مجھے یہ سن کر قدرے مطمئن ہوا کہ سردار بدروک گاؤں میں نہیں ہے اور نہ ہی اس نے چوکی پر چڑھائی کرنے کی دھمکی دی ہے۔ یہ سب کچھ اس کے کارندے کر رہے تھے۔ ان کی باتوں کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی کیونکہ میں جانتا تھا وہ بدروک سنگھ کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کریں گے صرف تریاں لگائیں گے اور بدروک سنگھ ایسا احمق نہیں تھا کہ وہ اپنے کارندوں کو چوکی پر چڑھائی کرنے کی اجازت دے کر پولیس سے براہ راست ٹکرائے لیتا۔ یہ بڑے گہرے اور فخرے لوگ تھے۔ فخرے نہ ہوتے تو سردار نہ کہلاتے اور نہ اتنی زمینوں

اسے سختی سے ہدایت کی کہ وہ میری اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ اس کے بعد میں فوراً سردار بدروک سنگھ سے ملنے حویلی روانہ ہوا یہ حویلی گاؤں کے صحن وسط میں واقع تھی۔

حویلی کے چاروں طرف باغ تھا۔ حویلی کی بیرونی دیواریں کافی اونچی بنائی گئی تھیں۔ میں پہلے بھی اس حویلی میں آچکا تھا اس وقت سردار بدروک سنگھ کا باپ پرکاش سنگھ زندہ تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے اس نے ایک مجرم کی گرفتاری میں میری مدد کی تھی۔

حویلی کے بڑے دروازے پر دو مسلح پھریداروں نے میرا استقبال کیا۔ نظروں ہی نظروں میں میری جامہ تلاشی لی اور مجھے لے کر سردار بدروک کی بیشک کی طرف چل دیے۔ یہ ایک بہت بڑی بیشک تھی سننے اور پرانے اسلحے سے سجی ہوئی تھی۔ دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں تھیں جن میں ٹرانوں کے بھوری آنکھوں والے سرخ و سپید بزرگ نظر آ رہے تھے۔ اس سارے خاندان کے آنکھیں بھوری اور چہرے زعب دار تھے۔ میں بیشک میں پہنچا تو سردار بدروک گاؤں کے سے ٹیک لگائے ایک بڑی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پہچان لیا اور اٹھ کر مصافحہ کیا۔ اس کے کارندے اور دوسرے حاضرین گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں میرا وزن اور قد کاٹھ پرکھ رہے ہوں۔ میں نے اپنا تعارف کرانا چاہا تو بدروک سنگھ نے مسکرا کر کہا۔

”میں تم کو جانتا ہوں تمنایدار صاحب تم بابو جی کے پاس چار پانچ ہفتے رہ کر گئے تھے مجھے سب یاد ہے۔ میرا خیال ہے..... آج کل تم رنگ کوٹ کے

تھانے میں آ گئے ہو۔“

میں نے کہا ”سردار بدروک تمہاری اطلاع بالکل صحیح ہے۔“

رہی گفتگو کے بعد سردار بدروک نے سب کو بیشک سے باہر بھیج دیا میں اور بدروک اکیلے رہ گئے۔ سردار بدروک نے مونچھوں کو مل دے کر کہا۔ ”کیا بات ہے تمنایدار یہ لوٹنا تمہارے قابو میں نہیں ہے اسے کچھ سمجھاؤ کہ محل کو ہاتھ مارے ابھی اس کی ماں کو اس کی ضرورت ہوگی۔“

سردار بدروک کے دھمکے سے لہجے میں بے پناہ سفاکی چھپی ہوئی تھی میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ میں جانتا تھا سردار بدروک وہ کچھ کر سکتا ہے جس کا اشفاق نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ چار سال پہلے یہاں اپنے قیام کے دوران میں نے ٹرانوں کی دہشت گردی کے بے مثال واقعات دیکھے تھے۔ میں نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا۔

”سردار بدروک! زیادتی تو دونوں طرف سے ہوئی ہے۔ تمہارے آدمیوں کو باوردی سپاہیوں پر حملہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

بدروک سنگھ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ”باوردی کی بات ابھی کی ہے تم نے۔ اب باوردی پولیس والے ہماری عزت اُتار کر ہاتھ میں پکڑا دیں تو ہم خاموش رہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے جان لی!“

میں نے محسوس کیا کہ بدروک سنگھ کے لہجے میں بے شمار عین دھمکیاں چھپی ہوئی ہیں۔ اور ممکن ہے ابھی تھوڑی دیر میں کوئی سخت ناخوشگوار واقعہ پیش آ جائے۔ میں نے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لا کر کہا۔

”سردار بدروک! تم نے بھی تو جوانی گزاری

بدرو کا ایک عکین جرم کا اقرار کر رہا تھا۔ بہر حال پہلے فھرے کے بعد اس نے جو کچھ کہا اس سے وہ بھر بات پر پردہ ڈال گیا۔ کہنے لگا ”مگر نہ میں نے اس لڑکی کو اغوا کیا ہے اور نہ میری حویلی میں اس سے کوئی زیادتی شیادی ہوئی ہے۔ اگر کسی نے تمہیں یہ بتایا ہے تو بالکل غلط بتایا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ گلاباں کا اپنے خاوند گرو سنگھ سے لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ یہ اپنے باپ کی کچھ زیادہ لاڈلی تھی دوسرے دن جا کر سینکے بیٹھ جاتی تھی۔ اس بیچارے کو منامنا کر لانا پڑتا تھا۔ آخر گرو سنگھ نے گلاباں کو منع کر دیا کہ وہ آئندہ اپنے باپ کے گھر نہیں جائے گی۔ ورنہ ان کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔ گلاباں اس دھمکی کے بعد ٹھیک ہو گئی۔ کچھ دن بعد گرو سنگھ نے برنالہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ شہر میں کام کر کے اپنی مالی حالت ٹھیک کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ گلاباں کو ماں باپ کے گھر میں بڑا سکھ ملا ہے وہ اسے اپنے گھر میں بھی سکھی رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ گلاباں کو اپنے ساتھ برنالہ نہیں لے جا سکتا تھا نہ ہی وہ چاہتا تھا کہ گلاباں اپنے سینکے میں رہے۔ سوچ سوچ کر اس نے مجھ سے ذکر کیا۔ وہ ہمارے خاندان کا پرانا نوکر ہے۔ اس کے باپ کی ساری عمر بھی ہماری حویلی میں گزری تھی۔ ایسے جدی پشتی نوکروں کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ اگر وہ چاہے تو وہ گلاباں کو ہماری حویلی میں چھوڑ جائے۔ یہاں وہ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹا دیا کرے گی اور ویسے بھی حفاظت سے رہے گی۔ وہ خوش ہو گیا۔ بس اتنی سی بات ہے جس کا کچھ لوگوں نے بھگلو بتا رکھا ہے۔ پیٹھ پیچھے بات کرنا کوئی بہادری نہیں ہوتی جان جی کوئی کھوتے کا پتر میرے منہ پر یہ بات کرے تو میں

ہے۔ اٹھتی عمر ہو تو بڑا جوش دلولہ ہوتا ہے آدمی کام پہلے کرتا ہے سوچتا بعد میں ہے۔ اتفاق بھی بچہ ہے ابھی اس کام کا اسے کوئی تجربہ نہیں۔ میں نے اسے سمجھایا بجھایا ہے وہ ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے بندے کو چھوڑ دے گا تم بھی ذرا اپنے بندوں کو بُرا بھلا کہہ دیتا۔ کچھ بھی ہے عام لوگوں کے سامنے تو وردی کا قہوڑا بہت احترام ہوتا چاہئے۔“

بدرو کا ہٹ دھرمی سے بولا ”میرے بندوں نے کیا کیا ہے جو میں انہیں بُرا بھلا کہوں..... باقی..... اگر تمہارا حکم ہے تو ابھی اُلٹا لٹکا کر ان کی چڑیاں اتار دیتا ہوں۔“

میں نے بدرو کا کے طرز یہ لہجے کو بہت مشکل سے برداشت کیا اور اپنے چہرے کی مسکراہٹ برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ کچھ دیر کی بے تکلف گفتگو کے بعد میں نے بات جیت کا رخ بابے میدے اور اس کے پاگل پن کی طرف موڑ دیا۔ بدرو کا سنگھ تاڑ گیا کہ میں اس سے اصل حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ بولا۔

”تم کپے تھانیدار ہو جان جی..... بات پوچھنے کا ڈھنگ جانتے ہو۔ بہر حال میں تمہیں بتاؤں گا لیکن ابھی نہیں پہلے کھانا کھانا ہوگا۔“

لٹانوں کی حویلی میں کھانا بڑا شاندار ہوتا تھا۔ ہر کھانے پر دعوت کا گمان ہوتا تھا۔ کھانا وغیرہ کھا کر ہم ایک علیحدہ کمرے میں جا بیٹھے۔ سردار بدرو کا نے اوپر تلے کئی ڈکار لینے کے بعد کہا۔

”جان جی میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا۔ سچی بات یہ ہے کہ بابے میدے کی لڑکی میری ہی حویلی میں ہے۔“ اس کا قہر میرے سر پر بم کا دھماکہ ثابت ہوا۔ کتنی آسانی اور کتنے اعتماد سے

میں نے پوچھا ”اب کرونگھ کہاں ہے؟“
وہ بولی ”معلوم نہیں شہر کام کرنے گئے ہوئے ہیں۔“

”اس نے خود تمہیں یہاں چھوڑا تھا؟“
”جی ہاں۔“

”تم اپنی مرضی سے یہاں رہ رہی ہو؟“
”جی ہاں۔“

”کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟“
”جی نہیں۔“

”تمہارا باپ گلیوں میں تمہیں ڈھونڈتا پھرتا ہے اس سے ملنا نہیں چاہتی ہو؟“

تھوڑی دیر تا سے کی چادر لرزتی رہی پھر آواز آئی ”نہیں میرے بچے کا حکم نہیں ہے۔“

میں نے ذرا آگے کوچک کر سرگوشی میں کہا ”بی بی میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ اگر کوئی بھی مسئلہ ہے تو مجھے بتا دو میں یہاں تمہاری مدد کے لئے آیا ہوں۔“

تا سے کی چادر میں جنبش پیدا ہوئی ایک خوبصورت گندمی چہرہ میری طرف گھوما ستواں ناک

میں چاندی کا کوکا چمک رہا تھا۔ دو حیران آنکھوں نے میری طرف دیکھا جیسے پتھر ہی نہ ہو پولیس کس کو کہتے ہیں اور پولیس والے کیسے ہوتے ہیں۔ یہ

حیرانی ٹھیک ہی تھی اس علاقے تک پولیس پہنچی ہی کہاں تھی۔ جو کچھ تھے سردار تھے اور چودھری تھے۔

میں نے کہا ”چپ کیوں ہو بتاؤ..... ڈرنے کی ضرورت نہیں؟“

اس نے چہرہ پھر گھونگھٹ میں چھپا لیا اور زور سے دائیں بائیں سر ہلا کر بولی ”نہیں مجھے یہاں کوئی

تنگی نہیں ہے پتھر نہیں آپ ایسی باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

اسے جواب بھی ڈوں۔ گرو جانتا ہے گلاباں یہاں اپنی اور اپنے بچے کی مرضی سے رہ رہی ہے۔ اگر تم چاہو تو میں اسے تمہارے منہ پر کرا سکتا ہوں۔“

میں نے کہا ”اور وہ کرونگھ اب کہاں ہے؟“
بدروک سنگھ بولا: ”اگر تم میں ہی کہیں ہے سنا ہے آئے کی کسی مل میں کام کرتا ہے۔“

میں نے پوچھا: ”اب وہ آتا کیوں نہیں؟“
بدروک نے کہا ”جان جی یہ اس سے پوچھو کہ

کیوں نہیں آتا۔ میرا خیال ہے وہ منہ میں آیا ہوا ہے سوچتا ہے کہ اسی وقت گاؤں جائے گا جب جب

میں چار پیسے ہوں گے۔ بدروک کی بات کچھ کچھ دل کو لگتی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا ”اور سردار جی یہ

جڑواں بچے کس کے ہیں؟“
وہ سنجیدگی سے بولا ”بچوں کے باپ کے ہیں

اور کس کے ہیں۔“ پھر تھوڑے سا کر کہنے لگا ”میرا خیال ہے تمہارا بھی تیری تکی نہیں ہوئی ہے۔ پھر چائیں

بلاتا ہوں اس کو میرے روکنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد ایک عورت اس

کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اس نے تا سے کی بڑی سی چادر میں منہ سر لپیٹ رکھا تھا۔ گو میں دو تین ماہ کا

بچہ رہی رہیں کر رہا تھا۔ وہ اندر آ کر موڑھے پر بیٹھ گئی۔ بدروک سنگھ بے تکلفی سے بولا۔

”لے لے پوچھ لے اس سے جو پوچھتا ہے۔“ اور خود باہر چلا گیا۔

میں چند لمبے خاموش بیٹھا رہا پھر عورت سے پوچھا ”تمہارا نام۔“

”گلاباں۔“ اس نے جھجک کر کہا۔
”تمہارے بچے کا نام کرونگھ ہے؟“ چند لمبے

بعد اس نے اقرار میں سر ہلادیا۔

اشفاق کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ لٹی میں سر ہلا کر بولا ”ہرگز نہیں بالکل غلط یہ بیان اگر گلاباں نے دیا ہے تو جان کے خوف سے دیا ہے۔“

میں نے کہا ”اگر جان کے خوف سے وہ یہی بیان عدالت میں دے ڈالے تو ٹوکیا کر لے گا؟“ وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے کہا ”بھلے مانس پتھر سے سر چھوڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہاں کوئی تجھے ٹھانوں کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ سب کو خوف کا سانپ سونگھا ہوا ہے۔ اگر ٹوک کچھ جاننا ہی چاہتا ہے تو کچھ میرے کمرے میں آکر دیکھ لے۔ وہ امرتسری کسی قلمور لٹل میں کام کرتا ہے۔ میں اس کا کھوج لگواتا ہوں وہی بدروک سنگھ کے بیان کی تصدیق کر سکتا ہے۔“

ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ برآمدے میں لاشی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ کوئی ضعیف شخص کھانست اور لاشی ٹیکتا آ رہا تھا۔ اشفاق نے کہا۔

”یہ بابا میدہ آ رہا ہے وہ اکثر گھومتا ہوا آ جاتا ہے۔“ چند لمحے بعد ایک بوڑھا سا کھنجر بھرتا لاشی لاشی اندر داخل ہوا۔ اس کا لباس میلہ پچھلا تھا لیکن وہ دیکھنے میں بالکل ہوش مند نظر آتا تھا۔ شاید پاگل پن کا دورہ اس پر کبھی بھاری پڑتا تھا۔ وہ سلام کر کے اطمینان سے ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ رسی تعارف کے بعد میں نے بابے میدے سے پوچھا ”ایک بات بتاؤ بابا تم کہتے ہو کہ تمہاری بیٹی کو سردار بدروک نے اغوا کر لیا ہے جب کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے پتی کی مرضی سے وہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ تم میاں بیوی نے بیٹی کے گھر میں لڑائی ڈال رکھی تھی جس کی وجہ سے تمہارے داماد نے تم سے قطع تعلق کر لیا تھا اس لئے شہر جاتے جاتے وہ

میں نے چند سوال اور کئے جن کے گلاباں نے مختصر جواب دیئے۔ اتنے میں سردار بدروک اندر آ گیا سوال جواب کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

بدروک سنگھ کی حویلی سے میں کئی الجھنیں لے کر واپس آیا۔ جس وقت میں چوکی پہنچا رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ جاتے ساتھ ہی میں نے اشفاق کو حکم دیا کہ وہ حوالاتی کو چھوڑ دے۔ اشفاق نے پس و پیش سے کام لینا چاہا لیکن میں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ حوالاتی چھوٹ گیا تو میں اشفاق کو لے کر دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اب اس کا یہاں رہنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ بہتر ہے وہ ایک دو مہینے کی چھٹی لے لے اور پھر تبدیلی کروالے۔

وہ دو ٹوک الفاظ میں بولا ”یہ نہیں ہو سکتا نواز صاحب۔ ٹسل ہو گئی ہے تو ہو گئی ہے۔ جب تک میں اس چوکی پر ہوں نہ چھٹی لوں گا اور نہ تبدیلی کرواؤں گا۔“

مجھے اس پر ہنس تو بہت آیا لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ میں نے کہا ”اشفاق تو اپنی ہمت سے بڑھ کر بات کر رہا ہے۔ تجھے یہاں کے حالات کا کچھ پتہ نہیں نہ ہی تجھے ابھی قنیتش کرنا آتی ہے۔ قنیتش کرتے ہوئے ہر پہلو سامنے رکھنا ہوتا ہے۔“

تو جس لڑکی کو منو یہ کہہ رہا ہے ہو سکتا ہے وہ اپنی مرضی سے ٹھانوں کی حویلی میں ہو۔ کیا تو اس سے ملا ہے؟“

وہ بولا ”نہیں۔“

میں نے کہا ”میں مل کے آ رہا ہوں اور اس نے بیان دیا ہے کہ اس کا پتی خود اسے حویلی میں چھوڑ کر گیا ہے۔“

بیوی کو گھٹاؤں کی حویلی میں ٹھہرا گیا۔“

بابا عجیب سے اعزاز میں ہنسنے لگا اور اس کھڑی مجھے محسوس ہوا کہ باپے کا دماغ واقعی کچھ ہلا ہوا ہے۔ وہ میری آنکھوں میں جھانک کر بولا ”پتہ جی جہاں گھر دانے ادھان دے کھلے وی سیانے۔ غریب کی بات کون سنتا ہے۔ اپنے داماد سے میرا جھگڑا ضرور تھا لیکن ایسے چھوٹے موٹے جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔ میرا داماد پاگل نہیں تھا کہ اپنی نئی ٹیلی فنی کو چپہ پھاڑ کرنے والے دردندوں کی حویلی میں چھوڑ جاتا۔ وہ کوئی پاگل تھا بھلا اچھا خاصا سیانا بندہ تھا۔ اب پاگل ہو گیا ہو تو پتہ نہیں۔ رب جانے منہ چھپا کر کہاں چلا گیا ہے بھی شکل بھی دکھائے گا کہ نہیں۔“ بوڑھا ایک دم آبدیدہ ہو گیا۔ پھر اٹھ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے چوکی کے برآمدے میں اس کی سسکیاں سنیں۔ وہ ایک میڈ کا فیصل سے کچھ پوچھ رہا تھا ”تم سردار بدروک سنگھ کی حویلی میں گئے تھے..... میری گلاہاں کیسی ہے؟“ رنگ کٹ کے تھانے واپس پہنچنے ہی میں نے اپنے ایک ہوشیار حوالدار کو اس کام پر لگا دیا کہ وہ امرتسر جائے اور وہاں آنے کی ل میں کام کرنے والے گرو سنگھ نامی شخص کو ڈھونڈے۔ میں نے حوالدار کو گرو سنگھ کی ایک تصویر بھی دے دی۔ یہ تصویر مجھے بابے میدے کی بیوی سے حاصل ہوئی تھی۔ اس تصویر میں گرو سنگھ کے ساتھ اس کی خوبرو بیوی گلاہاں بھی تھی۔

حوالدار نے میری توقع سے زیادہ تیزی دکھائی اور صرف پانچ روز بعد واپس آ کر مجھے اطلاع دی کہ گرو سنگھ کا سراغ مل گیا ہے۔ وہ پران فلورل میں بطور اسٹور کیپر ملازم ہے اور اپنے ایک دوست کی

کھولی میں رہتا ہے۔ اس کی کھولی کا مکمل پتہ بھی حوالدار کے پاس تھا۔ میں اس کارکردگی پر حوالدار سے خوش ہوا۔ اب میری خواہش تھی کہ پہلی فرصت میں اس شخص سے ملاقات کروں۔ چند روز بعد مجھے ضلع جالندھر جانا پڑا تو میں نے وہاں سے امرتسر کا رخ کر لیا۔ دوپہر کے بعد میں امرتسر پہنچ گیا۔ میں سادہ لباس میں تھا۔ یہ بھی ظاہر کرتا نہیں چاہتا تھا کہ خاص طور پر گرو سنگھ سے ملنے آیا ہوں۔ میں یونہی فلورل کے آس پاس منزلانے لگا۔ مل میں چھٹی ہوئی اور میں غور سے چروں کو دیکھنے لگا۔ جلد ہی مجھے گرو سنگھ نظر آیا وہ ایک دوست کی بانہوں میں بانٹیں ڈالے باتیں کرتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے اسے روک کر کہا ”تمہارا نام گرو سنگھ تو نہیں؟“

وہ ذرا سا چونکا پھر سنبھل کر بولا ”ہاں کیا کام ہے آپ کو؟“

میں نے کہا ”تم برنالہ میں روٹک گاؤں کے رہنے والے ہوتا؟“ اس نے ایک بار پھر ہاں میں جواب دیا۔ میں نے کہا ”میرا نام نواز ہے روٹک میں بابے میدے کا بڑا بیٹا جو پچھلے سال نہر میں ڈوب گیا تھا میرا یار بلی تھا۔ ایک دفعہ روٹک گیا تو بابے میدے کے گھر تمہیں دیکھا تھا۔ تمہاری شادی بابے کی بیٹی سے ہوئی تھی نا؟“ وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ مجھ سے مل کر اسے کوئی خاص مسرت نہیں ہوئی تھی لیکن میں اس کا پیچھا چھوڑنے والا کہاں تھا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور بات سے بات نکالنے لگا۔ مجبوراً گرو سنگھ کو مجھے جانے کی دعوت دینا پڑی۔ ایک فٹ پاتھنے کی شال پر ہم کھڑی کے سٹولوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے گرو سنگھ سے گھریلو باتیں شروع کرویں۔ جلد ہی میں اسے اپنے ڈھب

تو پھر عملی قدم اٹھاؤں۔

چار پانچ روز کی بات ہے میں اپنے رنگ کوٹ کے تھانے میں موجود تھا۔ رات قریباً دس بجے کا وقت تھا، سردی بہت زیادہ تھی۔ میری رہائش تھانے کے اندر ہی تھی پرانی طرز کا اونچی چھت والا وسیع و عریض کمرہ تھا۔ ایک کونے میں نائک چندری اینٹوں کا بنا ہوا آئینہ تھا۔ آئینہ ان کے بغیر ایسے کمرے بہت ٹھنڈے رہتے ہیں۔ میں نے چار پائی آئینہ ان کے پاس ہی بچھا رکھی تھی۔ ابھی میں اونٹھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے لحاف سے نکل کر دروازہ کھولا سامنے اشفاق کھڑا تھا۔ وہ وردی میں تھا اس کے ساتھ ایک دوسرا شخص تھا اس شخص نے کمر لپیٹ رکھا تھا، ہاتھوں میں جھکڑی تھی۔ جھکڑی کی زنجیر کا سرا اشفاق کے ہاتھ میں تھا۔ کمر لپٹنے والے کا چہرہ روشنی میں آیا تو میں بُری طرح چونک گیا۔ وہ گردنک تھا۔ گردنک بھی مجھے پہچان کر حیران رہ گیا وہ حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی میری وردی کو دیکھتا تھا۔

اشفاق بولا۔ ”یہ سردار بدرک کے جرم کا ثبوت ہے لو اواز صاحب۔“

وہ گردنک کو کھینچ کر اندر لے آیا۔ میں نے دیکھا گردنک کے چہرے پر چونوں کے نشان تھے۔ لگتا تھا اشفاق نے اس کی اچھی خاصی ٹھکانی کی ہے..... میں جلدی ہی معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ اشفاق کو کسی طرح گردنک کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا تھا۔ اس نے گردنک کو جا پکڑا جو کام میں اپنے طریقے سے کرنا چاہتا تھا۔ وہ اشفاق نے اپنے طریقے سے کر لیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا اشفاق کو گردنک کا پتہ بتانے والا میرا بڑا بولا حوالہ داری تھا۔ اسے اس بات

پر لے آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ کام کرنے کے لیے شہر آیا ہوا ہے۔ ساس سُسر سے اس کا جھگڑا چل رہا تھا اس لئے بیوی کو اس نے ٹھانوں کی حویلی میں سردارنی کے پاس چھوڑ دیا ہے۔ وہ وہاں بڑے سکون سے رہتی ہے۔ جلد ہی وہ اپنا کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پھر بیوی کو یہاں شہر میں لے آئے گا۔

گردنک کافی دیر بولتا رہا اس نے جو باتیں کیں ان سے بدرک سنگھ کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی اور گاؤں والوں کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ باجے میدے کی بیٹی کو زبردستی حویلی میں رکھا گیا ہے اور اس کا شوہر شرم سے منہ چھپا کر کہیں نکل گیا ہے۔ میں نے گردنک سے اور بھی کئی سوال کئے جن کے اس نے بڑے مناسب جواب دیئے لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی اس پر مجھے کچھ شبہ نہ ہونے لگا جیسے وہ بناوٹی باتیں کر رہا ہے۔ میرے شک کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی شاید کبھی کبھی ایک پولیس والے کی آنکھ بغیر وجہ کے بھی شک کرنے لگتی ہے۔ میں نے خود کو بے ٹھکانہ ظاہر کر کے کوشش کی کہ کسی طرح گردنک کی کھولی میں رات گزارنے اور باتیں کرنے کا موقع مل جائے لیکن وہ بڑا کورا ثابت ہوا اس نے خالی چائے پلا کر مجھ سے چمکارہ حاصل کر لیا۔ اب ایک ہی طریقہ تھا میں خود کو اس پر ظاہر کروں اور پوچھ کچھ کے لئے قریبی تھانے لے جاؤں لیکن اس میں بھی کئی نقصان تھے اور سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ اگر ٹھانوں کو میری پوچھ کچھ کا پتہ چل جاتا تو وہ میری طرف سے بالکل بدگمان ہو جاتے۔ سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال برنالہ واپس چلا جاؤں اور جب اس مسئلے کا کئی حل ذہن میں آجائے

جھگڑے کی اصل وجہ جو بہت کم لوگوں کو معلوم تھی یہ تھی کہ گرو سنگھ ایک عورت کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ یہ عورت عمر میں گرو سنگھ سے بہت بڑی تھی اور امرتسر میں رہتی تھی لیکن اس نے گرو سنگھ کو اپنے جال میں یوں پھنسا رکھا تھا کہ وہ سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ ہر مہینے دس پندرہ روپے کرایہ خرچ کر کے وہ کم از کم دو مہینہ امرتسر جاتا تھا۔ گلاباں کو کسی طرح اس چکر کا علم ہو گیا پھر اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ گرو سنگھ نے اس کے زیورات میں سے ایک ہار اور جھمکوں کی جوڑی اپنی اس لگی کو دے دی ہے۔ اس کے بے پناہ دکھ میں کچھ اور اضافہ ہو گیا لیکن اپنی اس مصیبت کا ذکر اس بھلی ماں نے ماں باپ سے نہیں کیا۔ بس اتنا ہی بتایا کہ گرو سنگھ اس سے جھگڑتا رہتا ہے۔ وہ دو تین بار لڑ کے بیٹے آئی اور صلح معافی کے بعد گرو سنگھ اسے واپس لے گیا لیکن وہ اپنے کتوتوں سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹا بلکہ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس کی ہٹ دھرمی اور بے باکی میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ بڑی دلیری سے گلاباں کے ساتھ اپنی مشوقہ کا ذکر کرنے لگا۔ کبھی کہتا میں اسے گاؤں لے آؤں گا کبھی دھمکی دیتا کہ میں اس کے پاس امرتسر جا رہا ہوں۔ ایک روز وہ کپڑا لے کر آیا اور گلاباں سے کہا کہ اس کے فراق سی کر دو۔ گلاباں کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ یہ فراق اس کے بچے کے ہیں۔ گلاباں نے کپڑا پیچید کیا اور رونے لگی۔ گرو سنگھ نے اسے تھپڑ مارے اور گالیاں دیں۔ کئی روز گھر میں سخت کشیدگی رہی آخر گلاباں پھر اپنے بیٹے چلی گئی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اس نے والدین کو اصل بات نہیں بتائی۔ وہ بڑی حساس لڑکی تھی بوڑھے والدین کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔

پرکئی بار سخت جھاڑ کھانا پڑی۔ میں نے اشفاق سے چند سوالات کئے جن کے جوابات سے پتہ چلا کہ اشفاق نے گرو سنگھ کو کل دوپہر امرتسر سے گرفتار کیا تھا۔ امرتسر کے ہی ایک تھانے میں اس نے گرو سنگھ سے پوچھ گچھ کی اور گرو سنگھ نے سب کچھ بک دیا۔ اب وہ گرو سنگھ کو یہاں لے آیا تھا تاکہ مجھے اس کا بیان سنا سکے۔ اس نے گرو سنگھ سے کہا کہ جو کچھ وہ بتا چکا ہے ایک بار پھر دہرا دے۔ گرو سنگھ کے سارے کس بل کھل چکے تھے وہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح بولنے لگا۔ سب سے پہلے تو اس نے یہ حیران کن اقرار کیا کہ گلاباں کے گھر ہونے والے جڑواں بچے اس کے نہیں سردار بدروک سنگھ کے ہیں اور گلاباں سردار بدروک کی حویلی میں اس کی رکھیل بن کر رہتی ہے۔ اس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ گلاباں کے بدلے اس نے سردار بدروک سے ایک ہزار روپیہ لیا تھا اور اس ایک ہزار میں سے پانچ سو اس نے اگلے ہی روز جوئے میں ہار دیا تھا۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا یہ کیا گورکھ دھندہ ہے۔ میں نے گرو سنگھ سے کہا کہ وہ شروع سے تمام واقعات بتائے۔ جواب میں گرو سنگھ نے جو کچھ بتایا اس سے مندرجہ ذیل معلومات حاصل ہوئیں:

گرو سنگھ کھیت مزدوری کرتا تھا سختی تھا۔ بظاہر اس میں کوئی بُرائی نہیں تھی۔ ماں باپ فوت ہو چکے تھے وہ اکیلا رہتا تھا۔ باپے میدے نے سوچا اس کی لڑکی گرو سنگھ کے ساتھ خوش رہے گی۔ گلاباں اور گرو سنگھ کا بیاہ ہو گیا۔ گلاباں باپے میدے کی لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کافی جھنجھلائی۔ گرو سنگھ کا خالی گھر بھرا بھرا نظر آنے لگا۔ شادی کے بعد دو تین ماہ تو ٹھیک گزرے پھر میاں بیوی میں جھگڑا رہنے لگا۔

دوئوں کو زبردستی حویلی میں لے گیا۔ وہ اپنے مالک سردار بدروک سے پہلے ہی گاہاں کی بات کر چکا تھا۔ گاہاں سیدھی بدروک کے خاص کمرے میں پہنچا دی گئی جبکہ بابا میدہ باہر کالو اور اس کے ساتھیوں کے ٹھڈے کھاتا رہا۔ صبح باپے کو تو رہا کرو یا گیا مگر گاہاں مستقل طور پر حویلی کی ہو کر رہ گئی۔ گرو سنگھ سے سردار بدروک کی ملی جلتی تھی۔ اس لئے اگلے روز گرو سنگھ نے سردار بدروک سے ایک ہزار روپیہ وصول کیا اور امرتسر جا بیٹھا جہاں اس نے پانچ سو روپیہ تو جوئے میں ہار دیا اور باقی پانچ سو اپنی مشوقہ پر خرچ کر ڈالا۔ اس کے بعد ٹھنڈا ٹھار ہو کر فلور مل میں کام کرنے لگا۔ دوسری طرف سردار بدروک سنگھ بھی مطمئن تھا کہ اگر کوئی اس سے گاہاں کے بارے میں پوچھے گا تو وہ کہہ دے گا کہ گاہاں کو اس کا شوہر حویلی میں چھوڑ گیا ہے لیکن اس سوال کی نوبت ہی نہیں آئی کسی کو ہمت ہی نہیں ہوئی ٹھانے سردار سے سوال پوچھ سکے۔ بس لوگ چپکے چپکے میگوئیاں کرتے رہے اور خیالی کھڑے دوڑاتے رہے۔

پوری کہانی سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ جی چاہا اس بے غیرت شوہر کے منہ پر تھوک ڈوں۔ ایک شریف باپ کی بیٹی کو اس نے یوں برباد کیا تھا کہ اس کی پوری زندگی گالی بن گئی تھی۔ بابے میدے کی مصیبت زدہ صورت میری نگاہوں میں ٹھونسنے لگی۔ وہ اپنے داماد کو کیا سمجھتا تھا اور داماد درحقیقت کیا تھا کیسے کیسے ہمیں بدلا۔ ہ انسان۔

میں اشفاق کو لے کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ ہم دوئوں آئے سامنے بیٹھ گئے تو میں نے کہا ”اشفاق میرے دل کی بات پوچھو تو تم نے جرأت کا کام کیا ہے اور تمہیں شاباش ملنی چاہئے لیکن مجھے ڈر

دوسری طرف وہ گرو سنگھ کو دل و جان سے اپنا ہمتی سمجھتی تھی وہ کیسا بھی تھا وہ اسے دنیا کے سامنے نکال کر نہیں چاہتی تھی۔ سوچتی تھی شاید وہ راہ راست پر آ جائے۔ حالات بے انتہا بگڑنے کے باوجود اس کے دل کی گہرائیوں میں کہیں امید کی کرن موجود تھی۔ وہ گرو سنگھ سے دُور رہ کر اسے سدھارنے کی ایک آخری کوشش کرنا چاہتی تھی۔ لہذا گرو سنگھ کے بار بار آنے کے باوجود اس نے سسرال جانے سے صاف انکار کر دیا۔

گرو سنگھ کا ملنا جلنا کالو سے تھا۔ کالو کی گاؤں میں بہت اہمیت تھی کیونکہ وہ سردار بدروک کا نازم خاص تھا۔ اس نے گرو سنگھ سے کہا کہ تم بے فکر ہو جو زنانی نہ ما۔ نہ اس کا علاج ہے۔ کالو نے کہا سیدھا سادہ علاج ہے۔ جو نہیں آتی اسے اٹھا کر لے آؤ۔ یہ بات گرو سنگھ کے دل کو لگی۔ درحقیقت اس نے گاہاں سے ایک دن بھی محبت نہیں کی تھی۔ وہ اسے صرف بیوی سمجھتا تھا مگر کام کاج کرنے والی روٹیاں پکانے والی اور وقت بے وقت اس کے لئے خوشی فراہم کرنے والی۔ گھر میں تنازع شروع ہونے کے بعد یہ معمولی تعلق بھی نفرت میں بدل گیا تھا۔ اس نے کالو سے ساز باز کی اسے کہا کہ وہ گاہاں کو اٹھا لے اور ڈرا دھمکا کر سیدھا کمرے اسے اتنا خوفزدہ کرے کہ وہ پھر ساری زندگی اس سے متانہ لگا سکے۔ کالو نے کہا ”ایسا ہی ہوگا۔“

ایک رات وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر بابے میدے کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے بابے میدے سے کہا کہ سردار بدروک تمہیں اور تمہاری بیٹی کو حویلی میں بلاتے ہیں۔ بابے میدے نے پس و پیش سے کام لیا لیکن کالو کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ کالو ان

میں نے کہا ”کیا بات ہے ناجی پریشان کتے ہو۔ وہ منہ سے کھل بٹا کے بولا ”بات ہی پریشانی کی ہے جناب عالی..... بڑا خطرہ ہو گیا ہے۔“

”کیسا خطرہ؟“ میں نے پوچھا۔
اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں آگے کو جبکہ سر گڑھی میں بولا ”اشفاق صاحب کا کچھ کر لیں جناب..... لٹانوں نے انہیں قتل کر دینا ہے آج رات یا کل صبح تک۔“

میرے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا ”نیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

اس نے تھوک لٹکا ”بڑی گڑبڑ ہوئی ہے جناب! کل اشفاق صاحب نے امرتسر میں کسی بندے کو پکڑا ہے اور اسے تھانے لے جا کر مارا پیٹا ہے۔ یہ بندہ لٹانوں کا کوئی خاص آدمی ہے۔ وہ اشفاق صاحب کی اس حرکت پر بہت بھڑک اٹھے ہیں۔ آج سہ پہر سردار بدروک نے کالو سے کہا ہے کہ وہ اشفاق کا قصہ پاک کر دے۔ اشفاق صاحب ابھی گاؤں واپس نہیں آئے انہیں آج رات یا کل کسی وقت آنا ہے۔ کالو اسلحہ لے کر گاؤں کے ناکے پر بیٹھا ہوا ہے جیسے ہی اشفاق صاحب گاؤں کی حدود میں آئے ان کو قتل کر دیا جائے گا اور لاش پتھر باندھ کر روٹی نالے میں پھینک دی جائے گی۔ میں نے ناجی سے کہا ”تم ادھر ہی بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔“

میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو اشفاق وہاں موجود نہیں تھا۔ آتھان کے پاس ایک سپاہی کھڑا ہاتھ تاپ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”اشفاق کہاں ہے؟“

وہ بولا ”جی وہ طوم کو لاک اپ میں بند کر کے

ہے کہ اب اس کی جگہ تمہیں سزا نہ بھگتی پڑے۔ سردار بدروک سنگھ اب نچا نہیں بیٹھے گا اس کا کیا سوچا ہے تم نے۔“

اشفاق بولا ”نواز صاحب! مجھے کیا سوچنا ہے سوچنا تو اب اسے چاہئے۔ جرم اس نے کیا ہے ہم نے نہیں۔ میں صرف آپ سے مشورہ کرنے کے لئے آیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ گھاناں کے شوہر کو آپ اپنے پاس ہی رکھیں۔ ایک دو روز میں کیس مکمل کر کے میں ایس، پی صاحب کو بھیج دوں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ گرو سنگھ کے قبائی بیان کے بعد سردار بدروک بچ نہیں سکے گا۔“

میں نے کہا اشفاق! ”اصولی کارروائی کے پتھر میں نہ پڑنا گروڈی آئی جی صاحب واقعی تمہاری سنتے ہیں تو پھر ان سے بات کرو بلکہ میرا تو خیال ہے کل ہی ان سے مل لو۔ یہ معاملہ تاخیر کرنے والا نہیں تم نے ایک بہت بڑی مصیبت مول لی ہے۔ اب دیر کر دے تو اور پھنسنے جاؤ گے۔“ وہ مسکراتے لگا۔

اتنے میں ایک سپاہی اندر آیا۔ اس نے سیلوٹ مار کر اطلاع دی کہ روٹک گاؤں کا حجام ناجی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ ناجی کا نام سن کر میں چونکا۔ یہ شخص روٹک گاؤں میں میرا خاص تجربہ تھا۔ اشفاق اور سردار بدروک کی چپقلش شرع ہونے کے بعد میں نے ناجی کو خاص طور پر ہوشیار کر دیا تھا۔ اشفاق کو وہیں چھوڑ کر میں اپنے دفتر پہنچا۔ ناجی منہ سر کھل میں لپیٹ کر بیٹھا تھا۔ باہر محن میں اس کا گدھا بندھا ہوا تھا۔ اسی گدھے پر وہ دس میل کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا۔ دیکھا وہ کوئی اہم اطلاع لایا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہولے ہولے کانپ رہا ہے۔ یہ کپکپاہٹ سردی سے زیادہ گہرا ہٹ کی تھی۔

بھر میں خاموشی ہی رہا۔ تھانے پہنچ کر میں نے اس سے کہا ”اشفاق تمہاری جان کو سخت خطرہ ہے تم تھانے سے باہر نہیں جاؤ گے یہ میرا حکم ہے۔“

وہ حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ بہر حال اسے اعتراض کی جرأت نہیں ہوئی۔ شاید میرا لہجہ ہی ایسا تھا۔ میں نے باہر نکل کر اپنے سب انسپکٹر کو کچھ ہدایات دیں اور ایک کانسیبل کو ساتھ لے کر فوراً روٹنگ گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت تک رات کا ایک بج چکا تھا۔ تاریک سناٹا راستے پر نہایت سرد ہوا چل رہی تھی۔ گیدڑوں اور کتوں کی آوازیں کثرت سے آ رہی تھیں۔ ہم نے یہ مشکل سفر قریباً تین گھنٹے میں طے کیا اور صبح چار بجے چوکی پر پہنچ گئے۔ میں نے سیدھا ٹھانوں کی حویلی کا رخ کیا۔

صبح بیٹھک میں سردار بدروک سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کی آنکھیں خمار آلود تھیں۔ معلوم نہیں یہ شراب کا خمار تھا یا خواب کا۔ وہ مسکرا کر بولا۔
”آؤ جان جی خبر تو ہے؟“

میں نے کہا ”خبر نہیں ہے سردار بدروک اور یہ بات تم بھی جانتے ہو۔“

سردار بدروک کے چہرے پر رنگ سا آ کر مگرز گیا۔ میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی، خطرناک صورت اور سرخ انگارہ آنکھوں والا کالو کہیں نظر نہیں آیا۔ حالانکہ وہ ہر وقت سائے کی طرح بدروک کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے گنہگار لہجے میں کہا۔

”سردار بدروک مجھے خبر ملی ہے کہ تم نے کالو کو کسی خاص کام سے گاؤں کے ناکے پر بھیج رکھا ہے۔“

سردار کے چہرے پر عجب سے تاثرات ابھر کر غائب ہو گئے۔ کہنے لگا ”صرف اندازا لگا رہے ہو

چلے گئے ہیں یہ لافانہ یہاں چھوڑ گئے ہیں۔“
میں نے دیکھا وہ بڑا لافانہ تھا۔ اس میں کوئی اونٹنی کپڑا تھا۔ میں نے لافانہ کھولا نیلے رنگ کی ایک جرسی میرے ہاتھوں میں جمولنے لگی۔ اشفاق ایسے تماشے اکثر کرتا رہتا تھا۔ کچھ روز پہلے مجھے کہہ رہا تھا میں اپنی ہونے والی بیوی سے دو جرسیاں بخوار ہا ہوں ایک آپ کے لئے ایک اپنے لئے۔ میں جانتا تھا اس کے دل میں میرے لئے بے پناہ خلوص ہے۔۔۔۔۔۔
بہر حال اس وقت مجھے اس کا یہ پر خلوص تحفہ بھی اچھا نہیں لگا میں نے جرسی ایک طرف پھینکی اور سخت لہجے میں پوچھا ”کہاں گیا ہے وہ؟“
سایا بولا ”پتہ نہیں جی ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کا گھوڑا گلی سے نکل کر گیا ہے۔“

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ تقریباً بھاگتا ہوا میں تھانے سے باہر آیا۔ میرے پاس ایک کھارہ سی جپ تھی۔ جپ لے کر میں روٹنگ جانے والے راستے پر بڑھا۔ اے ایس آئی اشفاق اسی راستے پر گیا تھا۔ اونچے اونچے تاریک راستے پر میں جتنی رفتار اختیار کر سکتا تھا اختیار کی اندازاً دو میل آگے جا کر میں نے اشفاق کو جالیا۔ اشفاق نے مجھے دیکھ کر گھوڑا روک لیا۔ میں نے اشفاق سے کہا کہ وہ میرے ساتھ واپس چلے۔ میرے فیصلہ کن لہجے پر وہ حیران رہ گیا۔

پوچھنے لگا ”کیا بات ہے نواز صاحب آپ کچھ پریشان ہیں۔“

میں نے کہا ”میں بہت زیادہ پریشان ہوں تم میرے ساتھ آؤ میں تھانے جا کر تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔“

مجبوراً اسے میرے ساتھ واپس آنا پڑا۔ راستہ

میں وہ ظلم بھیں بدل کر بیٹھا ہوا تھا جو برنالہ کے
ٹھانے نسل و نسل اپنے سے کمزور لوگوں پر ڈھاتے
رہے تھے۔۔۔۔۔

آخر بدروک نے زیر لب مسکرا کر میرا کندھا
تھپتھپایا، مگھری سانس لے کر بولا ”ٹھیک ہے نواز
خان۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے میں تمہیں ایک موقع اور دیتا
ہوں۔ جاؤ۔۔۔۔۔ اس پاگل کے بچے کو سمجھاؤ۔ اسے
بتاؤ کہ وہ کس اوکھلی میں سردے رہا ہے۔ جاؤ میری
طرف سے مطمئن ہو کر جاؤ۔ میں کل تک تمہاری
کوشش کے نتیجے کا انتظار کروں گا۔“

میں نے آخری نظر بدروک سنگھ پر ڈالی اور بغیر
کچھ کہے سنہ باہر نکل آیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میری
جیب کیچے راستوں پر اچھلتی ہوئی واہلر، رنگ کوٹ
جاری تھی۔ اشفاق کا ہنسا مسراتا چہرہ میری نگاہوں
میں گھوم رہا تھا۔ وہ جوان تھا خوبصورت تھا، عقرب
اس کی سادی ہونے والی تھی۔ ان کے بوڑھے والد
کا تصور میری سوچوں کو ریشان کرنے لگا۔ ایک

طرف وہ بوڑھا بیٹے کے سر پر سرہرہ دیکھنے کی آرزو
لئے بیٹھا تھا دوسری طرف ایک خوبصورت لڑکی نے
اپنی آنکھوں میں سہاگ کے بچنے سچا رکھے تھے۔ اگر
اشفاق کو کچھ ہو جاتا تو کئی دلوں پر قیامت بیت
جاتی۔ اشفاق کو کچھ معلوم نہیں تھا وہ کس گھرانے سے
نکلے رہا ہے لیکن میں جانتا تھا مجھے معلوم تھا
ٹھانوں کے تعلقات ایک ایسے شخص سے ہیں جس
کے سامنے پولیس کے چھوٹے بڑے عہدیدار پانی
بھرتے ہیں۔ وہ شخص ایک پرہی لکھ کر دیتا ہے اور
تھانوں میں تھلکے جاتا ہے۔

میں غصے میں بھرا ہوا واہلر رنگ کوٹ تھانے
پہنچا۔ اشفاق اوپری منزل کے ایک کمرے میں لمبی

پاسکی کے بھکاوے میں آئے ہو۔“

میں نے کہا ”اندازے وہ لگاتے ہیں جنہیں خبر
نہ ہو مجھے خبر ہے جو کچھ یہاں ہوتا ہے۔ ایک
تھانیدار کو اپنی آنکھیں اور اپنے کان کھلے رکھتے
پڑتے ہیں۔“
سردار نے میرے اکڑے اکڑے لہجے کو
محسوس کر لیا مسکرا کر بولا۔

”کیا بات ہے جان جی کچھ بدلے بدلے نظر
آتے ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈالیں اور صاف سیدھے لہجے میں کہا ”دیکھو سردار
ٹھانہ اگر اے ایس آئی اشفاق کو کچھ ہوا تو ایسی آگ
لگے گی جو تمہارے بجائے سے نہ بجھے گی۔ میری
بات پورے غور سے سن لو اور سمجھ لو۔ تم اے ایس
آئی اشفاق پر حملہ نہیں کرو گے۔ ایسا کرو گے تو مجھ پر
حملہ کرو گے مجھ پر۔“

وہ اپنے ہونٹوں کی زہریلی مسکراہٹ برقرار
رکھتے ہوئے بولا۔

”بڑے تاؤ میں لگتے ہو جان جی۔“
میں نے کہا ”ہاں تاؤ میں ہوں لیکن یہ نہ سمجھنا
میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں پوری طرح ہوش
میں ہوں میں سب جانتا ہوں جس کے ساتھ بیٹھ کر
تم کھانا کھاتے ہو سب کچھ جانتا ہوں میں لیکن
اسے میری دمکی سمجھ لو منت سمجھ لو یا درخواست سمجھ
لو۔ میرے اے ایس آئی کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔“
میں نے محسوس کیا کہ جذبات کی وجہ سے میرا سارا
وجود دھیرے دھیرے لرز رہا ہے۔

سردار بدروک کچھ دیر مگھری نظروں سے میری
طرف دیکھتا رہا۔ ان نظروں میں چمپی ہوئی درنگی
اور سفاکی کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ ان نگاہوں

”کھو کھو تلی ہوئی ہے۔ تم اپنے آپ کو بڑا باخبر سمجھتے ہو ناں تمہارا خیال ہے کہ سردار بدروک نے گلاباں کو حویلی میں رکھ کر اور اس سے دو بچے پیدا کر کے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ اب بتاؤ وہ جرم بڑا ہے یا یہ جرم بڑے ہیں۔ اگر یہ جرم کر کے بھی اس کے ہاتھ پھڑکی سے آزاد ہیں تو گلاباں سے بچے پیدا کرنے کا جرم اس کا کیا بگاڑ لے گا۔ بتاؤ کیا کر لو گے تم؟“

وہ بولا ”نواز صاحب! اگر ہم سے پہلے آنے والے تھانیدار سردار بدروک سنگھ کا مت نہیں توڑ سکے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے سجدہ کرنا شروع کر دیں ہم نے حلف اٹھایا ہے۔“

”خاک حلف اٹھایا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹی ”تم فرض شناس نہیں ہو بے وقوف ہر۔ تم مرنا چاہتے ہو ناں؟“ وہ..... یہ لور پو لور رکھ لو اس کو کینٹی پر..... کم از کم کتے کی موت مرنے سے ڈونچ جاؤ گے ناں۔ لو پکڑو اسے۔“ میں نے ریو لور اشفاق کی گود میں پھینک دیا۔

میرا پیش اشفاق کو ہراساں کر رہا تھا۔ اس نے ریو لور گود سے اٹھایا اور آہستگی سے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ کچھ دیر کمرے میں گھیر خاموشی طاری رہی۔ ادھ کھلی کڑکی سے کبھی کبھی ہوا کا جھونکا آ جاتا تھا۔ ان جھونکوں سے ہمارے درمیان رکھی ہوئی فائل کے ورق پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اشفاق نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”نواز صاحب آپ ہر لحاظ سے مجھ سے بڑے ہیں۔ میں آپ کی بات رد نہیں کر سکتا بہر حال مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دیجئے۔ وہ اٹھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ میں نے اسی وقت حوالات میں جا کر گروسنگھ کو رہا کر دیا۔ اسے کھانا وغیرہ کھلایا اور

تان کر سو رہا تھا۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے اسے سامنے بٹھا کر کہا۔ ”اشفاق مجھے ٹھیک ٹھیک بتا کیا چاہتا ہے ٹو؟“

”نواز صاحب میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔“ میں نے کہا ”آ میرے ساتھ میں سمجھاتا ہوں تجھے۔“ اشفاق کو بازو سے پکڑ کر میں تقریباً کھینچتا ہوا میز جیوں تک لے آیا۔ میز حیاں اتر کر ہم نیچے آفس میں پہنچے۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور لوہے کی ایک کہنہ سال الماری کا قفل کھول کر پٹ وا کر دیئے۔ اس الماری میں مختلف کیسوں کی فائلیں تھہ در تھہ رکھی تھیں۔ ایک خانے میں ہسٹری شیٹس تھیں۔ ایک دوسرے خانے میں پرانے کاغذوں کے پلندے رکھے تھے۔ میں نے الماری کے نچلے خانے میں سے ایک گرد آلود فائل نکال لی۔ یہ فائلوں کی فائل تھی۔ اس فائل میں ٹھانوں کے وہ تمام قانونی اور غیر قانونی کارنامے درج تھے جو وہ اب تک کرتے رہے تھے۔ میں نے فائل کا ایک صفحہ کھول کر اشفاق کے سامنے رکھ دیا۔ وہ صفحے پر جبک کر غور سے پڑھنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ مجھے معلوم تھا اسے حیران ہونا پڑیگا۔ فائل کے اس صفحے میں سردار بدروک سنگھ کے چند کالے کارناموں کی تفصیل تھی۔ ان میں کئی نکتے تھے اس کے علاوہ ناچائز قبضے، اغوا اور آبروریزی کی درجنوں وارداتیں تھیں ان میں دو تین وارداتیں ایسی تھیں جن میں سردار بدروک کے خلاف ٹھوس ثبوت مل گئے تھے اور اس پر مضبوط کیس بن سکتے تھے مگر نا معلوم وجوہ کی بنا پر یہ کیس داخل دفتر کر دیئے گئے تھے۔ اشفاق فائل دیکھ چکا تو میں نے کہا۔

کے سارے کپڑے بگور کھے تھے۔ ایک دو دیہاتی پریشانی کے عالم میں پاس کھڑے تھے۔ میں نے لپک کر اس کا سراپے ڈانٹ پر رکھا۔ ذم زیادہ سنگین معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن اشفاق کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ میں نے سہارا دے کر اسے بٹھانے کی کوشش کی اور اس وقت میری نگاہ اس کی پشت پر پڑی۔ میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اس کی پشت پر خنجر کے کم از کم نصف درجن نہایت گہرے گھاؤ تھے۔ یوں لگتا تھا وحشی قاتلوں نے اسے گھرا کر خنجروں سے چھلنی کر دیا ہے۔

”اشفاق.....“ میں نے کراہ کر کہا۔

اس نے ڈوبتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور جسم ڈھیلا چھوڑ کر میرے سینے سے آگے۔ میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے آنکھوں آنکھوں میں اپنی موت کا اعلان کر رہا ہو اور مجھے خدا حافظ کہہ رہا ہو۔ مجھے لگا جیسے میرا چھوٹا بھائی یا میرا بیٹا میرے سینے سے لگا ہے۔ میں نے اسے ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ اس کا خون میری جری کو رنگین کرنے لگا۔ وہی جری جس کے ہر دھاگے میں اشفاق کی محبت اور اس کا غلوں گندھا ہوا تھا۔

”آنکھیں کھول اشفاق! آنکھیں کھول۔“ میں نے گہرا کر کہا لیکن اس نے آنکھیں کھولنے کے لئے بند نہیں کی تھیں۔ میں نے اسے جینوڑا وہ بہت دور جا چکا تھا بہت آگے نکل گیا تھا۔ میرا سینہ غم کی شدت سے پھٹنے لگا۔ ایک آگ سی لپکی اور جسم کے رگ و پے میں پھیل گئی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اشفاق کا نرودہ جسم کمیت کی مٹی پر رکھ دیا.....

(آخری حصہ آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

اپنے ایک ہیڈ کاسٹیل سے کہا کہ اسے جا کر امرتسر چھوڑ آئے۔

تین چار روز گزر گئے۔ اشفاق کا رویہ اب کچھ بدلا بدلا نظر آتا تھا۔ اس نے گردن کھکھکھ کو چھوڑنے پر بھی کوئی خاص اعتراض نہیں کیا۔ شاید اس نے خود بھی اپنی حیرت فاری کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ ابھی چوکی واپس نہیں گیا تھا وہاں اس کا قائم مقام ایک سکھ حوالدار کام کر رہا تھا۔

ایک دن صبح سویرے میں نے سوچا اشفاق سے اس کا آئندہ کالانچہ عمل پوچھنا چاہئے۔ اس کی شادی ہونے والی تھی بہتر تھا وہ ایک دو مہینے کی رخصت لے لیتا۔ شادی بھی مٹ جاتی اور یہ معاملہ بھی ٹھنڈا ہو جاتا۔ میں نے سنتری سے کہا۔

”ذرا اشفاق کو بلاؤ وہ اوپر کمرے میں سو رہا ہوگا۔“ سنتری نے کہا ”نہیں جناب وہ تو تھوڑی دیر پہلے کنویں کی طرف گئے ہیں۔“

میں وچیں کمرے میں بیٹھے بیٹھے اس کا انتظار کرنے لگا۔ دس پندرہ منٹ گزرے تھے کہ ایک سپاہی دھوٹی کرتے میں ملیں بھاگتا ہوا آیا اس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ آتے ساتھ ہی کہنے لگا۔

”انسپکٹر صاحب جلدی چلیں اشفاق صاحب زخمی ہو گئے ہیں۔ ٹمانوں کے آدمی انہیں چاقو مار کر بھاگ گئے ہیں۔“ میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا سپاہی کے ساتھ بھاگتا ہوا میں تھانے سے باہر آیا۔ ہم پیدل ہی کمیٹوں کی طرف بھاگے۔ کوئی دو فر لایک آگے اشفاق مٹی کے کئے ہوئے کمیت میں زخمی پڑا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا اس کے دائیں کندھے اور ران پر خنجر کے گہرے گھاؤ نظر آرہے تھے۔ تیزی سے بہنے والے خون نے اس



عارف محمود اہل

فطرت کا خزانہ

یہ حقیقت ہے کہ ان پھلوں، سبزیوں و جڑی بوٹیوں کا استعمال فقط غذا کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ ان میں موجود صحت بخش اجزاء بہت سے امراض سے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ یہاں صورتحال یہ ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ افراد بھی غذائی جزییت کی اہمیت و افادیت سے لاعلم رہتے ہیں۔

نباتات اور قدرتی اجزاء کی اہمیت آج اگر کرتی معلوماتی تحریر

وجد کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ روغن فلورا کو پھولوں کی دیوی سمجھتے ہیں، جو انسانوں میں خوشحالی کو بانٹتی ہے۔ کنول کا پھول مشرق میں مقدس کہلاتا ہے۔ یہ پھول عورت، تخلیق اور دائمیت کی عکاسی کرتا ہے۔ Larual کے درخت کو شاعری و اپالود دیوتا کا سنبھل

قدیم زمانے سے فطرت کو مختلف انداز سے بیان کیا جاتا رہا ہے۔ ہر دور کے شاعروں و فلسفیوں نے فطرت سے محرک حاصل کر کے اسے اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ Ivy نیل کو ڈائنوسس اور باخوس دیوتا سے منسوب کیا جاتا ہے جسے شاعری، تحریک اور

نظر آتا ہے۔ اس کے بھی بے شمار فوائد ہیں۔ یہ اکثر GELS میں استعمال کیا جاتا ہے جو درد کے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں۔ اس کا عرق ذہن کو چست و فعال رکھتا ہے۔

پھولوں سے بنے تیل و عرق کا استعمال ایشیا و یورپ میں آج بھی اپنے عروج پر ہے۔ ترقی یافتہ قومیں کام کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے خود کو ذہنی و جسمانی طور پر چاق و چوبند رکھنے کے لیے فطرت کے خزانے سے مستفید ہونا جانتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں پر جڑی بوٹیوں سے بنی چائے بہت مقبول ہے۔ ہرٹل چائے کو ذہنی و جسمانی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے اہم سمجھا جاتا ہے۔ یہ چائے بچوں، تھک و پھلے سے تیار کی جاتی ہے۔ پھولوں اور جڑی بوٹیوں سے بنی چائے 5 ہزار سال پہلے چائے کے حکمران شین تنگ نے دریافت کی تھی۔ برطانیہ میں یہ چائے سترہویں صدی میں استعمال کی جانے لگی، جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے بیوپاری چائے سے آتے اور دوست و احباب کے لیے ہرٹل چائے کے تحفے ساتھ لائے گئے۔ نیویارک کے تھامس سیلون نے 1904 میں پہلا ٹی بیگ ایجاد کیا اور دنیا میں چائے پینے کی ایک نئی روایت قائم کی۔ ہرٹل چائے کو لیسٹرول کو کم کرنے، قوت مدافعت بڑھانے، وزن کم کرنے کے لیے استعمال کی جانے لگی۔ جاپان کے ڈاکٹر کے مطابق سبز چائے کے 5 کپ روزانہ ہر قسم کے کینسر کا دافع کرتے ہیں۔ انڈیا میں واقع چائے کے باغات دنیا کو تئیس فیصد چائے مہیا کرتے ہیں۔ 1904 میں انگریز بیوپاری رچرڈ نے St Louis world fair میں ٹھنڈی سبز چائے کو متعارف کروایا۔ چائے کی پتی کے آئس کیوبز سبز چائے میں ڈال کر دنیا کو بخیر بستہ سبز

جاتے تھے۔ مقدس کتابوں میں بھی درختوں پودوں و پھولوں کا ذکر ملتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ درخت خیر علاقے سکون اور وجدانی کیفیتوں کا باعث بنتے ہیں۔ Master Lam Kam Chuen اپنی کتاب The Ways of Healing میں قوت کے اعتبار کی پانچ قسمیں بتاتا ہے۔ پانی، آگ، زمین، دھاتیں اور درخت جو انسان کی بقا کا جواز بنے ہوئے ہیں۔ کنگ کہتا ہے کہ ”درخت پھیلاؤ کی قوت ہیں، ان کی شاخیں مکلی اور وسیع ہیں، ان کی قوت میں بہاؤ موجود ہے۔ یہ قوت مضبوط ہے، یہ ہمیں ماحول سے ہم آہنگ ہونا سکھاتی ہے۔ درخت کی قوت چودھویں کے چاند کی مانند بڑھتی اور چھا جاتی ہے، اسی دوران چیزیں ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں اور پھلتی و پھوٹی ہیں جو فطرت کو جنم دیتی ہے وہ بہار کی قوت ہے۔“ یہی وجہ ہے کہ ایشیا کے اکثر ممالک میں لوگ فطرت کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ پودوں کے احتراز سے تیل بنائے جاتے ہیں جنہیں Essential Oil کا نام دیا گیا ہے۔ جو ابرو و ماتراپی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان پھولوں و جڑی بوٹیوں کے عرق کو سونگھنے سے صحت کے حوالے سے مطلوبہ نتائج حاصل کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ایڈورڈ نیچ نے دریافت کیا کہ ذہنی تناؤ ہماری شخصیت و جذباتی زندگی کے عدم توازن کا نتیجہ ہے۔ پودوں کے عرق میں ذہنی تازگی کو کم کرنے کے اجزاء موجود ہیں لہذا پودوں کو دوسرے کیمیائی اجزاء کے ملاپ سے مزید با اثر بنایا جانے لگا۔ ان پھولوں کے عرق کو سونگھنے، نہانے کے پانی میں شامل کر کے اور چائے میں استعمال کیا جاتا ہے جیسے Lavender کی خوشبو سونگھنے سے سر کا درد اور تھکن رفع ہو جاتی ہے اور بہت اچھی نیند آتی ہے۔ یوکلپٹس کا درخت جابجا

اللہ کے رسول دین کے پیغمبر جو جیتا و کاہتا کی بنیاد ہیں

سیارہ ڈائجسٹ



کا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

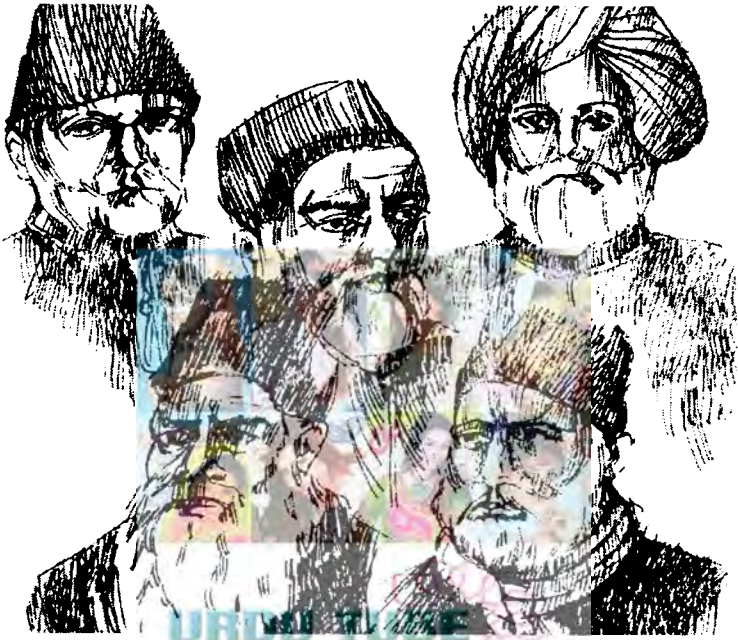
اپنی سابقہ روایات کے شایان شان یہ نمبر پیغمبرانِ خدا کی
حیاتِ جاوداں ان کے معجزات اور ایمان افروز واقعات پر مشتمل
ایک متاعِ بے بہا اور جامع دستاویز ہو گا۔

Blood Thinner خون پتلا کرنے والے اجزاء شامل ہیں۔ ہلدی، ادراک و لہسن دل کی بیماری کی احتیاطی تدابیر کے طور پر ایشیا و یورپ میں دوا کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ جہاں تک تحس کی مشقیں ہیں تو وہ موجودہ دور میں دہائی دہاؤ کے شکار ہر شخص کو کرنی چاہئیں۔ جو دل کی بیماری سے متاثرہ لوگوں کو تجویز کرنے میں احتیاط برتی جاتی ہے لیکن دل کے متاثرین وہ لوگ جو چل پھر نہیں سکتے، انہیں معتدل تحس کی مشقیں ضرور کرتے رہنا چاہیے۔

یہ حقیقت ہے کہ ان پھلوں، سبزیوں و جڑی بوٹیوں کا استعمال فقط غذا کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ ان میں موجود صحت بخش اجزاء بہت سے امراض سے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ یہاں صورتحال یہ ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ افراد بھی غذائی حیرت کی اہمیت و افادیت سے لاعلم رہتے ہیں۔ اکثر لوگ اس بات کا تعین نہیں کر پاتے کہ انہیں کون سی غذا کھانی چاہیے اور کس قسم کے کھانوں سے احتیاط برتی جائے۔ ہم دن بدن غیر فطری زندگی اور غذا کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے گھر بھی دیکھے ہیں جہاں سبزیاں و پھل فریج میں رکھے خراب ہو جاتے ہیں اور بعد میں پھینکوا دیے جاتے ہیں۔ کئی بچے پھل کی جگہ جیک و فاسٹ فوڈ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہماری نئی نسل فاسٹ فوڈ کے ارد گرد چکر لگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ کھانے جو آج ان کی اولین ترجیح بن چکے ہیں آنے والے کل میں انہیں اچھی صحت، کارکردگی و چستی سے محروم کر دیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ آنے آپ فطرت کے خزانے سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے آنے والے کل کے لیے خود کو چنی، جسمانی و روحانی طور پر مستحکم کر لیجئے۔

چائے کی طرف مائل کیا۔ برطانیہ میں سبز چائے کا استعمال زیادہ ہونے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ میں 175 ملین کپ روزانہ چائے پی جاتی ہے اور چائے کی مانگ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں چائے میں دودھ اور چینی کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔ یوں چائے کے ایک کپ میں ہر بار ہم 40 کیلو پر حاصل کرتے ہیں۔

جدید دنیا میں یہ پھول و جڑی بوٹیاں روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کو **Deep Vein Thrombosis** جیسی پیچیدہ بیماری تشخیص کی گئی۔ اس کی دو ماہ کی بیٹی ہے۔ یہ عارضہ زیادہ تر چھوٹی عمر کی ماؤں کو لاحق ہوتا ہے۔ اس کی مانگ میں جما ہوا خون کا ٹوٹا دریافت ہونے کے بعد اسے چھ ماہ کا بیڈ ریسٹ بتایا گیا۔ اسے سخت احتیاط کی ہدایت کی گئی کیونکہ وہ صورتحال جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کی خالہ جو خود بھی ڈاکٹر ہے، ایک دن کہنے لگیں کہ آپ فطرت کے خزانے سے کوئی حل نکال لیں لہذا وقت ادراک کی چائے کے ساتھ **Digraphic Breathing** (گہری سانسوں کی مشقیں) اس کے لیے تجویز ہونے کے ساتھ مختلف سبزیوں کے سوپ بھی بنائے گئے۔ یقین کیجئے فقط دس دن میں وہ لڑکی اٹھ کر بیٹھی اور چلنے لگی۔ ایک مہینے کے بعد جب اس نے انٹراساؤنڈ کروایا تو اس مسئلے کا دُور دُور تک نام و نشان باقی نہیں تھا۔ چھ ماہ کی طوالت کے بجائے اس ہرمل علاج اور سانسوں کی مشقوں سے وہ فقط ایک ماہ میں زندگی کے معمول کی طرف لوٹ آئی۔ ادراک جراثیم کش جڑی بوٹی ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی سوجن کا موثر علاج بھی ہے۔ اس میں بہت موثر



سید جعفر امیر رضوی

دریائے وقت

اس نے بتایا کہ دوام ان ادیب اور شاعروں کو حاصل ہوتا ہے۔ جو اختراع فکر و بیان کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کی گہرائیوں میں پوشیدہ جذبات احساسات کو موضوع کلام کرتے ہیں اور جن کی نگارش میں انشا پر دازی، مضمون آفرینی، سلاست اور بلاغت ہوتی ہے۔

لازوال ادب کے معیار کو برکنے کا طرز فکر بیان کرتی مفرد تحریر

اور کیوں سواری نہیں لے جاتا۔ ایک دن مجھ سے رہا نہ گیا اور کشتی بان سے پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ سواری کیوں نہیں لے جاتا۔ کشتی بان نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور خلاء میں دیکھتا رہا۔ مجھ کو اس کا یہ انداز بے نیازی پسند نہیں آیا۔ میں دوبارہ مخاطب ہوا اور شکایت کی کہ اس نے میرے

میرے گھر کے قریب سے ایک دریا بہتا تھا جس کے کنارے پر ایک گھٹا چنار کا درخت تھا۔ اس چنار کے سایہ میں ایک کشتی بان اکٹرو بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ لیکن اس کو دریا پار سواری لے جاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ کبھی کبھی میرے دل میں سوال اٹھتا تھا کہ یہ کشتی بان یہاں بیٹھے بیٹھے کیا کرتا ہے

سوال کا جواب نہیں دیا۔

میری شکایت: میں نے کہا کہ اس کا نام دوام ہے اور وہ صرف مخصوص مسافروں کو دریا پار لے جاتا ہے۔ وہ ان ہی کے انتظار میں وہاں بیٹھتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مخصوص سواروں کے لئے اس کو کبھی بھی صدیوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ لفظ ”مخصوص“ سوال کن تھا۔ میں نے وضاحت چاہی۔ اس نے جواب دیا جیسے امیر خسرو، میر تقی میر، مرزا غالب، میر انیس، محمد اقبال، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، شکیب، ہوسر، وغیرہ۔ سوال میں سوال پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا یہ دنیا کے ہزاروں ادیب اور شاعروں میں سے اس نے ان کو کیوں منتخب کیا۔ کیوں غالب کو پسند کیا اور ذوق کو نہیں جو ان کے ہم عصر تھے اور اپنے زمانے میں زیادہ مشہور تھے اور استاد مانے جاتے تھے۔

کشتی بان کچھ دیر تک خاموش سوچتا رہا۔ پھر جواب دیا کہ ”اس کا انتخاب ادیب اور شاعر کی شہرت یا ان کے مستند ہونے پر مبنی نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ جو بات ادیبوں، شاعروں، مفکروں، فلسفیوں، محققین وغیرہ کو مخصوص بناتی ہے وہ ان کی جدت پسندی ہے۔ ایسے علماء فن کو عربی میں ”مستبد“ یعنی موجد فن و علم کہتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ دوام ان ادیب اور شاعروں کو حاصل ہوتا ہے۔ جو اختراع فکر و خیال کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کی گہرائیوں میں پوشیدہ جذبات احساسات کو موضوع کلام کرتے ہیں اور جن کی نگارش میں انشا پر دازی، مضمون آفرینی، سلاست اور بلاغت ہوتی ہے۔ شکیب جس کے ڈراموں میں انسانی فطرت کی عکاسی ملتی ہے اسی لئے لافانی ہے۔“

کشتی بان یہ کہہ کے کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر چتر کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا ”یہ درخت دوسرے اشجار سے الگ ہے کیوں کہ اس نے اپنی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پھیلا رکھی ہیں اور دریا کی لہروں سے ہلکتی ہوئی زمین کی سطح اس کی تادری کو کمزور نہیں کرتی۔ یہ صد ہا سال سے اپنے سائے کو پھیلاتا چلا جا رہا ہے۔ اسی طرح وہ ادب جو انسان کی بنیادی فطرت کی عکاسی کرتا ہے، اس کو وقت نہیں مٹا سکتا۔ کیوں کہ حالات بدلتے ہیں۔ تہذیب بدلتی ہے۔ رسم و رواج بدلتے ہیں، معاشرہ بدلتا ہے، صرف ایک انسانی فطرت ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔ ایسے ادب کو دوام حاصل ہوتا ہے۔“

یہ کہہ کر کشتی بان اٹھا اور ندی کے ساتھ ساتھ چلنے والی پگ ڈنڈی پر نکل پڑا۔ میں نے کشتی بان کو جاتے ہوئے دیکھا تو سہوا پوچھ بیٹھا کہ ”کیا دور حاضر سے وہ کسی کو دریا پار لے جائے گا۔“ میرے اس سوال پر وہ مسکرایا اور پھر اپنے کندھوں کو ذرا سا بلند کیا جیسے اشارے سے کہہ رہا ہو کہ ”کیا معطوم۔“ میں وہیں چتر کے درخت کے نیچے بیٹھا اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ شام ڈھلی، آسمان سرمئی ہوا، چتر پر لمبیرا کرنے والے پرند جو کچھ دیر پہلے شور کر رہے تھے خاموش ہو گئے۔ رفتہ رفتہ رات کی سیاہی پھیل گئی۔ میں اندھیرے میں یوں ہی بیٹھا دریا کی لہروں کی آواز سنتا رہا۔ جب بہت تھک گیا تو گھر لوٹ گیا۔ قدیل جلائی اور کھڑکی کے سامنے اپنی میز پر قرطاس و قلم نکال کر بیٹھ گیا اور باہر پھیلی ہوئی تاریکی میں گھورنے لگا کہ شاید اتنی فکر پر کوئی ستارہ جھللاتا آجائے جس کی روشنی میں انسانی فطرت کی گہرائیوں کو انشا کا رنگ و روپ دے سکوں جو اس کشتی بان کی شرط سفر تھی۔



نائلہ بلخ الرحمن

سراب زندگی

وہ انجانے پہنوں میں کھویا بس میں سوار تھا۔ سڑک کاٹے نہ کٹ رہا تھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھاگ کر گھر پہنچ جائے۔ مہر دکنی خوش ہوگی جب وہ یہ سارے کہنے اور کپڑے دیکھے گی۔ وہ اس کے چہرے پر آئے رنگوں میں کھویا ہوا تھا۔ چونکا جب جب اس کا سناپ آ گیا۔

ایک شخص کا اجرا جس نے اپنی ساری زندگی کسی کی خوشیوں کی نذر کر دی تھی

آپریشن کا میاب بھی ہو سکتا ہے اور ناکام بھی لیکن ابھی بچی کی عمر چھوٹی ہے علی بخش کے پریشان ہونے کی وجہ بھی یہ ہی تھی۔

ماں نے بڑھ کر مہر بانو کو تمام لیا تھا اور اسے چار پائی پر لٹا دیا تھا اور خود علی بخش کی طرف پلٹی اور

علی بخش ابھی ابھی شہر سے لوٹا تھا۔ وہ مہر بانو کو آج شہر لے کر گیا تھا۔ مہر بانو کو ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔ اور ڈاکٹر نے جو کچھ بتایا تھا وہ بات حوصلہ نہ دینے والی تھی۔ وہ مایوس تھا اور دگر فہم بھی۔ ڈاکٹر نے مہر بانو کا آپریشن بتایا تھا ساتھ میں یہ بھی کہا تھا کہ

کے بیویوں پر پردہ ڈالنا چاہئے اور انہیں چاہئے
قرآن تو ناپسندیدہ بیویوں سے بھی حسن سلوک کا حکم
دیتا ہے۔

سورۃ النساء میں ارشاد ہے کہ:

”ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر
کرو اگر وہ تمہیں ناپسند (بھی) ہوں۔ ہو سکتا ہے
ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت
کچھ بھلائی رکھ دی ہے“ (القرآن 4-19)

ماں بہن بیوی بیٹی یہ وہ مطلقہ سب کے حقوق
قرآن وحدیث میں واضح طور پر بیان فرمادیئے گئے
ہیں۔ اسلام سے قبل عورت کی بے حرمتی اور اسلام
کے بعد عورت کی عزت واحترام جاننے کے لئے
دین کے مطالعے اور اس کو صحیح طور پر سمجھنے کے بعد ہی
ہم اس پر عمل جراہو سکتے ہیں۔

”مومن مرد اور مومن عورتیں یہ سب ایک
دوسرے کے رفیق ہیں۔“

(القرآن 9-71)

رفیق کہتے ہیں دوست کو ساتھی کو قرآن حکیم
میں ہی ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ:

”مرد عورتوں کے محافظ ہیں۔“

(القرآن 4-34)

اب میں اس مضمون کے اصل موضوع یعنی
تشدد کی طرف آتی ہوں۔ قارئین! جیسا کہ میں نے
اس مضمون کے شروع میں بیان کیا ہے کہ تشدد کسی
ایک محلہ شہر دوڑین صوبہ یا ملک میں نہیں بلکہ
پوری دنیا کا یعنی کہ بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ بہت
سے رفاہی ادارے حکومتیں اس کیخلاف سرگرم عمل
ہیں مگر اس پر آج تک قابو نہیں پایا جاسکا۔ دنیا میں
سب سے زیادہ جرائم امریکہ میں ہوتے

نہ کبھی بھی اپنی کسی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور نہ ہی
اپنی زبان سے کبھی انہیں تکلیف دی۔ آپ اپنی
ازواج کے ساتھ ہمیشہ محبت و شفقت سے پیش
آتے۔ اسلام نے بیٹی کی پیدائش پر بھی خوشی منانے
کا حکم دیا ہے اور اس کی پیدائش کو باعث رحمت قرار
دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد
مبارک ہے۔

”جس شخص نے تین بیٹیوں یا بہنوں کی پرورش
اور اچھی تعلیم و تربیت کی۔ ان سے شفقت کا برتاؤ
کیا یہاں تک کہ وہ اس کی مدد کی محتاج نہ رہیں اللہ
اس کے لئے جنت واجب کر دے گا۔“

ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف
بیٹیوں سے محبت اور شفقت کرنے کی تلقین کرتے
بلکہ آپ کی حیات طیبہ اس کا عملی نمونہ تھی۔ آپ صلی
اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی بیٹیوں سے سلوک مثالی تھا۔
حضرت فاطمہؓ کے بارے میں بار بار فرمایا ”فاطمہؓ
میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔“ حضرت فاطمہؓ کا گھر حضرت
عائشہؓ کے حجرے سے متصل تھا۔ آپ جب بھی گھر
آتے یا باہر تشریف لے جاتے تو پہلے اپنی بیٹی فاطمہؓ
سے مل کر پھر دوسرے لوگوں کی طرف توجہ فرماتے۔
حضرت فاطمہؓ جب بھی آپ سے ملنے آتیں آپ
کھڑے ہو جاتے اور بیٹی کی پیشانی چوم کر پیار
کرتے تھے۔

قرآن پاک کی سورہ بقرہ میں ارشاد ہے۔
”وہ (تمہاری بیویاں) تمہارے لئے لباس
ہیں اور تم ان کے لباس ہو۔“
(القرآن: 2-187)

لباس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ یہ پردہ ڈالنے اور
زینت کا ذریعہ ہے۔ شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے

ہیں۔ 1990ء کی ایف بی آئی کی ایک رپورٹ کے مطابق ایک لاکھ دو ہزار پانچ سو پچھن خواتین جبری بے آمدنی کا شکار ہوئیں۔ اور یہ صرف وہ تعداد ہے جن کے کیس پولیس تک پہنچے۔ اعداد و شمار کے مطابق صرف 16 فیصد کیس پولیس تک پہنچ پاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ظلم کا نشانہ بننے والی خواتین کی اصل تعداد 6 لاکھ 40 ہزار سے زیادہ ہے۔ 1993ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ہر 13 منٹ میں ایک عورت جبری آمدوریزی کا نشانہ بنتی ہے۔ پولیس بہت کم مجرموں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ یوں تو امریکہ میں جگہ میں عورتوں کو شمولیت کی اجازت 1901ء سے تھی مگر انہیں عملی شرکت کی اجازت نہ تھی۔ ان کی ذمہ داریوں کا دائرہ کار عام طور پر نرسنگ وغیرہ تک محدود تھا تاہم بعد میں خواتین کے سرگرم رول کے حامی حلقوں اور تحریکوں کے دباؤ پر 1976ء میں خواتین کو کھانا جگہ میں عملی شرکت کی اجازت دیدی گئی جس کی وجہ سے عورتوں کے مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول کے مواقع پیدا ہو گئے جس کا نتیجہ وہی نکلا جو ایسے حالات میں متوقع ہوتا ہے۔ امریکی محکمہ دفاع کی ایک رپورٹ کے مطابق جو 23 اپریل 1993ء کو جاری کی گئی فوجی کیمپ میں 90 افراد کو ریپ کا نشانہ بنایا گیا جن میں سے 83 خواتین تھیں اور 117 فوجی افسران کو انضامی کارروائی کے لئے چارج شیٹ کیا گیا۔ افسروں پر جو فرد جرم عائد کی گئی اس میں کہا گیا کہ انہوں نے فوجی عورتوں کو دوڑنے پر مجبور کیا اور مرد فوجیوں نے ان کے پیچھے دوڑ دوڑ کر ان کے کپڑے توچے۔ ان کو کھل بڑھنے پر پکڑنے پر مجبور کیا اور ان ساتھی

عورتوں کے ساتھ سرعام زنا کیا۔ کئی ممالک میں کم عمر بچیوں (10 سال سے کم) کو حاملہ اور بچوں کو جنم دیتے ہوئے پایا گیا۔ قس کلای، تشدد کا لی گونج اور خسر میں انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے خواتین کے قتل بھی منظر عام پر آتے رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے تشدد کی تعریف اس طرح کی ہے کہ عورت پر تشدد کے کئی طریقے ہیں جس کے نتیجے میں جسمانی، جنسی، دماغی نقصان، خوف زدہ کرنا، جبر، دباؤ اور آزادی سے محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پبلک پلٹ فارم پر بھی اور ذاتی زندگی میں بھی ایک بات اور سامنے آئی ہے کہ تشدد کے مرتکب صرف اپنے خاندان کے افراد ہی نہیں ہوتے بلکہ یہ گورنمنٹ اور دوسرے افراد سے بھی متعلق ہوتے ہیں۔ تشدد کی ایسی بے شمار مثالیں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں مگر مضمون کی طوالت کے خدشہ کے پیش نظر ان سب کو تحریر میں لانے سے گریزاں ہوں۔ قارئین میری اس بات سے بھی متعلق ہوں گے کہ تشدد ایک ظلم ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں تشدد کا مطلب صرف مار پیٹ ہی ہوتی ہے جبکہ آج کے اس جدید دور میں عوام کو خاص طور پر تشدد کے مفہوم سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ (حکومتی سطح پر بھی کام ہو رہا ہے) جس کے مطابق خواتین کے ساتھ نفسیاتی اور جہنماتی بدسلوکی، انتہا پرانے اور آزادی پر پابندی، جسمانی تشدد جھڑپ، بلیک میلنگ، جنسی تعلقات، خوف و ہراس، استیصال خاص طور پر انٹراساؤڈر رپورٹ میں بی بی کا مظلوم ہونے پر غلامی، جسم فروشی، مار پیٹ، قتل، غیرت کے نام پر قتل، کم عمری کی شادی، دلے سے کی شادی، ونی، کاروباری سب عورتوں پر

تشد اور ان پر ظلم کی شکل ہیں۔

ہیں۔ دھکے کھاتی ہیں لوگوں کی ہوس کا نشانہ بنتی ہیں کٹھنوں کی زینت بنتی ہیں۔

پاکستان میں تشدد کے جو واقعات آئے دن سننے پڑھنے اور دیکھنے میں آتے ہیں اس سے معاشرے میں خوف و ہراس اور تشویش پائی جاتی ہے۔ چند سال قبل یعنی 2013ء میں خیبر پختونخواہ میں بشری نامی ایک اداکارہ پر تیزاب ڈال کر اس کی شکل بگاڑی گئی۔ خیبر پختونخواہ سے تعلق رکھنے والی ایک طالبہ ملالہ یوسف زئی جو دہشت گردی کا نشانہ بنی پوری دنیا میں مشہور ہوئی۔ کئی برس پہلے سرگودھا میں ایک ملازمت پیشہ خاتون کو ڈیوٹی پر جاتے ہوئے رکشہ میں ہی تیزاب ڈال کر اس کی حالت بگاڑ دی گئی جو اس کی موت کا باعث بنی۔ باپ بھائی شوہر قریبی عزیز اور غنیمہ عناصر کے ہاتھوں خواتین پر تشدد کے واقعات سال مہینہ دن گھنٹے نہیں بلکہ ہر منٹ میں کئی کئی ہو رہے ہیں۔ ہماری بچیاں ہماری بہنیں ہماری مائیں ہماری بیویاں ان میں سے اکثر تشدد کا شکار ہیں۔ اچھی محفوظ اور بغیر تشدد کے زندگی گزارنے والی خواتین کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اور متاثرہ خواتین میں سے بھی بہت کم خواتین ایسی ہوتی ہیں جو فلاحی اداروں، قانون کے پاسداروں اور دارالامان تک پہنچ پاتی ہیں۔ کچھ خاندانی دباؤ کے اثرات کی وجہ سے ظلم کی بجلی میں ہستی رہتی ہیں مگر نام نہیں لیتیں۔ اُن تک نہیں کرتیں۔ کچھ خواتین اپنے شوہر کے گھر کو اپنا آخری گھر سمجھتے ہوئے دہلیز سے باہر قدم نہیں نکالتیں نہ ہی ہونٹوں پر اپنی کہانی لاتی ہیں۔ جو خواتین دہلیز سے باہر قدم نکالتی ہیں ان میں سے کچھ خوش قسمتی سے محفوظ پناہ گاہوں تک پہنچ پاتی ہیں اور کچھ غلط ہاتھوں میں جا کر مشکلات کا سامنا کرتی

گھر سے بلا سوچے سمجھے باہر قدم نکالنے والی عورت ساری عمر اپنے کئے پر پچھتاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خاتون خانہ ملازمت پیشہ خواتین کی نسبت بہت ہی سیدھی سادی اور نا تجربہ کار ہوتی ہیں۔ انہیں گھر سے باہر نہ نکلنے کے سبب بوجہ سادگی تشدد جیسے مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ ماضی قریب میں بمبیرہ سے تعلق رکھنے والی ایک معروف خاتون نے بس ہوش کی پانی جلد فراہم نہ کرنے پر پٹائی کر دی اور اس کے ساتھ ہی اسے بے ہودہ اور غیر اخلاقی الفاظ سے بھی نوازا۔ ایک خاتون ایم پی اے کو اس کے ڈرائیور نے قتل کر دیا۔ حصول ملازمت، ٹھکانہ ترقی سالانہ خفیہ رپورٹ کی تکمیل دوران ملازمت غیر معمولی مراعات ان سب کے لئے اکثر خواتین جنسی تشدد کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ نادان اور کم عقل والدین قریبی دوستوں عزیزوں اور ملازمین پر اندھا اعتماد کر بیٹھتے ہیں اور وہ ان کے اہل خانہ میں موجود خواتین کی عزت کو پامال کر دیتے ہیں۔ اس طرح سے کئی معصوم بچیاں بالغ ہونے سے پہلے ہی زیادتی کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ سکول اور کالج دیکھن ڈرائیورز کے قہے بھی آئے دن دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں۔ کچھ مائیں اپنی بچیوں کی تربیت بہتر طریقے سے نہیں کر پاتیں نہ ہی اُن پر کڑی نگاہ رکھتی ہیں اور اس کے نتیجے میں ایک اچھے خاندان کی لاڈلی بیٹی اعلیٰ تعلیم اور خاندانی پس منظر رکھنے کے باوجود ایک اوٹی گھر کے ان پڑھ دیکھن ڈرائیور کی بیوی بن جاتی ہے۔

جھوٹی محبت کے جال میں پھنسا کر آج بھی کئی

لیتا ہے۔ بیوی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ان زیورات یا تحائف اور حق مہر کی رقم کو اپنی مرضی سے استعمال کرے۔ نکاح کے موقع پر اگر کوئی جائیداد یا رقم یا ماہانہ جیب خرچ وغیرہ بعد از نکاح دینا قرار پائی ہو تو اس معاہدے سے صاف کر جاتا ہے۔ اس کی ضروریات اور نان نفقے کا خیال نہیں رکھتا۔ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ یہ ضروریات اپنے والدین سے پوری کرے۔

بیوی کا قیمتی جہیز جائیداد مخدوہ چیک اکاؤنٹ کو تو مرد اپنی ملکیت سمجھتا ہے جبکہ بیوی اپنی جہالت اور کم علمی کی بنا پر شوہر کی جانب سے دی گئی چیزیں استعمال کرتے ہوئے شرم محسوس کرتی ہے۔ کئی مرد اپنی ذمہ داریوں سے فرار کیلئے عورت کو حاملہ ہونے کی صورت میں اسقاط حمل پر راضی کر لیتے ہیں اور عورت اپنے اوپر ہونے والے اس ظلم کا کسی سے ذکر تک نہیں کرتی۔ الزا ساؤڈ میں اگر جنس لڑکی ہو تو جب بھی حمل ساقط کروا دیتے ہیں۔ اگر بچے پیدا ہوتے ہیں تو دانت ان کے نام کا اندراج یونین کونسل میں نہیں کروا دیتے تاکہ بچوں کی نکالت کا دعویٰ عورت کی طرف سے دائر نہ ہو سکے۔ بچے بھی بغیر کسی منصوبہ بندی اور بیوی کی رضامندی کے پیدا کئے جاتے ہیں۔

مرد اپنی بیوی کو ضرورت کے مطابق خوراک و آرام اور دیر سہولیات فراہم نہیں کرتے جس سے عورت پچاری خون کی کمی کا شکار ہو کر دیگر کئی مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایسے میں مجھے ایک مقامی بچی یاد آ رہی ہے کہ جب اس کی شادی اس کے ماموں زاد کے ساتھ ہوئی تو وہ لڑکا نشی بھی تھا۔ نشے کی حالت میں اپنی بیوی کا چھانہ چھوڑتا اور لڑکی

مچلے اور اوباش نوجوان مصوم بچیوں کو کونھوں کی زینت بنا دیتے ہیں یا ان کو اپنی قید میں رکھ کر ان کے ذریعے جسم فروشی کا کاروبار کرتے ہیں۔ کئی ایسے واقعات بھی دیکھنے اور سننے اور پڑھنے میں آئے کہ ناجائز تعلقات، فحاشی، جسم فروشی، بلیک میلنگ کے بعد اس خاتون سے جان چھڑانے کے لئے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

جیسا کہ آپ اور میں اکثر اخبارات میں لاوارث یا قلیوں میں تنہا رہنے والی خواتین کی لاشوں کا پڑھتے ہیں، نامہانی آفات، مثلاً زلزلہ، سیلاب، طوفان اور جھرت (جیسا کہ پاکستان بھنے پر مسلمان عورتوں کے ساتھ ہوا) کے موقع پر بھی خواتین کی ایک بڑی تعداد تشدد کا نشانہ بنتی ہے۔ ایسے واقعات صرف غیر شادی شدہ خواتین یا بچیوں کے ساتھ ہی پیش نہیں آتے بلکہ شادی شدہ بال بچوں والی خواتین کو بھی ورغلا لیا جاتا ہے۔ ایسے ظالم مجرموں کو کسی خاندان کے ٹوٹنے اور بچوں کے اپنے والدین سے چھڑنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔

سادہ لوح والدین کی تعلیم یافتہ بچیوں کو پرائیویٹ کینیوں میں پرکشش مراعات کے ساتھ اچھی مخدوہ پر ملازمت آفر کرنے کے پیچھے بھی کئی راز پوشیدہ ہیں۔ بعض خاندانوں میں مشرقی خواتین جو شوہر کے گھر کو ہی اپنا اصلی گھر قرار دیتی ہیں شوہر کے ہاتھوں خوب کھلونا بنتی ہیں۔ اس کی چال بازیوں، دھوکہ دہی اور خفیہ منصوبوں سے بالکل ہی نادانف ہوتی ہیں اور شوہر ان سے حق مہر کی رقم تک واپس لے لیتا ہے یا معاف کر دیتا ہے۔ شادی کے موقع پر دیئے گئے زیورات یا دیگر قیمتی تحائف واپس لے

کردی جاتی ہیں تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا جاتا ہے۔ بے وقت اور بے جوڑ شادی کردی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ نفرت آ میر رویہ اپنایا جاتا ہے۔ بعض اوقات والدین اس کے ساتھ عمر بھر کے لئے قلع قلع کر لیتے ہیں۔ معاشرہ اور اس کے اپنے پیارے سب اس کی زندگی میں طعنوں سے زہر گھول دیتے ہیں۔

تشدد کا شکار ہونے والی بچیاں خواہ وہ ہمکن ہو یا بیٹی اس میں 90 فیصد قصور وار مائیں ہیں کہ

کی ماں نے اس پر دوا ملا کیا تو کسی نے ایک نہ سنی۔ بلاخر بیٹی موت کے منہ میں چلی گئی۔ بعض خاندان اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کم عمری میں ہی (جبکہ ابھی بیٹی کے گڑیا سے کھیلنے کے دن ہوتے ہیں) شادی کر دیتے ہیں ان میں کچھ وٹے ٹٹے کی اور کچھ رقوم کے عوض ہوتی ہیں۔

کم سن اور غیر شادی شدہ بچیوں کے ساتھ تشدد آ میر واقعات سامنے آنے پر مجرم کو سزا دینے یا ہمارا ہلا کہنے کے بجائے لڑکی پر بے جا پابندیاں عائد

محبت کا صلہ

ایک شخص اکثر ایک بوڑھی عورت سے سنگترے خریدا کرتا تھا۔ وزن و پیمائش اور قیمت کی ادا نگلی سے قانع ہو کر وہ سنگترے کو چاک کرتا اور ایک دانہ اپنے منہ میں ڈال کر شکایت کرتا کہ یہ تو کھٹے ہیں..... اور یہ کہہ کر وہ سنگترہ بوڑھی عورت کے حوالے کر دیتا۔ وہ بوڑھی عورت سنگترہ چکھ کر کہتی..... ”یہ تو بالکل میٹھا ہے“۔ مگر جب تک وہ خریدار اپنا تھیلا لٹکر وہاں سے جا چکا ہوتا۔ اس شخص کی بیوی بھی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس کی بیوی نے پوچھا..... ”جب اس کے سنگترے ہمیشہ میٹھے ہی نکلتے ہیں تو پھر یہ روز کا ڈرامہ کیسا؟“۔ اس شخص نے مسکرا کر جواب دیا: ”وہ بوڑھی عورت میٹھے سنگترے ہی بیچتی ہیں لیکن غربت کی وجہ سے وہ خود انھیں کھانے سے محروم ہیں۔ اس ترکیب سے میں ایک سنگترہ انھیں بلا کسی قیمت کے کھلانے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

اس بوڑھی عورت کے سامنے ایک سبزی فروش عورت بھی روز یہ ڈرامہ دیکھا کرتی تھی۔ سو ایک دن وہ پوچھ بیٹھی..... ”یہ آدمی روزانہ تمہارے سنگترے میں نقص نکال دیتا ہے اور تم ہو کہ ہمیشہ ایک زائد سنگترہ وزن میں تولتی ہو۔ کیا وجہ ہے؟“۔ یہ سن کر بوڑھی عورت کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ کہ: ”ہوئی“ میں جانتی ہوں کہ وہ ایسا مجھے سنگترہ کھلانے کے لیے کرتا ہے اور وہ یہ سوچ بیٹھا ہے کہ میں اس سے بیگانہ ہوں۔ میں کبھی زیادہ وزن نہیں کرتی بلکہ یہ تو اس کی محبت ہے جو ترازو کے پلڑے کو جو بھل کر دیتی ہے۔“

محبت اور احترام کی سرستیں ان چھوٹے چھوٹے میٹھے دانوں میں پنہاں ہیں۔ سچ ہے کہ محبت کا صلہ بھی محبت ہے!!

(تحریر: سلیمہ حامد۔ لاہور)

انہوں نے بچیوں کی تربیت کرتے ہوئے انہیں سے violence against women آگاہ نہیں کیا۔ اگر بچیوں میں شعور پیدا ہو جائے تو وہ کافی حد تک اپنا دفاع کر سکتی ہیں۔ اگر یہی وہ مسئلہ ہے تو اس کا شوہر قصور وار ہے کہ اس نے اسے تحفظ فراہم نہیں کیا۔ خاندان کے ٹوٹنے اور الگ رہنے کے رواج نے بھی معاشرے میں عورت پر تشدد کے واقعات میں اضافہ ہی کیا ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام میں خاندان کے بزرگ جواؤں کی رہنمائی اور تربیت میں اعلیٰ کردار ادا کرتے تھے۔ تشدد گھر کے اندر ہوا گھر سے باہر دونوں کے برے اثرات اہل خانہ اور بچے بچیوں پر پڑتے ہیں۔

گھر کے اندر تشدد کی وجہ سے بچوں اور والدین کے درمیان فتنی ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ باپ کی طرف سے ماں پر تشدد ہوتا دیکھ کر بچہ اپنے ذہن میں باپ کے خلاف محاذ آرائی کرنے لگتا ہے۔ اس کا رویہ باغیانہ اور گستاخانہ ہونے لگتا ہے۔ وہ خود بھی جذباتی طور پر الجھ کر رہ جاتا ہے۔ والدین کی آپس میں علیحدگی کی صورت میں بچے میں پیدا ہونے والی افسردگی اور یاسیت بالغ ہونے تک بھی جھلکتی رہتی ہے۔ بعض بچوں میں نکتہ پیدا ہو جاتی ہے، گفتگو متاثر ہونے لگتی ہے، قوت اظہار میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ بچے حالات کے ساتھ موافقت پیدا نہیں کر سکتے، ان کے معاشرتی تعلقات بُری طرح متاثر ہوتے ہیں۔

گھر سے باہر ہونے والے تشدد کے بھی بہت سے نقصانات ہیں۔ معاملہ کی طے تک پہنچنے بغیر ہی اہل خانہ اور معاشرہ نشانہ بننے والے ہی کو قصور وار ٹھہراتا ہے۔ معاملے کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سزا

کے طور پر بے جوڑ رشتہ حلاش کر کے اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ بعض اوقات ماں باپ ہمیشہ کے لئے بچی سے ناطہ توڑ لیتے ہیں جس کی وجہ سے اسے مزید مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بدنامی کا بدلہ داغ اس کی شخصیت پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے جو اس کے روشن مستقبل کو تاریک کر دیتا ہے۔ روزنامہ ایکسپریس 25 نومبر 2018ء کی ایک خبر کے مطابق فوزیہ قادر چیمبر پرسن پنجاب کمیشن برائے حقوق خواتین اور انیم زید اسسٹنٹ کمشنر جنرل نے کمشنر آفس لاہور میں پریس بریفنگ میں بتایا کہ پنجاب میں امسال خواتین کو ہراساں کرنے کی 8 ہزار شکایات سامنے آئی ہیں جبکہ خواتین پر تشدد اور اغوا کی تعداد گیارہ ہزار ہے۔ انہوں نے بتایا کہ خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک خصوصی عدالت بھی کام کر رہی ہے اور مردوں کو خواتین کے تحفظ کے لئے سرگرم کردار ادا کرنا ہوگا۔ انیم زید اسسٹنٹ کمشنر جنرل لاہور نے پریس بریفنگ میں بتایا کہ خواتین کے تحفظ و حقوق کیلئے آگاہی سیمینار منعقد کئے جائیں گے۔ فوزیہ قادر نے کہا کہ ہر سال 25 نومبر سے 10 دسمبر تک اقوام متحدہ بین الاقوامی ادارے اور دنیا بھر کے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے خواتین کے حقوق کی ترویج اور تشدد کے خاتمے کے لئے مہم چلاتے ہیں۔ میں اس مضمون کے اختتام پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ مسلم معاشرے میں تشدد کی کہیں بھی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن و سنت پر عمل کرتے ہوئے اسلامی طرز زندگی اختیار کر کے ہم تشدد سے چمکارا پاسکتے ہیں۔



گلاب خان سولنگی

اچانک ہمیں غلطی کا احساس ہوا۔ ”ارے یہ کیا ہم جیتے کے پیچھے ہیں یا جیتا ہمارے پیچھے؟“ میں نے ساتھیوں سے کہا۔ یہ سوچ کر خوف کی ایک سرد لہر سرایت کر گئی کہ جیتا اب ہم پر کسی بھی لئے حملہ کر سکتا ہے۔ بڑی شکل سے ایک درخت پر چڑھ کر جان بچائی۔

پولیس اہلکار کی کہانی اسے اپنی زندگی کے سب سے عجیب ”محرم“ کو گرفتار کرنا تھا۔

بند کرنے کو جی چاہتا ہے مگر فی الحال سیارہ ڈائجسٹ کے قارئین کے لئے ایک دلچسپ اور سچا واقعہ بیان کر رہا ہوں جو دورانِ سر دس سوات کے پہاڑی جنگلوں کے درمیان پیش آیا۔
میں پولیس میں بطور سپاہی بھرتی ہوا تھا اور

پولیس کی نوکری بھی عجیب ہے وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ سروس کے دوران ایک پرسکون و پرامن زندگی کے لئے ترسنا اور آخر میں ریٹائرمنٹ کی زندگی اور یادیں۔ بس یہی زندگی ہے۔ زندگی کی بے شمار یادوں اور باتوں کو لے کر اچھی خاصی کتاب قلم

سوات میری دوسری پوسٹنگ تھی۔ یہ بڑے کی دہائی کا واقعہ ہے اس وقت میری عمر 25 سال اور سروس 5 سال تھی۔ کرلہجی ہوم نشین تھا اس لئے جب جادوے کا لیٹر وصول ہوا جب کافی پریشانی محسوس ہوئی تھی۔ بس یوں سمجھیں سرکار صوبہ بدر کر رہی تھی۔ ان دنوں ایسی کوئی حکومتی پالیسی چل رہی تھی۔ میرے کچھ جاننے والوں کا لاہور جادوہ کیا گیا تھا وہ بھی خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

میں ابھی کنواری تھا اس لئے کوئی خاص سامان نہیں لیا بس ضروریات زندگی کے سامان کے علاوہ کچھ ضروری دستاویزات اور ٹرانسفر آرڈر لیا اور سرشام ہی کراچی ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ کافی ٹیک و دو کے بعد پشاور کی سیٹ بمعہ برتھ مل گئی۔ میں نے سب سے پہلے اپنے سامان کو ایک محفوظ کونے میں رکھا اور خود اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ آس پاس والے مسافر بھی میری طرح کم گو اور سنجیدہ قسم کے لوگ تھے اس لئے کراچی تا پشاور کا سفر بہت آرام دہ اور خوش اسلوبی سے طے ہوا۔ اگلے دن شام سے پہلے ہم پشاور پہنچ گئے۔ پشاور سے ٹیکسی پکڑی اور رات سے پہلے سوات شہر کے ایک نواحی قہانے میں موجود تھا۔ جہاں میں نے ڈیوٹی جوائن کی وہ چھوٹا سا دیران قہانہ تھا۔ وہاں کا قہانے دار مقامی تھا اور میرے علاوہ 8 الٹرا تھینات تھے۔ وہ بھی تقریباً مقامی ہی تھے۔ اپنی روایات کے مطابق انہوں نے میرا شاندار استقبال کیا اور کافی دنوں تک مہمان نوازی بھی کرتے رہے۔

سوات میری دوسری پوسٹنگ تھی۔ یہ بڑے کی دہائی کا واقعہ ہے اس وقت میری عمر 25 سال اور سروس 5 سال تھی۔ کرلہجی ہوم نشین تھا اس لئے جب جادوے کا لیٹر وصول ہوا جب کافی پریشانی محسوس ہوئی تھی۔ بس یوں سمجھیں سرکار صوبہ بدر کر رہی تھی۔ ان دنوں ایسی کوئی حکومتی پالیسی چل رہی تھی۔ میرے کچھ جاننے والوں کا لاہور جادوہ کیا گیا تھا وہ بھی خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

میں ابھی کنواری تھا اس لئے کوئی خاص سامان نہیں لیا بس ضروریات زندگی کے سامان کے علاوہ کچھ ضروری دستاویزات اور ٹرانسفر آرڈر لیا اور سرشام ہی کراچی ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ کافی ٹیک و دو کے بعد پشاور کی سیٹ بمعہ برتھ مل گئی۔ میں نے سب سے پہلے اپنے سامان کو ایک محفوظ کونے میں رکھا اور خود اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ آس پاس والے مسافر بھی میری طرح کم گو اور سنجیدہ قسم کے لوگ تھے اس لئے کراچی تا پشاور کا سفر بہت آرام دہ اور خوش اسلوبی سے طے ہوا۔ اگلے دن شام سے پہلے ہم پشاور پہنچ گئے۔ پشاور سے ٹیکسی پکڑی اور رات سے پہلے سوات شہر کے ایک نواحی قہانے میں موجود تھا۔ جہاں میں نے ڈیوٹی جوائن کی وہ چھوٹا سا دیران قہانہ تھا۔ وہاں کا قہانے دار مقامی تھا اور میرے علاوہ 8 الٹرا تھینات تھے۔ وہ بھی تقریباً مقامی ہی تھے۔ اپنی روایات کے مطابق انہوں نے میرا شاندار استقبال کیا اور کافی دنوں تک مہمان نوازی بھی کرتے رہے۔

ان دنوں سوات امن کا گہوارہ تھا اس لئے ڈیوٹی کے دوران کوئی خاص پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ قہانے دار کے ساتھ بھی میرے تعلقات ٹھیک تھے۔

ایک دن مقامی گاؤں والوں نے قہانے دار سے شکایت کی کہ ان کے سیبوں کے باغات ہیں اور سیب بھی پک گئے ہیں لیکن نہ جانے کہاں سے ایک جنگلی چیتا آدھڑا ہوا ہے اور کافی لوگوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ مگر جنگلات والے ہماری التجا سننے ہی نہیں۔ اگر حالات اس طرح رہے تو سیبوں کے باغات ضائع ہو جائیں گے اور فصل خراب ہونے کی وجہ سے کافی مالی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ وہ اپنے ساتھ ہمارے لئے وافر مقدار میں سیبوں کی پیشیاں بھی لائے تھے لیکن قہانے دار نہایت ایماندار شخص تھا اس نے وہ سب کچھ واپس کر دیا اور چہرے کے لئے تین الٹراؤں کو چٹا جس میں میں بھی شامل تھا۔ ہم کو گاؤں والوں کے ساتھ بھیج دیا اور ہمیں حکم دیا کہ جنگل کی گھرائی کریں تاکہ وہ جنگلی چیتا ہمیں دیکھ کر بھاگ جائے۔ سو ہم تین الٹرا بمعہ سرکاری اسلحہ ان گاؤں والوں کے ساتھ ہوئے۔

ہفتے میں ایک دفعہ قہانے دار اپنی جیب میں

سمارٹ بنانے والی کرسی

ماہرین ایک ایسی ”ڈیزائن آف کرسی“ تیار کر رہے ہیں جو خود پر بیٹھنے والے کو چربی گھلانے اور وزن گھٹانے سمیت، صحت بہتر بنانے کی بیشتر ورزشیں بیٹھے بیٹھے ہی کروادیا کرے گی۔ جرسی کی بائیکل فیلڈ یونیورسٹی کے ماہرین یہ کرسی تیار کر رہے ہیں جو بظاہر معمولی سی کرسی دکھائی دیتی ہے لیکن درحقیقت یہ درجنوں ایسے خودکار آلات سے لیس ہے جو اس پر بیٹھنے والے کو شناخت کر سکتے ہیں، دھڑکن کی رفتار اور وزن سے لے کر صحت سے متعلق دوسری اہم معلومات پر نظر رکھ سکتے ہیں، بیٹھے بیٹھے کئی ورزشیں کرا سکتے ہیں، نشست و برخاست (پوچر) کے بہتر انداز کے بارے میں مشورے دے سکتے ہیں اور بیٹھنے والے کی جسمانی کیفیات میں بتدریج تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ان ورزشوں کے دورانیے اور نوعیت میں بھی تبدیلی کر سکتے ہیں۔

گاؤں کا چکر لگاتا تھا اور ہم سے رپورٹ لیتا تھا۔ گاؤں والے بھی ہمارے پہرے کی وجہ سے اب کافی خوش تھے۔ وہ برابر اپنے سیبوں کے باغات میں کام کرتے تھے اور کچے ہوئے سیب پورے ملک میں سپلائی کرتے تھے۔ تین بیٹے تو آرام سے گزر گئے اور ہم بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ دن رات مفت کی روٹی اور سیب کھا کر ہم آرام پسند ہونے لگے تھے کہ ایک دن جنگلی چیتے نے ایک گاؤں والے کو چہرہ چھاڑ ڈالا اور اس کی لاش پاس والے جنگلات سے برآمد ہوئی۔ ہم تینوں الٹا اپنے ہتھیار لے کر جنگل میں کافی آگے نکل گئے مگر چیتا ہمیں نہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ ہم واپس گاؤں آگئے اور لوگوں سے اہل کی کہ فیبر ضروری طور پر گھر سے باہر مت نکلیں خصوصاً رات کے وقت جنگل جانے سے پرہیز کریں۔

یہ پہلا واقعہ تھا کہ جنگلی چیتے نے کوئی جانی نقصان پہنچایا تھا وگرنہ اس سے پہلے تو اس نے لوگوں کو صرف ڈنکی دیا تھا۔ لگتا تھا کہ ہمارے آرام پسندی کی وجہ سے اسے موقع ملا اور اس نے ایک غریب آدمی کو اپنا شکار بنالیا۔ ہم ایک دوسرے کو کوس رہے تھے لیکن اس دوران ہم ایک نئے جذبے کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوئے۔ اب ہم پہلے کی طرح چوکے ہو گئے تھے۔ رات کو جنگلات میں جا کر پہرے داری انجام دیتے تھے اور دن کو گاؤں سے ملحقہ باغات کی نگرانی کرتے تھے اب کی بار تھانے دار نے جانی نقصان ہونے پر ہماری خوب باز پرس کی اور ڈیوٹی حریہ بڑھا دی۔ اب ہم تینوں اہلکاروں کو باری باری پراگریس رپورٹ تھانے دار کو ارسال کرتا تھی۔ جسمانی مشقت کے علاوہ کاغذی کارروائی

بھی ہمارے ذمہ آگئی تھی یہ سب چلتا رہتا ہے اور یہ سب فرائض میں شامل تھا۔

ایک رات ہم تینوں اہلکار جنگل میں بہت آگے نکل گئے۔ قارئین کرام! ہم پیشہ ور ماہر شکاریات تو نہیں تھے مگر خطرے کی صورت میں اپنا دفاع کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جنگلی چیتے کا خوف ہمارے اعصاب پر زیادہ چھانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ رات گہری تھی اور تاریکی میں جنگل کی فضا حریہ خوفناک ہوتی جا رہی تھی کہ اچانک پرے جھاڑیوں میں سے وہی جنگلی چیتا نمودار ہوا جس کی ہم سب کو تلاش تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر زور سے غرایا اس سے پہلے کہ وہ ہم پر حملہ کرتا ہماری بندوقوں کا زرخ اس کی طرف ہو گیا۔ ویسے تو پولیس کی گولیاں بھرموں کا

تھیں۔ اب ہمارہ ارادہ چیتے کو زندہ پکڑنا تھا اس لئے یونہی ایک دن ہماری ٹیم نے ایک بہت بڑا اور مضبوط جال لیا جو حلقہ جنگلات والے جانوروں کو پکڑنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ایک درخت کے نیچے گوشت کے کٹڑے پھینکے اور اوپر درخت پر جال رسی کے تنے سے اس طرح لٹکایا جیسے ہی کوئی چرند پرند پاؤں رکھتا دھڑام سے جال اس کے اوپر آگرتا اور جانور جال میں قید ہو کر رہ جاتا۔ بظاہر تو یہ مہم بڑی خطرناک لگ رہی تھی لیکن مرتے کیا نہ کرتے تھے مترادف ہمیں ہر حال میں چیتے کو پکڑ کر واپس بائیں ڈیوٹی پر واپس جو جانا تھا۔ ہم لوگ کھنی جھاڑیوں میں پیسے بیٹھے تھے۔ شام ہو گئی تھی انتظار کرتے کرتے ہم تک ملے تھے۔

اچانک جنگلی پرندوں کا شور اٹھا اور ہم لوگ بھر چوکنا ہوئے۔ دُور سے ہی چیتے کے دھاڑنے کی آواز سنائی دینے لگی اچانک ایک چیتا نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہماری نظروں کے سامنے عین پھندے کے نیچے گوشت کے اوپر جھکا پڑا تھا۔ وہ بھوکا تھا اور اسی لیے گوشت پر ٹوٹ پڑا۔ تب دھڑام سے جال اس کے اوپر آگرا اور وہ زور زور سے غرائے لگا۔ چیتے کو جال میں پھنسا دیکر ہمیں کافی ہمت ملی اور ہم لوگ جھاڑیوں سے نکل کر چیتے کے پاس آگئے۔ پولیس لائف میں بڑے سے بڑا مجرم دیکھا تھا مگر مجرم چیتا آج پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس مہم میں سرخرو ہوئے۔ سارے گاؤں والوں نے چیتے کو دیکھا اور بعد ازاں اسے شہر کے چڑیا گھر بھیجا گیا تاکہ مقامی چیتے کو بچے اور بڑے سبھی دیکھ سکیں۔

پتھا کرتی ہیں مگر یہاں کی پوچھن کچھ مختلف تھی۔ ہمارے سامنے کوئی مجرم نہیں بلکہ جنگلی مجرم عرف خونخوار چیتا بخش نہیں کھڑا تھا وہ بھی غصے میں۔

حسب معمول ہماری گولیاں ٹھیک نشانے پر نہیں لگیں مگر گولیوں کی دہشت سے چیتا ضرور ڈر کے بھاگا۔ اب چیتا آگے آگے اور ہم ابھار اس کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی گول چکر میں گھوم رہے تھے۔ پھر اچانک ہمیں غلطی کا احساس ہوا۔ ”اے یہ کیا ہم چیتے کے پیچھے ہیں یا چیتا ہمارے پیچھے؟“ میں نے ساتھیوں سے کہا۔ یہ سچ کر خوف کی ایک سرد لہر سرائیت کر گئی کہ چیتا اب ہم پر کسی لمحے حملہ کر سکتا ہے۔ بڑی مشکل سے ایک درخت پر چڑھ کر جان بچائی۔ اب جنگلی چیتا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ گئے جنگل میں سراگ گیا تھا۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد ہم بھی درخت سے نیچے آگئے۔ کافی دیر تک ایک دوسرے سے بحث مباحثہ چلتا رہا۔ آخر کار ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ چونکہ ہم کوئی ماہر شکاری تو نہیں ہیں جو اس جنگلی درندے سے پٹ سکیں لہذا اب ہمارا رُخ گاؤں کی طرف تھا۔ چیتے سے مڈھ بھینر والا واقعہ ہم نے لوگوں سے غلطی رکھا تاکہ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ چیتا اب چاچکا ہے اور ہماری نوکری کا مجرم رہ جائے۔ اس طرح کافی دن گزر گئے۔

موسم سرما شروع ہو چکا تھا لیکن لگتا تھا ٹھکے نے ہمیں بھلا دیا تھا اور تھا نہ دار بھی اب کم ہی یہاں کا رُخ کرتا تھا۔ گاؤں والوں سے زیادہ ہم لوگ اس جنگلی چیتے سے خوف آگئے تھے۔ ہم نے اب باقاعدہ ماہر شکاری اور حلقہ جنگلات کی خدمات حاصل کی



زارا رضوان

اک ذرا اعتبار

وہ زہر پلے لہجے میں بولا ”میری بات مان کر فوٹو شوٹ کر لیتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ایک دوسرے کیساتھ ہوتے، مگر تمہیں تو عزت کی پروا تھی۔ اب جاؤ اپنی نام نہاد عزت لیکر اپنے ماں باپ کے پاس۔ انہیں یقین دلانا اپنی پاکیزگی کا۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ آج تم اُنکے پاس پہنچ جاؤ گی“

ذرا غیر میں اپنوں کے ستم کا نشانہ بننے والی ایک لڑکی کی کہانی

کو بکلی سی جنبش دی اور واپس کھٹنے کیلئے سر جھکا لیا۔

”یہاں کیسے آئی؟“ آپ کی بار بھی سوال انگریزی

میں ہی کیا گیا۔

”مس حنین امریکہ کیسے آئیں آپ؟“۔ جواب نہ

پا کر اُس نے دوبارہ پوچھا۔ وہ نہ صرف خوفزدہ تھی بلکہ

اُس آفیسر سے کافی خائف بھی لگ رہی تھی اسلئے

”نام.....؟“

”حنین.....“

”پیشانی.....“

”پپ..... پاکستان“۔ لوجوان پولیس آفیسر نے

قلم روک کر حنین کے گالے چومے کو دیکھا جو ڈر و خوف

کے باعث سفید ہو رہا تھا۔ نظر ایک لمحے پر محیط تھی۔ سر

لڑکیاں موجود ہیں۔“

”نہیں نہیں۔ ہم میں کاروبار کرنے والی نہیں۔ عزت دار۔“ وہ ہاتھ جوڑتے گڑگڑائی۔ الفاظ دم توڑ گئے۔

”دیکھو مس! اگر اسی طرح روتی رہی تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ جہیں کم از کم میرا یقین تو کرنا ہوگا تا میں مدد کر سکوں۔ ورنہ ہمیں رہو اور انتظار کرو کہ کب کوئی تمہارا سودا کر جائے۔“ اُس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تو حسین نے ہنسنے لگا۔

”یہاں قیدی لڑکیوں کو منتخب ناجائز کاموں کیلئے استعمال کیا جاتا ہے پر آزاد وہ پھر بھی نہیں ہوتیں۔ اس قید سے نکل کر ایسی قید میں جلی جاتی ہیں جہاں ہر قدم دلدل میں دھنسا چلا جاتا ہے۔ تم اچھے ٹھمرانے کی لگ رہی ہو۔ مجھے وہ مجبوری بتاؤ جو تمہیں یہاں تک لائی ہے تاکہ تمہاری مدد کر سکوں۔“ آپ سے تم تک کا فاصلہ طے کرنے میں کچھ شش لگے۔ اس بار وہ اُردو

میں مخاطب تھا۔ لہجہ قدرے نرم اور دوستانہ تھا۔ آنکھوں میں یقین دہانی کی قدیلیں روشن تھیں۔ قوی زبان کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سن کر حیران ہوئی لیکن تذبذب کا شکار تھی کہ کیا اُس پر یقین کیا جائے؟ دیار غیر میں کیا وہ واقعی ہی ہمدرد مسیحا ثابت ہوگا؟ کیا وہ اسکی مدد کرے گا یا بھر؟ اس سے آگے اسکی سوچ، سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہو جاتی۔ چاند خاموشی۔ کھٹن وڈ شوار راستہ اور بے یقینی کا تھکا دینے والا سفر۔ آ رہا پار۔ لیکن یقین تو کرنا ہی تھا۔ یہی سوچ کر اُس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

☆☆☆☆☆

”ارے رے کوئی بہانہ نہیں چلے گا چلو سب کو ٹریٹ دو شاہاش۔“ سمو سے ہاتھ صاف کرتی حسین کے کانوں میں جوں دیکھتی نہ دیکھ کر رابعہ نے چٹکی بجاتی لیکن اُس طرف سے کوئی ریسپانس نہ پا کر منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر خاموشی چھا گئی۔

”ڈھنکاں تو دیکھو مہتر مکی۔ ایک تو بن تائے مٹکی

چاہنے کے باوجود بول نہ پائی۔ نظریں جھکائے غم آنکھوں سے میز پر پڑے گلاس کو گھورتی رہی جیسے وہ وہاں اُسی کو دیکھنے کیلئے لائی گئی ہو۔

”دیکھئے حسین۔ اگر آپ میرے ساتھ تعاون نہیں کریں گی تو میں آپکی مدد نہیں کر سکوں گا۔“ وہ قلم کو فائل پر تقریباً بیٹھے ہوئے بولا۔ لہجے میں جھنجھلاہٹ واضح تھی۔ اُس نے سر کو کرسی کی پشت سے لگایا، لمبا سانس لیا اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”ہمیں بے پار مددگار رہنا چاہتی ہو؟ تم نہیں چاہتی ہو کہ میں تمہیں پاکستان واپس جانے میں مدد دوں؟“ اُس نے بھونپ کر پوچھا تو حسین نے بغیر کچھ کہے اثبات میں سر ہلادیا۔

”تو مجھے پوری بات بتاؤ۔ بتاؤ یہاں کیسے آئی؟ یا کسی کے ساتھ آئی؟ کون لایا؟“

وہ خاموشی سے ہونٹ چباتی رہی۔

”ہوٹل سے یہاں تک کا سفر ٹھن ہے۔ لیکن اسکے بعد جو سفر شروع ہوگا وہ ذلت بھرا، اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوگا۔“

جواب نہ اُردو۔ ذہنی سسکیاں!!۔ پولیس افسر نے ضبط سے مضامین ہینچ لیں۔

”ایسا سفر جس کا خواب میں سوچا ہوگا نہ کوئی لڑکی سوچ سکتی ہے۔ جس پر چل کر پاؤں کیساتھ جسم اور جسم کیساتھ ساتھ روح تک پہنچتی ہو جائے گی۔ تب یہ سسکیاں سننے والا کوئی نہ ہوگا۔“ ایک ایک لفظ غصہ کر آدا کر کے اُسکو اُردو اور انگریزی میں سمجھایا۔ حسین نے ہل بھر کو نظریں اٹھائیں۔ آنکھیں رو رو کر سو جھکی تھیں۔

ستواں ناک سرخ ہو رہی تھی۔

”کھڑی ہو جاؤ۔“ وہ اُسکا بازو پکڑنے کیلئے آگے بڑھا۔

”تک کہاں؟“ وہ ہنسنے لگا۔

”کک کہاں؟“ وہ ہنسنے لگا۔

”لاک آپ میں جہاں کاروبار کرنے والی ہاتی

ایک رنگ جا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی اپنے مگیتز کے مقابلے میں وہ کم صورت ہے لیکن اس بات کا اہتمام آج تک اُس نے خود سے نہیں کیا جو انوشے نے سب کے سامنے کہہ ڈالا۔

”بی بیو یور سیلف۔ یہ کس قسم کی باتیں کر رہی ہو۔“ جنین نے لڑا۔ رابعہ نے آنکھوں میں آنی نمی اپنے اندر اتاری۔

”آئی واز جوتنگ (میں مذاق کر رہی تھی)۔“

”وازدیٹ جوت؟ (کیا یہ مذاق تھا)۔ کسی کا دل دکھانا مذاق نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اترانے والوں اور بدائی کرینڈالوں کو پسند نہیں کرتا انوشے۔ کسی کی دل آزادی کرنا بہت بری بات ہے۔ ہمارا دین ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم کسی کا مذاق بنائیں یا اپنی باتوں سے دل دکھائیں۔“ کلوم نے کہا۔ پھلکی سی مسکراہٹ نے رابعہ کے چہرے کا معاملہ کیا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی کلوم اُسکے لئے بول رہی تھی۔ اُس کے الفاظ رابعہ کے لئے مہم کا کام کرتے تھے۔

”رانی کا رنگ سانولاً ضرور ہے لیکن وہ کم صورت نہیں۔ کسی کو اُس میں حسن نظر نہیں آتا تو اس میں قصور اُٹکا ہے نہ کہ رابعہ کا۔ یوں بھی حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ میری نظر میں رانی بہت خوبصورت ہے اس لئے نہیں کہ دوست ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس کا دل صاف ہے۔“ جنین نے رابعہ کا ہاتھ پکڑ کر اُسکو ساتھ لگایا تو وہ آنسو رابعہ کی آنکھوں سے گرے جو اُس نے بہت خوبصورتی سے چھپا کر پونچھ ڈالے۔

رابعہ کافی اچھے نین نقش کی مالک تھی، متناسب جسم لیکن دیکھنے والوں کو صرف رنگ نظر آتا۔ انوشے جیسے نقوش کیساتھ گوری رنگت لئے دھان پان لڑکی تھی۔ گھٹنوں سے کٹی جھڑ، کردہ اور کندھے پر بڑا سائیک لٹکائے وہ کسی بڑے گھر کی چشم و چراغ لگتی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ وہ شلواریں پہنے ہوتی۔ کلوم سادہ طبیعت کی اچھے نین نقش والی لڑکی تھی۔ جسم قدرے

کردالی اوپر سے کجی کی انتہا۔ بہت غلط بات ہے۔“ رابعہ چھٹا ناراض ہو گئی۔

”ایک تو تم لوگوں کو ہمیشہ کھانے کی پڑی رہتی ہے۔ مجال ہے جو کبھی پر یک لگائی ہو منہ کو۔ چلو اٹھو۔“ رابعہ کا چھوٹا منہ دیکھ کر سمو سے کی آخری ہامیٹ لیتے ہوئے جنین نے کہا تو یاہو کا مشترکہ نعرہ لگاتے ہوئے سب کچھین کی جانب بھاگ اٹھیں۔

”مختلک فور ٹریٹ جی۔“ دے کر تے کیا ہیں موصوف؟“۔ برگر کیساتھ انصاف کرتی انوشے نے کولڈ ڈرینک کاسپ لیتے ہوئے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“

”کیا مطلب معلوم نہیں؟“۔ رابعہ حیران ہوئی۔

”مطلب صاف ہے کہ نہیں معلوم کیا کرتے

ہیں۔ یہ پتہ ہے کہ باہر ہوتے ہیں۔ پاپا کے دوست ہاشم اکل کے فریڈ کا بیڑا ہے۔ اس سے زیادہ مجھے پتہ ہے نہ جانے کی ضرورت کیونکہ میرا باہر جانے کا خواب پورا ہو جانے کا بھی بہت ہے۔“ ہالوں کی لٹ پیچھے کرنی وہ آدا سے بولی۔ ”ہائے“ مجھے بھی دنیا کھونے کا بہت شوق ہے۔ ویسے جی ذرا اپنے اُس پاس دیکھنا شاید میرے لئے بھی کوئی لی ہی جائے۔“ انوشے نے مصغی آہ بھر کر کہا۔

”جنین تم بالکل جاہلی گڑیا لگتی ہو۔ کسی دیس کی بری، کسی ملک کی شہزادی۔ خوبصورت آنکھیں، مٹھی پلکیں، روشن چہرہ اور صمیم مسکراہٹ۔ اور حقیقت اللہ نے تمہیں مکمل بنایا ہے۔“ کافی دیر سے خاموش بیٹھی رابعہ نے کٹے دل سے جنین کی تعریف کی۔ وہ جھینپ گئی۔

گال شرم سے لال ہو گئے۔

”رانی تمہارا فانی بھی تو باہر ہوتا ہے؟ ویسے یار ہے بہت ونڈم۔ لیکن فرینکلی سیکنگ یار تمہارا اور اُسکا کوئی بچ نہیں۔ آئی مین یور کیل از ناٹ پریٹ۔“ انوشے کی کبھی بات پر رابعہ کا دل کٹ سا گیا۔ اُس کے سانولے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا

منہاں بھیج لیں۔ آنسو پکوں کی بار تو ذکر پہنچے کہ چناب تھے۔

”واٹ؟“۔ جواب پر تینوں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”تم دونوں کی نسبت تو چار سال سے طے قلمی پھر یہ سب؟“۔ انوشے نے حیرانی سے پوچھا۔ وہ تینوں شاک کی کیفیت میں تھیں۔ چار سال معنی رکھتے ہیں۔ رابعہ کی دلی وابستگی بجائے۔ انوشے یہ بات ہضم نہیں کر پا رہی تھی جبکہ حنین حیرت سے اُسکو تک رہی تھی۔

”کونسا کیزا کا جواب یاد آیا کہ یہ رشتہ فٹ نہیں؟“ حنین کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ تینوں نے رابعہ کا چہرہ بغور دیکھا۔ سناٹولا رنگ مزید سنولا گیا تھا۔ آنکھوں میں ڈھکھکی پر چھائیاں واضح تھیں۔

”میں اُسکے لیول کی نہیں“۔ جھکی گردن، نیچی نگاہیں اور لہجہ ایسا جیسے کوئی بچہ اپنی ہی غلطی کی بابت بتا کر شرمندہ ہو رہا ہو۔ دونوں کھٹے موڑھے زمین پر بیٹھی ایک ہاتھ سے گھاس توڑتی وہ قابلِ رحم رہی تھی۔ آنکھوں میں آئے آنسو اُس نے سرعت سے صاف کئے۔

”وہ کہتا ہے میرے جیسی کم صورت لڑکی اُسکے ساتھ بیچ نہیں کرتی۔ وہ ایسی لڑکی چاہتا ہے جو باؤ صبا سی ہو، اُسکے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلے اور جب چلے تو لوگ دیکھتے رہ جائیں جبکہ میرا ساتھ اُسکے لئے باعثِ شرمندگی ہوگا۔“

”ہاؤمین ہی اڑ۔ اتنی غصیا سوچ۔۔ اب جا کر یاد آیا ہے کہ تم اُسکے ساتھ نہیں جتنی؟ دل کرتا ہے ایک تمپڑ رسید کروں ایسی ذہنیت کے لوگوں کو؟“۔ کلثوم نے پوچھا۔

”ظاہر ہے وہ بھی مجبور ہیں بیٹے کے ہاتھوں۔ زبردستی نہیں کر سکتے بھی تو منگنی توڑی سحرت

فریہ نائل تھا لیکن شیریں لہجہ اُسکی پچان تھا۔ ہر لفظ شہد میں تر لگتا۔

”آئی ایم سوری رابی۔ یارنڈا نہ مانا کرو۔ آئی واز جو کنگ، یو نو۔ ہمیں عزیز ہو بلکہ ہم سب ایک دوسرے کو عزیز ہیں۔ آئنز آل بیٹ فرینڈز ہیں۔ ہیں نہ؟“۔ انوشے نے کان پکڑ کر سوری کہا تو تینوں اثبات میں سر ہلا کر ہنس پڑیں۔

”ایمی دیز یہ بتاؤ کیا لوگ قابلِ اعتبار ہیں؟ آئی مین کافی لمبا ریلیشن نہیں۔ پایا کے فرینڈ کے فرینڈ کا بیٹا؟ چھان مین وغیرہ کروالٹی کسی ایک باز۔ انوشے واپس اصل موضوع پر آئی۔

”پایا نے کروالی ہوگی چھان مین تبھی تو رشتہ کیا۔ یوں بھی فیملی کافی اچھی ہے۔“ چیزیں سمیٹتی حنین نے جواب دیا اسنے میں تیل ہوئی تو چاروں یونیفارم جھاڑنی کلاس روم کی جانب بڑھ گئیں۔

☆☆☆☆☆

”بہت چپ چپ رہنے لگ گئی ہو۔ لگتا ہے اُسکی یاد شدت پکڑ رہی ہے۔“ انوشے نے رابعہ کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے چھیڑا۔

”یاد نہیں۔ محبت۔“ کلثوم نے کندھا ٹکرا کر کہا۔

”محبت؟ ہنہ۔ محبت ایک لفظ اور چار حروف کے سوا کچھ نہیں یہ۔“ رابعہ نے غمی سے کہا۔

”جی سچ بتاؤ کیا بات ہے؟ جو ہم سمجھ رہے ہیں دیا تو نہیں؟“۔ انوشے کے سوال پر رابعہ نے ایک نظر تینوں کو دیکھا اور سر جھکا لیا جیسے مجرم ہو۔

”دیکھو یہ مت کہنا کوئی بات نہیں؟“۔ حنین نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر کہا تو آنسو بمشکل ضبط کر کے بولی۔

”مجھے ٹھکرا دیا گیا ہے، رد کر دیا گیا ہے وجود میرا۔“ آنسو ضبط کرتے ہوئے منہ نیچے کر لیا۔

”کیا مطلب؟“۔ انوشے نے اُسکی تھوڑی اوپر کرتے ہوئے پوچھا۔

”انہوں نے منگنی توڑ دی ہے۔“ شدت ضبط سے

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم الشان ایمان افروز پیشکش

شائع ہو گیا ہے!

طِبِ نَبَوِیْ

جسمانی اور روحانی امراض کا نبوی طریق علاج

☆ رسول اکرمؐ نے حسب ضرورت خود بھی دوا استعمال فرمائی اور آپؐ

URDU TUBE

A HOME OF URDU TUBE

WWW.URDU-TUBE.COM

نے بعض بیماریوں کا علاج بھی تجویز فرمایا۔

☆ رسول اللہؐ کی بتائی ہوئی غذائیں، مشروبات، پرہیز اور جڑی بوٹیاں۔

☆ دل کی بیماریوں، بخار، پیچش، قبض، آشوب چشم، پھوڑے پھنسیاں، درد

سر اور شقیقہ، کھجلی اور بہت سی بیماریوں کا نبوی طریقہ علاج۔

☆ مرگی، جادو، نظر بد، جلدی امراض، بے چینی، بے خوابی اور دیگر امراض

کا روحانی علاج۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن، لاہور۔

فون: 37245412

پہنچی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ کوئیل نہیں لگ رہا تھا جو رابعہ کا منگھیر تھا۔ یہ تو کوئی اور تھا۔ لائیٹ براؤن بال، نیلے لیزر اور فریج بیئرڈ میں وہ کوئی نیا کوئیل تھا۔ تبھی کلثوم، انوشے پچان نہ پائیں اور پچانتی بھی کیسے انہوں نے ایک بار تصور دیکھی تھی وہ بھی چار سال پہلے جبکہ جنین نے وہ بھی نہ دیکھی تھی۔

”اچھا تو یہ تھا تمہارا انتخاب کوئیل صادق۔ یہ تھی تمہاری پسند۔ خوبصورتی، دلکشی، مازن ازم۔ میری محبت، چاہت، وقاصب میں پشت ڈال کر کیسے مطمئن اور آسودہ ہو۔ وہ دل ہی دل میں کوئیل سے گویا ہوئی۔

آنکھیں جھلکنے کو بیتاب تھیں۔ کوئیل کے چہرے پر ملال، پشیمانی یا کسی بھی قسم کی دانتگی اور واقعیت نہ تھی اگر کچھ تھا تو اجنبیت اور بیگانگی۔ رابعہ جنین سے مل کر بغیر کسی کو کچھ کہے وہاں سے چلی گئی۔ وہ جانتی تھی زیادہ دیر تک آنسوؤں کو چلوں کی باز توڑنے میں کامیاب نہیں رہے پائے گی۔

☆☆☆☆☆

جنین خود کو دنیا کی خوش قسمت لڑکی تصور کر رہی تھی۔ کوئیل بہت کبیر تک اور محبت کرنی والا تھا لیکن یہ خوش فہمی بہت جلد ختم ہو گئی جب کوئیل نے اُسے ملازمت کرنے کا کہا۔ پہلے پہل وہ مذاق سمجھ کر رناتی رہی مگر کوئیل کی سنجیدگی اس بات کی گواہ تھی کہ وہ اپنے کہے پر قائم ہے۔

”کوئیل آپ سیریس ہیں؟ کیا کیا آپ واقعی چاہتے ہیں میں کام کروں؟“ اُس نے تصدیق چاہی۔ اُسے لگا ابھی وہ ہنسے گا اور کہے گا ہنگی میں مذاق کر رہا تھا۔

”میں آئی ایم آئی ایم سیریس۔ کیوں؟ تمہیں کیا مذاق لگ رہا ہے؟“ وہ ریوٹ سے جھپٹل کھاتے ہوئے بولا۔

”مگر میں تو آپ کی ذمہ داری ہوں۔ اور مجھے

کیا سمجھتی ہوں ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔ وہ تمہارے لئے بیٹ بیچ نہیں تھا۔ آئی میں اسلئے نہیں کہ تم اُسے کم صورت لگی بلکہ اسلئے کہ وہ تمہارے قابل نہیں تھا تبھی اللہ نے تمہیں اُسکے حق میں نہیں رکھا۔“ جنین نے اُسے ساتھ لگاتے سمجھایا۔

☆☆☆☆☆

”طارق کیا سوچا آپ نے؟ وہ لوگ فون پہ فون کر کے پوچھ رہے ہیں کیا جواب دوں اُنکو۔“ زدنیرہ بیگم بھران کے سر ہو گئی۔

”دیکھو بیگم تمہاری بات سے انکار نہیں لیکن کچھ وقت تو دوسوچنے کیلئے کم از کم جنین سے تو پوچھ لو کہ وہ کیا چاہتی ہے پھر ہی حتی جواب دے سکیں گے۔“

”اُس نے کیا کہا ہے طارق۔ جو کرنا ہے ہم نے کرنا ہے۔ والدین ہیں نہ تو نہیں سوچیں گے۔ رہی بات وقت کی اور کتنا وقت؟ آج چوتھا دن ہے بات کے چال ہے آپ نے غور و فکر کیا ہو۔“ اُنکی بات پر وہ سر ہلا کر رہ گئے۔

جنین کے بچہ ختم ہوتے ہی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ تینوں سہیلیاں مل کر اُسکے گھر آ جاتیں اور خوب مستی کرتیں۔ زدنیرہ اور طارق مسکرا کر رہ جاتے۔

انہی ہنگاموں، روشنیوں میں جنین پیادیں سدھار گئی۔ پندرہ دن بعد اُنکی لٹل مائیٹ تھی اُسے اپنے شوہر کیساتھ باہر چلے جانا تھا۔ یہ پندرہ دن ایک چھپتے گزر گئے۔ سب ایئر پورٹ پر موجود تھے بالخصوص رابعہ جو ناگزیر وجوہات کی بناء پر شادی میں شرکت نہ کر پائی تھی نہ وقت نکال کر اُسکو ملنے جا سکی۔ جنین نے بہت شکوہ کیا لیکن مجبوری سمجھ کر خاموش رہی۔ آج وہ مشکل سے وقت نکال کر جنین کو ملنے ایئر پورٹ گئی۔ پھر جانے کب ملنا ہوتا۔ کوئیل کو دیکھ کر رابعہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُسکے اندر توڑ پھوڑ شروع ہو گئی۔ وہ

آیا۔ خود سے مل کر پانی نہ پینے والی اب لوگوں کو کھانا سرو کرے گی۔ اُس نے سوچا۔ آنکھوں میں آنی نمی کی چھپالیا۔

”اے تم!! یہاں آؤ۔“ منیجر نے بلایا۔ تحسانہ لہجہ اندر تک توڑا اسکے قدموں میں تھکاوٹ ڈرائی۔

”یہاں کام کرنے کیلئے آنی ہو سوچنے کیلئے نہیں۔

سوچوں کو گھر پر رکھ کر آنا کل سے۔“ سمجھی۔ ایک ایک

لفظ انگریزی میں چپاتے ہوئے یوں بولا جیسے حنین کو

چہا رہا ہو۔ تحسانہ، طہریہ و استہزائیہ لہجہ!! حنین کا دل

چاہا وہاں سے بھاگ جائے۔ کوئیل کو ٹیکر بدگمانی کے

ناگ نے سر اٹھایا۔ لیکن سوچ کر جھک دیا کہ اچھی

زندگی کیلئے سب کرنا پڑا ہے۔ وہ کونسا دل سے چاہتا

ہے کہ میں جاب کروں۔ میں نے بھی کونسا ہمیشہ جاب

کرتی ہے جب مستحکم ہونگے تو چھوڑ دوگی وغیرہ

وغیرہ۔۔ خود کو تلی دے کر مطمئن ہوگئی۔

لازمت کا آٹھواں دن تھا اور یہ آٹھ دن اُس

نے انکاروں پر کاٹے تھے۔ پہلے دن خود کو سمجھا کر مٹی

تھی کہ جیسے ہی مستحکم ہونگے فوراً لازمت چھوڑ دے گی

مگر آٹھ دنوں میں اندازہ ہوا کہ یہ ویٹریس کی کم نت

نے لوگوں کو خوش کرنے کی نوکری زیادہ تھی۔ ویٹریسز

اور بھی تھیں لیکن وہ وہاں کے ماحول، رہن سہن کی

عادی تھیں۔ جو مجبوری کر رہی تھیں انہوں نے اسے

قبول کر لیا تھا۔ لیکن حنین اب تک اس نوکری کو تسلیم نہ

کر پار رہی تھی۔ اسے یہ نوکری اپنے لئے تذلیل، تمسخر،

طرز کے سوا کچھ نہ لگتی۔ اُس نے کوئیل کو دو ٹوک الفاظ

میں منع کر دیا کہ وہ کسی آغوش، کسی پار یا اچھے ادارے

میں اپنی تعلیم اور معیار کے مطابق میں نوکری کر لے گی

لیکن ایسی دیکھی جاب ہرگز نہیں۔

”اوہ!! کم آن جی۔۔ اتنی سی بات پر تم۔“

صوفی نے آٹھ کروہ اسکے قدموں میں بیٹھ گیا۔

لازمت کا کوئی تجربہ بھی نہیں۔ کیسے بیچ کر دوگی۔“

”ہو جائے گا بیچ بھی۔ بلکہ کرو گی تو ہوگا۔ ویسے

بھی خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آؤ۔

یہ پاکستان نہیں جہاں مکا نے والا ایک اور کھانے والے

دس افراد۔ یہاں رہنے کیلئے، اچھا لائف اسٹائل

بنانے کیلئے ہر فرد کو کام کرنا پڑتا ہے۔ آج ہم ایک ہیں

کل کو ہمارے بچے ہونگے ہم انکو محسوس پٹی زندگی دیں

کے کیا؟“ کوئیل نے اچھی زندگی کا ایسا خاکہ کھینچا کہ

وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ کمزور لمحوں کی زد میں آکر اچھی زندگی

گزارنے کا خواب لئے حنین اسکی باتوں سے متفق ہو

گئی۔ ہوتا پڑا۔ اسکے سوا کوئی چارہ تھا نہ کوئیل نے کوئی

مباحث چھوڑی تھی۔

”کوئی اور جاب نہیں مل سکتی؟ میرا مطلب

ویٹریس۔“

”بی اے کیا ہے کوئی اعلیٰ تعلیم نہیں حاصل کی جو

اچھی جاب ملے۔ شکر کرو دوست کے ریفرنس سے یہ

جاب مل گئی۔“ وہ ایل ای ڈی بند کر کے ایک ہاتھ کا

تکیہ بنا کر صوفی پر لیٹتے ہوئے بولا۔ دوسرا ہاتھ

آنکھوں پر رکھ لیا۔ واضح اشارہ تھا کہ مزید بحث کی

مباحث نہیں۔

اگلی صبح ہرج کی طرح اجلی، روشن و شاندار تھی۔

حنین انگریزی لیتے ہوئے اٹھی لیکن جیسے ہی ہونٹ جانے

کا خیال آیا اسکا دل عجیب سا ہو گیا۔ منہ میں کڑواہٹ

کھل گئی۔ آج پہلی بار سورج کی روشنی اُس کو گراں

لگی۔ اُس نے سوچا کاش یہ صبح نہ ہوئی ہوتی۔ دوسرے

عی مل خود کو فنی سوچنے پر ڈانٹا۔ ہالوں کو سمیٹا اور اللہ کا

نام ٹیکر آٹھ کڑی ہوئی۔

”چلیں۔“ تیار ہو کر باہر آئی تو کوئیل کی آنکھوں

میں سٹائش دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔ وہ بھی اسکی تیاری

دیکھ کر سراپے بنا نہ رہ سکا۔

اُسے میکیج کے حوالے کر کے کوئیل وہاں سے چل

دیا۔ پہلی بار اُسے اپنے والدین، اپنا گھر اور ملک یاد

برائی سے بچنے کیلئے خاموشی سے اسکی بات مان لی۔
کبھی رات کے بارہ بج جاتے اور کبھی ایک۔
ڈھائی سال ہونے کو آئے لیکن کوئیل نے ایک
بار بھی پاکستان جانے کی بات نہ کی۔ ایک دن اچھے موڈ
میں دیکھ کر بات کی تو وہ یوں بدکا جیسے کوئی انہونی بات
کر دی ہو۔

”فی الحال ممکن نہیں۔ آؤٹ آف بجٹ۔ ویسے
بھی یہ جو تم وائس ایپ، آئی ایم او وغیرہ پر لکھی لکھی
کرتی ہو مفت تو نہیں ہوتیں۔ انٹرنیٹ چارجر لگتے
ہیں۔“ اسکا جواب حسین کو اندر تک بد مزہ کر گیا۔ مزید
کچھ کہے کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ سوچ رہی تھی اس
نے کیا کھویا کیا پایا۔ اولاد کی خواہش ظاہر کرتی تو بجٹ
آڑے آ جاتا، پاکستان جانے کی بات کرتی تو بجٹ،
کہیں گھونٹنے کیلئے کہتی آؤٹنگ کا کہتی تو بجٹ، شاپنگ
کا کہتی تو بجٹ۔ ڈھائی سال میں مشکل سے دو تین بار
اسکو شاپنگ اور آؤٹنگ کیلئے لیکر گیا ہوگا۔ کئی بار کہتی کہ
اب تو وہ بھی ملازمت کر رہی ہے اٹنا اسی کو سنا تا کہ
وہاں موجود برہم خور ت کو کڑی کرتی ہے وہ کوئی انوکھی نہیں
جو نکار رہی ہے۔ اُسے سمجھاتی تو برس پڑتا کہ احسان جتا
رہی ہو مت کر دو جیسے تیسے کر کے پورا کر لوں گا۔ وہ
خاموش ہو جاتی۔ اُسے لفظ بجٹ سے چڑسی ہو گئی تھی۔
اس لفظ نے ہر خوشی کو حرام کر دیا تھا۔ اُسکے خوابوں،
خواہشوں، اُٹھکوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اُسے لگا اسکا
کام صرف لوگوں کو دکھانا سرود کرنا رہ گیا تھا۔ گھر وہ صرف
رات بسر کرنے آتی تھی۔ آنسو تکیے کے اندر جذب ہو
رہے تھے۔ وہ سوچتی اگر اُسکے تکیے کو کھولا جائے اور
دیکھنا ممکن ہو تو جانے کتنے آنسو نظر آئیں جو ٹوٹے
مان، بکھری اُمیدوں، دم توڑی حسرتوں کو سموئے
ہوئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

اُسے فوٹوشٹ کیلئے آفر کی گئی تھی جسے اُس نے
سہولت سے منع کر دیا۔ کوئیل کو پتہ چلا تو وہ بھر گیا۔

میں اسٹیلش ہو جائینگے۔ ویسے بھی یار تمہیں ہاتھ لگاتے
ہیں نہ کھا تو نہیں جائینگے۔ وہ ہاتھ اُسکے گھٹنوں پر
رکھتے ہوئے بولا تو حسین اسکی سوچ پر ماتم کے سوا کچھ
نہ کر سکی۔

”ہوں۔ یعنی غیر مردوں کا مجھے ہاتھ لگانا، آنکھوں
کے اشاروں سے ذوق منی باتیں کرنا اتنی سی بات ہے۔
حیرت ہے آپکی سوچ پر۔ افسوس صد افسوس۔“ وہ اسکا
ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی۔
”حق۔ بے بی دیکھو تم بہت جلد اس ماحول کی
عادی ہو جاؤ گی پھر۔“

”مجھے کل سے جاب پر نہیں جانا مطلب نہیں
جانا۔“ دیش اٹ۔ اُس کی بات کاٹ کر دو ٹوک
لفظوں میں کہا تو کوئیل گھور کر رہ گیا۔
”ٹھیک ہے۔ میں تمہاری فکس کا بندوبست کرتا

ہوں۔ پہلی فلائیٹ سے پاکستان روانہ ہو جاؤ۔ خود کا
خرچہ پورا نہیں ہوتا تمہارا کیسے پورا کروں گا۔ حالات
بہتر ہونے تو بلوا لوں گا ورنہ کسی آس اُمید میں مت
رہنا۔“ حسین کے اندر جھمن سے کچھ ٹوٹا۔ اُسے لگا
دھمکی دے گی تو وہ مان جائے گا۔ اُس نے کیا ماننا تھا
اُس نے تو ایک بیوی کا مان ہی توڑ دیا۔ کوئیل نے
ایک دم پینٹر ابدلہ اور شیریں لہجے سے اُسے اچھے مستقبل
کے سہانے خواب دکھانے لگا۔ وہ یہ شکوہ بھی نہ کر سکی
کہ یہ خواب پورا کرنے کی ذمہ داری اسکی تھی نہ کہ
حسین کی۔ اور وہ بیوقوف لڑکی ایسے سہانے خواب تو
کب سے دیکھ رہی تھی لیکن اب پتہ چلا بعض خوابوں
کی تعمیر بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اُسے بھی اپنے خوابوں کی
تعبیر کیلئے ہماری قیمت چکانی پڑ رہی تھی اپنی عزت نفس
کو کچلنا پڑ رہا تھا۔

پھر سے دیر روشن شروع ہو گئی۔ صبح گیارہ بجے
سے رات نو بجے تک ڈیوٹی دینے کے علاوہ کبھی اور
نام بھی لگانا پڑتا۔ حسین اُس کے حق میں نہ تھی مگر کوئیل
نے کہا دو چار پیسے فالو آ جائیں تو کیا برائی ہے۔ اس

ایسی منجھدار جہاں وہ تھا تھی۔ تن تھا، شوہر کے ہوتے ہوئے بھی جی داماں! اُس نے اپنے والدین کو آج تک کسی بات کا علم ہونے دیا تھا نہ نوکری کی بابت بتایا تھا۔ اُسے لگا لاعلمی ٹھیک نہیں۔ انہیں اب بتا دینا چاہیے مگر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ زندگی تو گزاری ہی ہے کیا فائدہ انکو پریشان کرنے کا۔ دوستوں سے رابطہ کئے عرصہ ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر بھجوتہ کر لیا۔

وہ پہلے سے زیادہ چپ رہنے لگی۔ کام سے کام رکھتی۔ کوئیل کوئی بات کرتا تو مسکراہٹ اُسکے لبوں پر نمودار ہو کر غائب ہو جاتی۔ فقط اک کھوکھلی مسکراہٹ! ”کیا سب لڑکیاں شادی کے بعد میری طرح مجبور ہو جاتی ہیں؟ اپنے والدین کے بھرم کو قائم رکھنے کیلئے خوش رہنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے ہلکان ہوتی ہیں؟“ خود ہی سر ہلا کر نفی کر دی۔ ”ذاکر بھائی تو ہر پندرہ دن بعد بھابھی کو اُنکے والدین سے ملوانے لیکر جاتے ہیں۔ ہر طرح کی آسائش و سہولت فراہم کی ہے۔ گھر کے کام کیلئے الگ ماسی آتی ہے اور کھانا بنانے کیلئے الگ۔ مجھے تو کھانا بھی بنانا پڑتا ہے اور کھانا بھی خود پڑتا ہے۔ کوئیل نے میری پروا کی نہ سبھی کوئی چاہت کی۔ بجٹ۔ ہنڈ۔ اُسے تو صرف پیسے چاہئیں۔ کیا اپنے خوابوں، خواہشوں، حسرتوں کو مار کر خوش رہا جاسکتا ہے؟ ہاں شاید۔ میں بھی جی رہی ہوں۔“ سوچوں کا سلسلہ تھا کہ رُکنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ اُسکا اندر دُور دور تک ویران و بے پایاں تھا۔

”جی جی۔۔۔ جلدی بھاگو۔ پولیس نے ریٹ کیا ہے۔“ غصہ نے پھولی ہوئی سانسوں سے بتایا تو حنین کو لگا کسی نے اُسکے پیروں سے زمین کھینچ لی ہو۔ غصہ کا تعلق اٹھیا سے تھا۔ جوانی میں بیوگی کے بعد تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہوئی میں نوکری کرنا اُسکی مجبوری تھی۔ حنین کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کے دروازے سے لیکر بھاگی۔ قسمت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ یا

پھر سے سرتوڑ کوشش کی کہ کسی طرح وہ مان جائے۔ وہ جانتا تھا ہر اگون کھینچی کی ماڈلز دنوں میں شہرت کی بلندیوں تک پہنچتی ہیں۔ ایسی کئی ماڈلز کو وہ جانتا تھا جنہیں دو وقت کا کھانا بمشکل نصیب ہوتا لیکن ایک۔ شوٹ نے اُن کے وارے ہارے کر دیئے۔ حنین کو رام کرنے کیلئے سرتوڑ کوشش کی یہاں تک کہہ دیا کہ وہ بھلے ہوئی کی نوکری چھوڑ دے لیکن یہ فوٹو شوٹ لازمی کرے لیکن نتیجہ مفر۔ آج وہ اپنی زندگی پر اُٹو گئی۔ عزت نفس و اُن کا دواؤ پر لگا چکی تھی لیکن اپنی عزت و غیرت کا سودا کرنے کے حق میں نہ تھی۔ کوئیل نے دیکھا یہ تو وہ حنین نہیں تھی جو اُسکی باتوں میں آ جاتی تھی، اُسے منانے کیلئے سب کچھ کر جاتی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی لڑکی تھی نہ اعتدالیت والی۔ بات چپ عزت و غیرت کی ہو تو عورت ڈٹ جاتی ہے۔ بڑے سے بڑے طوفان سے ٹکرانے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

”ٹھیک ہے۔ کل سے آنے جانے کیلئے اپنا بندوبست کر لیتا۔ پٹرول کا اضافی خرچ برداشت نہیں ہوتا۔“ کوئیل نے دھمکی دہی جسا حنین پر قلمی اثر نہ ہوا۔ ڈھائی سال میں وہ نہ صرف تمام راستوں سے بخوبی واقف ہو چکی تھی بلکہ کوئیل کو بھی سمجھ چکی تھی۔ اُسکی فطرت، اُسکی نیت، اُسکی طبیعت سب۔ کچھ بھی پوشیدہ نہ رہا تھا۔ اُس دن تو اُسے سر پر ہم چھوڑا تھا جب پتہ چلا کہ یہ گھر بھی اُسکا اپنا نہ تھا۔ اس انکشاف نے حنین کو چھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

”آپ کے پیدائش نے تو کہا تھا کہ گھر اپنا ہے۔“ اُسکی آواز ساتھ نہ دے رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی اور کتنے انکشافات کا ہونا باقی ہے۔

”ہاں میرا ہی ہے مگر جب تک کرایہ دو لگا جب تک۔“ وہ کندھے اُچکاتے ہوئے یوں بولا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

اُسے احساس ہوا کہ وہ سچ منجھدار کھڑی ہے۔

امتحان ہاتی تھے۔

☆☆☆☆☆

بات پوری کر کے وہ سر میز کے کونے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ نوجوان پولیس آفیسر خاموش کھڑا تھا۔ اُسے سمجھ نہ آیا کیسے تسلی دے۔ پانی کا گلاس تھمایا جسے وہ ایک کھونٹ میں خالی کر گئی جیسے برسوں سے پیاسی ہو۔ موہاگل مانگا اور کومیل کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ نمبر مسلسل اور آف جا رہا تھا۔ وہ جھنجھلا گئی۔ نوجوان نے موہاگل لیکر پاکٹ میں ڈالا، گاڑی کی چابی اٹھائی اور اُسے ساتھ چلنے کیلئے کہا۔ حنین نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو بتایا کہ اُس کے گھر چھوڑ دے گا۔ پورے راستے دل میں دُعا کرتی رہی کہ کومیل اسکی مجبوری سمجھ جائے۔ ان تین سال میں سخت سے سخت ڈیوٹی کے باوجود وہ رات کو لازمی گھر جاتی تھی۔ دوسرے، واہے، پریشانی اُسکو کزور کر رہی تھی۔ جیسے ہی گاڑی رُکی وہ چونکی۔ نوجوان آفیسر نے اُتر کر بتل دی۔ دروازہ کومیل نے کھولا تو گاڑی کا دروازہ کھول کر ایسے بھاگی کہ کہیں وہ بند نہ کر دے۔ اُسکو پکارتی آگے بڑھی لیکن چہرے پر سختی کے تاثرات دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

”اعذر جا کر ضروری سامان لو اور دفع ہو جاؤ میری زندگی سے۔“ الفاظ تھے کہ تھوڑے جو اسکی سماعت پر برسائے گئے۔ وہ شرمسار ہو گئی۔

”کومیل میری پوری بات تو سن لیں۔“

”اپنے ماں باپ کو سنانا جا کر۔“ اُس نے حنین کا ہاتھ بے دردی سے بھڑک دیا۔ جب وہ بس سے مس نہ ہوئی تو کمرے میں جا کر ایک بیک میں اُسکے کپڑے اور ڈاکومنٹس ڈال کر باہر لا بیچکا۔ وہ پیچھے پیچھے بھگتی اللہ رسول کی قسمیں کھاتے ہوئے صفائیاں دے رہی تھی۔ کومیل کے کانوں پر جوں تک نہ رینگ رہی تھی یوں لگتا تھا وہ سماعت سے محروم ہو گیا ہے۔ اُسے سن نہیں پارہا۔ حنین کو کم از کم ایسا

لگا۔ اتنے میں ایک جرمن لڑکی باہر نکلی۔ حنین کو دیکھ کر اُس کی بھومیں تن گئیں۔ اور وہ انگریزی میں کومیل پر برسنے لگ گئی۔ کومیل اُسے شانت کر کے اندر بھیج رہا تھا۔ لڑکی نے حنین کو مخاطب کرتے ہوئے واضح طور پر جتلیا کہ وہ گمراہ اُسکا اور کومیل کا ہے۔ کومیل اُس سے شادی کرے گا۔ حنین عجیب کیفیت میں تھی۔ وہ بھیجی ہوئی آنکھوں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھ رہی تھی۔ کیا میاں بیوی کا تعلق ایسا کمزور ہوتا ہے کہ پہل میں ٹوٹ جائے؟

”بیک میں تمام ضروری کاغذات رکھ دیئے ہیں۔ طلاق نامہ بھی موجود ہے۔“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی کومیل نے سب کچھ ملایا میٹ کر ڈالا۔ دروازے کی چوکت پکڑے وہ زمین پر گر گئی چلی گئی۔

”میری بات مان کر فوٹو شوٹ کر لیتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ایک دوسرے کیساتھ ہوتے۔ بچپن میں کھیل رہے ہوتے۔ اچھی پر آسائش زندگی گزار رہے ہوتے مگر تمہیں تو عزت کی پروا تھی۔ اب جاؤ۔ جاؤ اپنی نام نہاد عزت لیکر اپنے ماں باپ کے پاس۔“ انھیں یقین دلانا اپنی سچائی، پاکیزگی کا۔ میں نے انھیں بتا دیا ہے کہ آج تم اُنکے پاس پہنچ جاؤ گی۔“ ذلت کی انتہا۔ سخت لہجہ، کزورے و طغیانیہ الفاظ، بیگانگی و اجنبیت کی دیواریں ایک ہی رات میں سب ملایا میٹ ہو گیا تھا۔ وہ شاک کی کیفیت میں تھی۔ ہوش تب آیا جب مارتھا نے ہاتھ پکڑ کر باہر نکالا اور دھاڑتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔ وہ ہکا بکا دروازے کو کھتی رہ گئی۔ اُسے لگا قسمت کا در بند ہوا ہے۔ کومیل نے رشتہ یوں توڑا جیسے نا سمجھ بچہ بارش سے پھول کو بے وقت سمجھ کر توڑتا ہے۔

”کومیل کی نظر میں روپے پیسے کی اہمیت رشتے سے زیادہ تھی جو مجھے پردیس میں در بدر چھوڑ دیا؟ میری تین سالہ محبت و محنت کو رازیاں کر دیا۔ عزت کو

گئی تھی۔

”مجھ پہ بھروسہ کر سکتی ہو۔ چلو تمہیں ایئر پورٹ چھوڑ دوں۔“ اُس نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہا۔ اُسکی آنکھوں میں احترام تھا۔ حسین کو لگا اعتبار کرنا ہو گا کیونکہ رات سے اب تک اُس نے اعتبار قائم رکھا تھا۔ جیسے ہی گاڑی ایئر پورٹ پر رُکی وہ چوکی۔ وہ پھر سے اُلجھ گئی کہ جائے یا نہ جائے؟ کوئیل نے جانے اُسکے ماں باپ کو کیا کہا ہو گا؟ اُس نے دوبار اُسے پکارا۔ حسین نے ڈرتے ہوئے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”ٹھیک کہا۔ خدشات بجا ہیں لیکن بہر حال وہ تمہارے پیرشس ہیں یقین تم پر کریں گے نہ کہ اُس پر کیونکہ تم اولاد ہو، پالا پوسا ہے تمہیں، برسوں سے جانتے ہیں۔ باقی تم بہتر سمجھتی ہو کہ کیا کرنا چاہیے۔ میں ہر صورت تمہارے ساتھ ہوں۔“ اُردو انگریزی میں بات کرتے ہوئے وہ حسین کو چونکا گیا۔ اُسکے لہجے میں بہت کچھ تھا عزت و احترام، اعتبار۔ اب وہ شش و پنج میں تھی لیکن یقین تو بہر حال کرنا تھا اور کوئی راستہ تھا بھی نہیں تھا۔ حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔ چہرے پہ پریشانی رقم تھی۔ پریشانی کی وجہ وہ سمجھ چکا تھا۔

”میں رہو گی کہاں؟ ہم میرا تو یہاں کوئی نہیں۔ جو تھا اُس نے چھوڑ دیا۔“ وہ رونے کو بھی۔ آنکھیں چمکنے کو بے یقینی تھیں۔ دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا تھا۔

”میرے گھر۔ میری ماما کے ساتھ۔ اچھا ہے اُنکو بھی کچھ دن کیلئے پائرنل جائے گا۔“ اُس نے عام سے لہجے میں کہا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ سر گاڑی کی پشت سے لگا دیا۔ خود کو وقت کے آسرے پر چھوڑ دیا۔ گاڑی اُٹھانے راستوں پر رواں تھی۔ وہ آنکھیں موندے لپٹی رہی دماغ حاضر تھا اور حالات کے تانے بانے بننے ہوئے وہ کب گھر پہنچے اُسے علم نہ ہوا۔ گاڑی کے ہارن کی آواز پر آنکھیں کھولیں۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ وہ ایک پرانی امریکی طرز کا خوبصورت بنگلہ تھا۔ دائیں

غیر یقینی کی بجائی میں جمبوئیک کرکس قدر اطمینان سے دستبردار ہو گیا۔ ہل بھر میں بے مول کر دیا میرا وجود۔“ وہ شکستہ قدموں سے چلتی برسوں کی مرےض لگ رہی تھی۔ سوچوں کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ وہ اندر ہی اندر خود سے جنگ کر رہی تھی، بڑا رہی تھی، اُلجھ رہی تھی۔

”مما پاپا کو کیا کہو گی؟ کیسے اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت کا بتاؤں؟ واپس تو جانا ہو گا۔ نہیں نہیں۔ میں اگر واپس گئی تو چھوٹی بہن سے کون شادی کرے گا؟ لوگ طرح طرح کے سوال کر کے ممما پاپا کا چینا دو بھر کر دیں گے۔ بھائی سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہ رہیں گے۔ غلطی بھلے مرد کی ہو یہ معاشرہ تصور دار عورت کو بھی سمجھتا ہے۔ طلاق کے نام پر مرد عورت کو ایک بار سزا دے کر خود کی قید سے آزاد کر دیتا ہے مگر معاشرہ اور معاشرے کے لوگ ہل ہل کی سزا دیتے ہیں، لفظوں کے نشتر سے چھلکی کرتے رہتے ہیں۔ میں واپس نہیں جاؤ گی کم از کم جب تک اپنی بے گناہی ثابت نہ کر دوں۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے باتیں کر رہی تھی۔ زمانے کی اونچ نیچ کا اندازہ آج ہوا تھا۔

”مگر بے گناہی ثابت کیسے کرؤ گی؟ کوئی آسمان سے تھوڑی اترے گا میری بے گناہی ثابت کرنے؟ ویسے بھی ماں باپ بہن بھائی تو مجھ پر یقین کر لیں گے پھر کس کیلئے ثبوت چاہیے؟ معاشرے کیلئے؟ زمانے کیلئے؟ زمانے کو لاکھ ثبوت مہیا کر دو یہ نہیں چھوڑے گا۔ نہیں یقین کرے گا۔ کبھی نہیں۔“ وہ تڑپ اُٹھی۔ آگے کتواں تھا پیچھے کھائی۔ اُسکا کرنا لازم تھا۔ سوچوں کی یلغار نے ادھ موا کر دیا تھا۔ کیا کرے کیا نہ کرے سوچ سوچ کر دماغ تھک سا گیا تھا۔ تھوڑی دُور گئی تھی کہ اُسی پولیس آفیسر نے گاڑی روک کر بیٹھنے کا کہا۔ حسین نے گھبراتے ہوئے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا اور بولت سے منع کر دیا۔ آنکھوں میں شرمندگی، ملال، دُکھ کی پرچمائیاں واضح تھیں۔ پولیس آفیسر کو اُس پر ترس آیا۔ گلابوں جیسی لڑکی ایک رات میں کھلا

انہیں میں ملازمہ چائے اور دیگر لوازمات لے آئی۔
 حنین سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ سامنے پیش، سینڈویچ، چکن
 رول دیکھ کر بھی مبھوک سوئی رہی۔ اُسے کسی چیز کی
 طالب نہ تھی۔ کومیل کی بے وفائی نے اُسے اندر تک توڑ
 دیا تھا۔ وہ پیسے پیسے کرتا تھا لیکن پیسوں کی خاطر اُسکو
 چھوڑ دے گا یہ اُس نے خواب میں بھی نہ سوجھا تھا۔ وہ
 تو اُسکے خوابوں کو بارہیکمیل تک پہنچانے کیلئے اپنی
 عزت نفس، اُنا سب ختم کر چکی تھی۔ رات دن ایک
 کمرے کے پیسہ کار رہی تھی۔ بدلے میں کیا ملا؟ ذلت، بے
 وفائی، طلاق۔ اپنی روداد سناتے ہوئے کتنی بار روئی،
 کتنی بار آنسو صاف کئے، کتنی بار الفاظ ترتیب دیئے یہ
 وہی جانتی تھی۔ بات پوری کر کے وہ پھر سے رونے
 لگ گئی۔ آنسوؤں میں شدت آگئی۔

”ایک ایسے شخص کیلئے اپنے آنسو ضائع کر رہی ہو
 جس نے تمہاری قدر نہ کی۔ اُسے تم سے ذرا سی بھی
 محبت ہوتی تو تم آج یہاں نہ ہوتی۔ محبت کی پہلی شرط
 عزت اور دوسری شرط اعتبار ہوتی ہے۔ دونوں میں
 سے ایک بھی شرط پوری نہ ہو تو محبت خالی برتن کی طرح
 الگتی ہے۔“ حنین نے حیرت سے دیکھا۔ چہرے پہ
 اُلجھن بتا رہی تھی کہ بات اُسکے سر سے گزر گئی ہے۔
 اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہیں تو جوان پولیس آفیسر نے
 آ کر حنین پر حیرت کا ایک اور پہاڑ توڑا کہ وہ کومیل
 صادق یہاں پریش کمار کے نام سے جانا جاتا ہے۔
 اُس نے سیکورٹی کیلئے اپنی شناخت تبدیل کی
 ہے۔ بلیک مارکیٹنگ اور اس جیسے کئی کاموں میں ملوث
 ہے جسے حرف عام میں غیر قانونی کہہ سکتے ہیں۔
 لوگوں کی زبانی معلوم ہوا وہ سر عام کہتا تھا اُسکی بیوی
 شہر کی کیا پورے ملک کی حسین ترین لڑکی ہوگی۔ جانے
 کیوں حنین کو خود سے گھن آنے لگی کہ کیوں اُسکی بات
 مان کر اول درجے کی معمولی نوکری کی لیکن یہ سوچ کر
 اللہ کا شکر ادا کیا کہ پورا گون کیساتھ شوٹ کیلئے رضامند
 نہ ہوئی۔ اب کی انکھوں سے شکر کے آنسو گرے جو

جانب لان بنا تھا۔ مختلف خوبصورت پھول اپنی خوشبو
 نکسیر رہے تھے۔ ساتھ والی سیٹ خالی ہو چکی تھی۔ حنین
 ہل بھر کو ڈنگائی کہ کہیں یہاں آ کر غلطی تو نہیں کی۔
 تھوڑی دیر بعد وہ ایک بوڑھی عورت کے ہمراہ آتا
 دکھائی دیا۔ لاٹک اسکرٹ پہنے، اسکراف لپیٹے حنین کو وہ
 بہت گریں فل لگیں۔ انکھوں کا رنگ سبز یا گرے
 تھا۔ دُور ہونے کی وجہ سے وہ کنفز نہ کر سکی مگر اُنکی
 شخصیت نے حنین کو مرعوب کیا تھا۔ گاڑی کا دروازہ
 کھول کر باہر آئی۔ جیسے ہی آفیسر نے حنین کا تعارف
 کروایا بوڑھی عورت کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُسے
 پہنچ کر گلے سے لگایا۔ ساتھ ساتھ پاکستان کے
 بارے میں، وہاں کے لوگوں کے بارے میں پوچھ رہی
 تھیں۔ اُردو لہجہ بہت صاف حنین کو حیران کر رہا تھا۔
 اُسکی حیرانگی بھانپتے ہوئے بتایا کہ وہ بھی پاکستانی ہے۔
 دونوں کو چھوڑ کر وہ واپس چلا گیا۔

جیسے ہی گیٹ بند ہوا وہ خاتون حنین کو لنگر ڈرائنگ
 روم میں آگئی۔ پرانی طرز کا بنا تھا لیکن کافی کشادہ اور
 جدید طرز سے ڈیکورٹ کیا گیا تھا۔ چاروں طرف
 سفید رنگ کے صوفے گول دائرے کی شکل میں لگائے
 گئے تھے۔ نیوی بلیو ویلوٹ کے کُشن کمرے کی دلکشی
 بڑھا رہے تھے۔ وہ ایک طرف بیٹھ گئی۔ عورت نے کسی
 کو آواز دے کر اگر بڑی میں کھانے کیلئے کچھ لانے کو
 کہا۔ حنین سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئی اور اُسکے
 بارے میں دریافت کیا۔ پوچھنے کی دیر تھی وہ بچکیوں
 سے رونے لگ گئی۔ کوئی ٹھنڈا چاہیے تھا جس کے
 سامنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکی۔ وہ پریشان ہو گئی۔
 انہیں سمجھ نہ آئی کیسے اُس نازک لڑکی کو تسلی دیں۔
 انہیں لگا روئے دینا چاہیے تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو۔ وہ
 اُٹھنے کو تھیں جب حنین نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

”پلیز آئی میرے پاس بیٹھی رہیں۔“ اُس نے
 روتے ہوئے کہا۔ بے خودی میں سر اُٹکی گود میں رکھ کر
 لیٹ گئی۔ وہ اُسکے بالوں میں اُٹھلیاں بھرتی رہیں۔

سرعت سے دوپٹے میں جذب ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

حسین کی کہانی وہ سن چکی تھیں اور اب اپنی سناری تھیں۔

”میں ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی۔ انگلش میں ماسٹرز کرنے کے بعد حریہ تعلیم کیلئے یہاں آ گئی۔ مہاراشی نہیں تھی لیکن میری اور پاپا کی خواہش کے آگے جھک گئیں۔ یہاں میری ملاقات جیکسن سے ہوئی۔ وہ ایک عیسائی لوجوان تھا مجھ سے دو سال سینئر۔ بات پہلو ہائے تک تھی اور یہ بھی ان کی طرف سے تھی۔ مجھے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ پھر ایک کلاس فیلو کی زبانی معلوم ہوا کہ اُن کا اسلام کی طرف کافی رجحان ہے۔ یہی نہیں وہ اسلام کے بارے میں کافی معلومات بھی رکھتے ہیں تو میرے دل میں جیکسن کیلئے عزت بڑھ گئی۔ پہلو کی بجائے میں سلام کرنے لگی اور ہماری بات چیت کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ زیادہ تر اسلامی ٹاپکس زیر بحث رہتے۔ اُس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کی کہ مجھے دوستی پر شرمندگی ہوئی۔ میری صبح اُسکے ساتھ شروع ہوتی تو شام اُس سے مل کر ختم۔ اُس کے بعد زندگی بے رونق لگتی۔ مجھے اپنے ہی جذبول سے خوف آنے لگا۔ یہ انکشاف کہ میں اُسکو چاہتی ہوں مجھے اندر تک ہراساں کر گیا۔ میں زمین کی ہاسی ایک چاند کی تمنا کر رہی تھی۔ ایک شام جیکسن نے کہا کہ وہ مسلمان ہونا چاہتا ہے مگر فی الوقت اپنی پہچان چھپانا ہوگی۔ قاری اُسامہ پرورد نے جیکسن کو نگہ پڑھوایا۔ وہ اب محمدؐ و جدان بن جیکس تھے لیکن یہ بات میں، میری دوست عظمیٰ اور جیکسن کا ایک عیسائی دوست رابرٹ جانتا تھا۔ و جدان نے اپنے جذبے مجھ پر آشکار کئے تو میں ساکت رہ گئی۔ دل عجیب طرز پر دھڑک رہا تھا۔ ایک خوبصورت احساس مجھ میں سرایت کر گیا کہ وہ بھی مجھے چاہتے ہیں۔ میں بیکطرفہ محبت بھی تھی لیکن یہاں تو دونوں محبت کی آگ میں جل رہے تھے۔ میری خوشی

پل بھر کی تھی۔ جب سوچا کہ کیا مہاراشی ہو جائیں گے؟ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو؟ اِس سے آگے میری سوچ سلب ہو جاتی، دل بیٹھ جاتا۔ میں ایسا کچھ نہ سوچتا چاہتی تھی لیکن حقیقت سے فرار بھی ممکن نہ تھا۔ وہ سانس لینے کو ڈکیں۔ چائے کا آخری گھونٹ لیا۔ کپ واپس ٹیبل پر رکھ کر لہسا سانس لیا۔

”میں چھیوں میں پاکستان آئی۔ با۔ ٹیڈ مناسب وقت کا انتظار کرتے کرتے وقت گزر رہے تھے قریب آ گیا۔ و جدان جو میری طرف سے اِس وقت کا انتظار کر رہا تھا وقت گزرنے کے بعد مجھ سے ملنے کرنے سے متوجہ لگا گیا اور میرے گھر رشتہ بن گیا ہوا جب کا ڈر تھا۔ پاپا نے انکار کر دیا۔ نہ وہ چاہتا بلکہ مجھے واپس بھیجے پر بھی رضامند نہ ہو۔ یہاں تک پہ پابندی لگا دی۔ میں سمجھ سکتی تھی و جدان۔ ہاں بے چین ہو گا۔ میں مامی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ کب نہ کسی طرح نظر بچا کر گھر سے بھاگ گئی۔ جانتی تھی یہ بہت بڑا اور غلط قدم ہے پر اندھی محبت نے کچھ سوچنے کے قابل نہ چھوڑا۔ میری سوچ و جدان سے شروع ہو کر اُسی پر ختم ہو جاتی۔ اُس سے دُوری گوارا نہ تھی سو اُٹھا لیا یہ قدم۔ عید کی پیدائش پر و جدان نے زور دیا کہ مجھے گھر والوں سے رابطہ کرنا چاہیے۔ میں نے عید کی تصاویر ای میل کیں اور گھر فون کیا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔ لہجہ بھرا گیا۔ جنین چپ رہی۔ وہ جانتی تھی بعض دفعہ لفظوں کو بچکا کر کے ادا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

”انہوں نے مجھے معاف کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ مرے ہوؤں سے کوئی ناراض نہیں رہ سکتا۔“ بچکوں کا تانتا بندھ گیا۔ حسنین نے ہاتھ تمام کر لیں دینے کی کام کوشش کی۔

”میں ہر سال عید تہوار پر بھائی کو ای میل کر کے ہم سب کی تصاویر بھیجتی۔ اُن کو وٹس کرتی۔ جواب آتا تھا نہ آتا تھا۔ اُس دن کے بعد سے و جدان بلا وجہ کے

غصہ آنے لگا کہ ایک اجنبی پر یقین کیوں کیا۔ اُس پر انحصار کرنے کی بجائے خود کچھ کر لیتی۔ مگر دالوں کا سامنا کیسے کرے گی، کیسے اُنکے سوالات کے جواب دے گی، کیسے سب کو خود پر گزری قیامت کا یقین دلائے گی، کیسے خود کو بے گناہ ثابت کرے گی۔ اُسے اب خود پر غصہ آنے لگا جو عبید کیساتھ یہاں آئی تھی۔

انٹر پورٹ پہنچ کر دو دل ایک ساتھ زور زور سے دھڑک رہے تھے۔ ایک کو انہوں سے ملنے کی خوشی تھی تو دوسری انہوں کو اپنی پاکدامنی و سچائی کا یقین دلانے کی ٹینشن میں مبتلا تھی۔ جہاز کی پشت سے ٹپک لگائے وہ خود سے الجھ رہی تھی۔ اُن الفاظوں کو تریب دے رہی تھی جس سے اپنی بے گناہی کا یقین دلا سکے۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ میرا کردار صاف ہے۔ میرا کام ہے بتانا۔ یقین کرنا کہ اُن پر ہے۔ میرا رب سب اچھا کرے۔ اب کی بار چہرے پر اطمینان قفس کر رہا تھا کیونکہ آج زندگی میں پہلی بار اللہ کو سچے دل سے پکارا تھا اور جانتی تھی وہ اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

☆☆☆☆☆

پاک سرزمین پر قدم رکھتے ہی ٹرس کی آنکھیں جھلک اٹھیں۔ انٹر پورٹ پہ ٹرس کا چھوٹا بھائی اور بھابی موجود تھے۔ برسوں کا سفر منٹوں میں طے کیا۔ بھاگ کر یوں بھائی سے لپٹ گئی جیسے قافلہ سفر طے کر کے اپنی منزل پر پہنچا ہو۔ ٹھوری دیر چین کو مل کر اُسے ایک جیسی پریشانی اور دعاؤں کیساتھ زحمت کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ انہی دعاؤں کے ہمارے میں سرخرو ہوگی۔ نہ ہو پائی تو آپکا بیٹا میرے ساتھ ہو نوالے سلوک کا ذمہ دار ہوگا جس نے کوئٹل کا اصل روپ دکھانے کیلئے وعدے کئے تھے۔ عبید گاڑی کیساتھ ٹپک لگائے کھڑا اسی کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وجدان سے مل کر چین نے غصیلی نگاہوں سے عبید کو دیکھا اور جیسی میں بیٹھ گئی۔

جیسے ہی جیسی سر قفسی ہاؤس کے باہر نکی اُس کا دم کھٹنے لگا۔ جانے کوئٹل نے کیا کیا بتایا ہوگا۔ اُس نے

غم میں کھٹنے لگ گئے کہ اُنکی وجہ سے یہ سب ہوا۔ پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگے۔ اُنکی محبت چاہت اپنی جگہ پر والدین بہن بھائیوں کی محبت بھی چاہیے ہوتی ہے۔ میرے اٹھائے ایک قدم نے مجھے انہوں سے دور کر دیا۔ عبید کے بعد ایک بیٹی ہوئی لیکن مردہ۔ دو سال بعد ایک بیٹا ہوا لیکن کچھ دن زندہ رہ کر وہ فوت ہو گیا۔ وجدان میرا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگے تھے۔ ہماری امیدوں کا محور اب عبید تھا۔ عبید وجدان۔ پھر ایک روز وہ سب ہوا جو وہم و گمان میں نہ تھا۔ بھائی کی طرف سے ای میل موصول ہوئی کہ بہت سزا کاٹ لی۔ ماما پاپا سب بہت یاد کرتے ہیں۔ اپنے ملک لوٹ آؤ۔ وہ سب ہمارے شدت سے منتظر ہیں۔ بس پھر کیا تھا سب جیسے چنگیوں میں ہو گیا۔ وجدان اپنا بڑا بس واسنڈ آپ کر رہے ہیں۔ کچھ ہفتوں بعد میں انہوں میں ہوئی۔ پورے چھپیس برس بعد۔ ٹرس وجدان کی آنکھوں میں ایک الٹوئی چمک تھی۔ لہجے کی ٹھنک بتا رہی تھی وہ کس قدر خوش ہیں جیسے پیاسے کو صحرا میں کنواں مل جائے۔

اُسے وہاں گیارہواں دن تھا۔ ٹرس کیساتھ ساتھ وجدان سے بھی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ چین کو وہ بہت اچھے لگے۔ جب وہ خاتون اُسے میری بیٹی کہیں تو وہ نہال ہو جاتی۔ مگر اتنے دن گزرنے کے بعد بھی کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ عبید سے بات نہ ہونے کے برابر تھی۔ اُسے لگا وہ بیکار میں لڑکی ہے۔ کچھ ہفتوں یا دنوں تک یہ لوگ چلے جائیں گے تب میں کہاں جاؤ گی؟ کیا کرو گی؟ یہ سوال ذہن میں آتے ہی اُنکا دل دھڑکنے لگ گیا۔ اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج عبید سے بات کرے گی کہ اگر نہیں کچھ کر سکتا تو بتا دے مگر جموئی نسل دے کر ڈھارس نہ بندھائے۔ اسی کشمکش میں حرید تین دن گزر گئے اور اُسی رات وجدان نے پاکستان جانے کا عندیہ دے دیا۔ چین کے دلکش چہرہ پہ مایوسی، ناامیدی کے سائے لہرانے لگے۔ اُسے عبید پر

فصل و صورت کی مالک تھی مگر حنین، کلثوم اور انوشے کو وہ بے حد عزیز تھی۔ اُس کا دل رابعہ کیلئے مطمئن ہو گیا کہ قدر دان فیملی میں بیایا جا رہی ہے۔ کلثوم کی فیملی بلاشبہ مکمل اسلامی اصولوں پر چلتی تھی۔ ذات پات اور بچ بچاؤ کی نظر میں متنی نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆☆☆

پہلے رابعہ کی شادی ہوئی۔ چار ماہ بعد انوشے اپنے گھر کی ہو گئی۔ کلثوم کی نسبت طے تھی لیکن شادی میں سال تھما حنین کو آئے آٹھ ماہ ہو گئے تھے۔ اُسکے والدین چاہتے تھے کہ کسی طرح اُس کو اپنے گھر کی کر دیں۔ وہ مسلسل نہ کر رہی تھی۔ ”آجکل اچھی اچھی بیٹی رہ جاتی ہیں ماما خلاق یافتہ کیسا تھما کون کرے گا؟ کوئی کنوارا تو کم از کم ہرگز نہیں۔“ یہ بات سنتے ہی زونیرہ بیگم کا دل ڈونگ لگ جاتا۔

”آپ لوگ آرین کی شادی کر دیں۔ وہ ماشاء اللہ سے بانئیں کی ہو جائے گی۔ میں نہیں چاہتی کہ اُس کے دل میں کوئی بات آئے کہ میری شادی چھوٹی عمر میں کی اور اب بھی میری پروا کر رہے ہیں جبکہ اصولاً اُسکے بارے میں سوچنا چاہیے۔ وہ اذلان کو پسند کرتی ہے وہ بھی اُسے پسند کرتا ہے۔ اچھی فیملی ہے آپ لوگ اللہ کا نام لیکر ہاں کر دیں۔“ زونیرہ بیگم اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

جسٹ منگنی پت بیابا والا کام ہوا۔ آرین شادی کے بعد اذلان کے ساتھ سنگاپور چلی گئی۔ کلثوم کی بھی شادی ہو گئی۔ زونیرہ بیگم کے دطائف میں شدت آ گئی، سجدے طویل ہو گئے۔ مزید سال گزر گیا۔ حنین اٹھائیس سال کی ہو چکی تھی۔ اُس نے ماں باپ کو اجازت دے دی تھی کہ جہاں بھی مناسب لگے اُسکی شادی کر دیں وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُسکے والدین مزید پریشان ہوں۔ کیا پتہ اب کی بار خوشیاں راس آ جائیں یہ سوچ کر اُس نے خود کو اللہ کے آسرے پہ چھوڑ دیا۔ زیادہ تر ادھیڑ عمر آتے یا بچوں کے باپ جنہیں

کا بچے ہاتھوں سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور چادر سیٹ کرنے لگی۔ کھڑے کھڑے تھک گئی تو بتل پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ دریا تو پار کرتا ہی ہے پھر خوفزدہ ہونے سے فائدہ۔ ایک بتل دی جواب ندارد دو پار تیری بار ہاتھ رکھنے کو بھی کہ اندر سے ”کون ہے؟“ کی آواز آئی۔ حنین کی توجہ آواز پر تھی پر دروازہ کھولنے والے نے جیسے ہی دروازہ کھولا حنین ایک دم پوکھلا کر پیچھے ہٹی۔ ”پھوپھی“ کہتا ہوا وہ اندر بھاگ کھڑا ہوا اور حنین نے جب دیکھا کہ یہ حادثہ ہے جس نے تین سال میں اچھا خاصا قد نکال لیا تھا تو دل میں ماشاء اللہ کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں سب اُسکے ارد گرد موجود تھے۔ ماما پاپا، آرین، کوئل بھابی، ذاکر بھائی، حارث، فارید۔ سب آنکھوں میں آنسو لائے اُسکے گلے مل رہے تھے۔ زونیرہ بیگم البتہ کوئیل کو بار بار بددعا میں دیتیں۔ حنین کو سب ایک خواب لگا۔ وہ صفائی دینے کیلئے خود کو پلکان کر رہی تھی پر یہاں کا منظر ہی عجیب تھا۔ اُس نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے اُسکی لاج رکھی، اُسکی دعا سن لی۔

ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا۔ وہ کسی سے ملی نہ کسی کو اطلاع دی۔ برشے سے دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ کلثوم انوشے کیساتھ اپنے بھائی کی شادی کا کارڈ لائی تھی تب ہی پتہ چلا حنین آئی ہے اور آئے بھی ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا ہے تو دونوں ناراض ہو گئیں۔ حنین نے اپنی مجبوری بتائی اور ساری بات دونوں کے سامنے رکھ کر ہلکی پر سکون ہو گئی۔ ایک بار پھر اللہ کا شکر ادا کیا اور اب کی بار دل ہی دل میں عید کا بھی جس نے سارے ثبوت ای سیل کئے اور کال کر کے ساری بات بتائی۔ جو کچھ حنین کیساتھ ہوا وہ سب کچھ بتا چکا تھا۔ کلثوم اور انوشے کے دل سے بھی عید کیلئے دعا لگی جس نے دیار غیر میں حنین کی مدد کی۔ رابعہ کا پوچھنے پر انوشے نے خوش کن انکشاف کیا کہ کلثوم کے بھائی ثاقب کی شادی رابعہ سے ہی ہو رہی ہے۔ اُسے یقین نہ آیا۔ کلثوم کا لبا چوڑا، گورا چٹا بھائی ثاقب حنین کو یاد تھا جبکہ رابعہ واجبی

جیسے ہی لڑکیوں اور عورتوں کا جم غفیر کم ہوا اُس نے کچھ کا سانس لیا۔ پورا کمرہ گلاب کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ گونگھٹ تھوڑا اوپر کھسکایا اور کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔ کمرہ حد سے زیادہ کشادہ اور بہت خوبصورت تھا۔ دہائی سائیز ٹیبل پر چائے نماز اور بیچ بڑی تھی۔ خوبصورت سے موسم بقی اسٹینڈ پر موسم بقی روشن تھی۔ بتایا جسے پر سرخ رنگ کے پھولوں کی چٹاں بکیر کر رکھی تھی۔ بائیں والی سائیز ٹیبل پر موسم بقی اور پھولوں کی چٹاں تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل پر پھولوں کی چٹاں بچھائی تھیں، اوپری جسے پر گلاب کے پھولوں سے خوبصورت سجاواٹ کی گئی تھی۔ مسہری کو جانے کیلئے بھی گلاب کے پھولوں کو بے دریغ مگر بے حد خوبصورت انداز میں استعمال کیا گیا تھا۔ جنین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی بالکل اُسی طرح جیسے ہر طرف گلاب کی چٹاں بکھری پڑی تھیں۔ دہائی طرف واش روم تھا۔ اُسی دیوار کے ساتھ ایک طرف کپیوڑ ٹیبل تھا جسکے عین اوپر ایک بہت بڑی ونش کی تصویر آویزاں تھی جس نے آدمی سے زیادہ دیوار کو یوں ڈھانپا تھا کہ گمان ہو بندہ وہیں کہیں کھڑا ہے۔ دائیں بائیں بلڈنگ اور درمیان میں بچنے پانی میں کشمیاں حقیقت کا گمان ہونے لگتا۔ وہ مسخ ہو گئی۔ تھوڑے فاصلے پر اسٹڈی ٹیبل تھا جس پر مختلف کتابیں اور رسالے ترتیب کیساتھ رکھے گئے تھے۔ وہ کمرے کی سجاواٹ کو سراہے بناء نہ رہ سکی۔ گردن گھما کر دیکھا تو تھوڑے فاصلے پر پھولوں کا خوبصورت گلدستہ رکھا ہوا تھا جس کے ساتھ کارڈ چسپاں تھا۔

محبوبوں کو شراکت داریاں کہاں بھاتی ہیں
اگو تو وحدانیت کا چسکا بڑا ہوتا ہے!!
آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ صحن کی جگہ حیرت نے لے لی۔ گلدستہ واپس رکھا اسی اِٹا میں دروازے پر دستک ہوئی اور کوئی جواب کا انتظار کئے بغیر اندر آ گیا۔ جنین جانتی تھی وہ اُسکا شریک حیات ہے۔ اُسکا

طارق مرتضیٰ سہولت سے منع کر دیتے۔ اُنکی بیٹی بوجھ نہیں تھی جو اس طرح رول دیتے۔ اسی دوران ایک رشتہ آیا جس کیلئے سب نہ صرف خوش تھے بلکہ مطمئن بھی تھے کہ اُنکی بیٹی خوش نہیں بہت خوش رہے گی۔ پورے گھر میں خوشیوں کا راج تھا۔ آئین دو ماہ کے جڑواں بچوں کیساتھ آچکی تھی۔ دو دو بچوں کو سنبھالنا مشکل کام تھا اس لئے ساری توجہ اُنہی پر رہتی۔ کوئل بھابھی کیساتھ کلثوم اور رابعہ ہر باری میں پیش پیش تھیں۔ انوشے چونکہ اُمید سے بھی اُسلے وہ بیٹھ کر باتیں بناتی اور رات کو چلی جاتی۔ زونیرہ بیگم اور طارق مرتضیٰ روز خوشیوں کے دائی رہنے کی دُعا کرتے۔ زونیرہ بیگم شکرانے کے فعل ادا کرتے نہ تھکتیں۔ جنین نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی کہ فارسیہ نے سرخ پھولوں کا گلدستہ دیا۔ جنین نے اُنہی نظروں سے دیکھا۔ بھیجے والے کا نام عمار! گلدستے کے ساتھ ایک چھوٹا سا کارڈ چسپاں تھا جس پر خوبصورت ہینڈ رائٹنگ سے جذبیوں سے گندھے الفاظوں نے اُسے مزید پریشان کر دیا۔

”جنین معلوم ہے جان، میں اکثر رات میں تنہا ادھر اچھ کر تم کو، مکمل پاس پاتا ہوں!“
جنین کے چہرے پر پریشانی دیکھ کر فارسیہ چونک گئی۔ ”کیا ہوا پھوپھو؟“

”کچھ نہیں پھوپھو کی جان۔ آپ جانیجے۔“
گلدستہ ایک طرف رکھ دیا۔ گھر میں رونق پیلے اور کاموں میں اُلجھ کر کارڈ اور پھول بھول گئی۔ اگلے دن اُنکی مہندی والے روز ایک اور کارڈ اُسکا ہتھکڑ تھا۔

پیلے اور سفید پھولوں کا خوبصورت گلدستہ اُسے اندر تک خوفزدہ کر گیا۔ یہ خوشیوں بھری زندگی کی ابتداء ہے یا؟؟ اس سے آگے وہ کچھ سوچنا نہ جانتی تھی۔ ایک بار بھر اللہ سے مدد مانگی۔ اسی شش و پنج میں جلا وہ باہل کا آگن چھوڑ آئی۔

☆☆☆☆☆

طالب علم

اجمان کے دوران طالب علم سر پکڑ کر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔
مگر ان: کمر سے کچھ کر کے بھی آنے ہو یا بس ایسے ہی اٹھ کر آ گئے ہو؟
طالب علم: نہیں سر! ناشہ کر کے آیا ہوں۔

دل عجیب طرز پر دھڑک اٹھا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور گھونگھٹ گرا لیا۔

میری زندگی کا ہر لمحہ تیری دید کا منظر پالوں جو تجھے تو مکمل یہ زندگی کا سفر ہو اس ٹوٹی پھوٹی اُردو اور امریکن لہجے کو وہ لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ اپنے حسن کی آواز وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ حیرانگی کے عالم میں گھونگھٹ اُٹا تو سامنے عید کو پایا۔

”ممانے کہا تھا کہ پاکستانی لڑکیاں بہت شرمیلی ہوتی ہیں“ عید نے شرارتی انداز میں کہا تو حنین نے جینپ کے گھونگھٹ گرا لیا۔

”وہ..... معافی ملے گی؟“

حنین نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
”وہ گلدستے اور کارڈز میں نے بھیجے تھے اور یہ والا بھی میری طرف سے ہے۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا تو حنین نے سکون کا سانس لیا۔ ویسے بھی اتنا تھک چکی تھی کہ کارڈز اور گلدستے دونوں سے نکل گیا تھا۔

”اُس اوکے۔ کٹاں تارے میں آپکا نام۔ مطلب آپ کا نام تو عید و جدان ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

”محمد عید علی نام ہے۔ پاپا نے رکھا تھا۔ ماما عید و جدان کہتی ہیں۔“ اُسکی کنفیوژن دور کی۔ ”جانتی ہوں مجھے پہلی نظر میں بہت اچھی لگی تھی جب پچہ چلا شادی

شدہ ہو تو مجھے برا لگا۔ شاید اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ میں پہلی نظر کی محبت میں یقین نہیں رکھتا پر تمہیں دیکھ کر جو احساس جاگا وہ انوکھا، خوبصورت اور ناقابل بیان ہے۔“ عید نے انگریزی میں کہا تو حنین کے ہونٹوں میں مسکراہٹ کھر گئی۔ وہ ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کر رہا تھا کہ اسکی ساعت پہ ٹھٹھس ہو سکے۔

”سفر کے دوران ایک ہی دعا کر رہا تھا کہ تم یونہی میرے ساتھ رہو اور یہ سفر بھی ختم نہ ہو۔ کبھی نہیں۔ ممانے کا شادی کیلئے زور بڑھتا گیا اور میری نا اُمیدی طول پکڑتی چلی گئی۔ کبھی کبھی مایوس ہونے لگتا۔ ممانے پتار بنے لگی ہیں۔ جس دن وہ زیادہ پتار ہوئیں مجھے نانو اور ماموں نے بتایا کہ وہ میری وجہ سے پریشان ہیں۔ اُس روز سے پشیمانی نے آن گھیرا کہ میں اُنکو ایک چھوٹی سی خوشی نہیں دے سکتا۔ میں نے تمہارے بارے میں بتایا مگر کہہ دیا کہ جہاں وہ کرنا چاہیں آزاد ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ماما تمہارے گھر پہنچ گئیں رشتہ لیکر۔“ وہ سانس لینے کوڑکا۔

”میرے جذبات بے چارے تھے، پاکیزہ تھے جی مجھے تمہارا ساتھ نصیب ہوا۔ میں بڑے بڑے وعدے کرنے کا قائل نہیں۔ تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھنا، خواہشوں کا احترام کرنا، تمہیں خوش رکھنا میری اولین ترجیح ہے۔ ایسی ذمہ داری ہے جسے میں بخوبی سمجھاؤں گا۔“ تمہیں مجھ سے میرے گھر والوں سے بھی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“ عید نے اُنکا ہاتھ تمام کر اعتراف کرتے ہوئے خوبصورت سی انگوٹھی پہنائی جو اُسکے انگلیوں کی طرح جھلجھلا رہی تھی۔ اک اطمینان و سکون حنین کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ وہ اندر تک سرشار ہو گئی۔ دل سے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے اُسے ایسے شریک حیات سے نوازا جس نے یقین، اعتبار، وفا اور چاہت سے حنین کے دل کو جیتا تھا۔ حنین نے مسکرا کر عید کا ہاتھ تمام لیا۔ ایک روشن صبح اُنکی منظر تھی۔



URDU TUBE

تشدد اور اس کی انتقام

فرحت قادر

بدلتا ہوا تشدد اور ظلم و جبر ہمارے معاشرے میں بیکار کی اہم ترین وجہ ہے اس کے تدارک اور روک تھام میں ہم سب کو کردار ادا کرنا ہوگا

حصہ بن گیا ہے۔ شوہر ہونے کا مطلب یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ مرد کو عورت کی حقیر کرنے اور اسے ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچانے کا کھلا لائسنس مل گیا ہے۔ اسلام نے عورتوں کے ساتھ محبت اور نرمی کے سلوک کا حکم دیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

تشدد جسے آسان لفظوں میں مار پیٹ، فحش کلامی یا بدسلوکی کہا جاتا ہے یہ بلا تفریق نہ ہب رنگ و نسل قومیت، جاہل عالم اور اپنا پراپیٹنی کہ ہم کہہ سکتے ہیں پوری دنیا میں ہوتا ہے۔ خاص طور پر عورتوں پر تشدد یا انہیں گالی گلوچ سے نوازنا ہماری معاشرتی زندگی کا

سوالیہ انداز سے اسے دیکھنے لگی۔

خیر تو ہے ناں علی بخش؟ تم چپ ہو کیا کہا ہے
ڈاکٹر نے؟

علی بخش نے پانی کا گلاس پیو کو تھمایا اور بولا۔
ڈاکٹر نے امید بھی دکھائی ہے اور مایوسی بھی دی
ہے۔

آپریشن ہو سکتا ہے تاکام ہو یا کامیاب یہ کوئی
کچھ نہیں کہہ سکتا بس یہی پریشانی ہے۔
بیون نے غور سے شوہر کے مایوس چہرے کی
طرف دیکھا اور بولی اچھا ٹو پریشان نہ ہو اللہ کو جو
منصور رہی ہوگا اور مایوسی کفر ہے علی بخش۔

میں مایوس نہیں ہوں ڈر لگتا ہے کہیں میری دھی
رانی ہمیشہ اندھروں میں نہ بھٹکتی رہے۔ میں اور تم
کب تک زعفران رہیں گے کون دیکھے گا غمناکی کو۔

کیا مطہل کون دیکھے گا علی بخش؟ اس کا گھر والا
دیکھے گا اور کون دیکھے گا تم بھی کمال کرتے ہو۔ بیوی
نے ناراضگی سے شوہر کو کہا۔

جملی نہ ہو تو جو خود اندھروں میں بھٹکتی ہے وہ
بھلا زندگی کا سفر کسی کے ساتھ کیسے کاٹے گی اور پھر
اس معصوم کو اپنا کون بتائے گا؟

علی بخش نے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کرتے
ہوئے بیوی کو جواب دیا۔

جن جیسا چہرہ ہے میری دھی کا دیکھ لینا ضرور
دلہن بنے گی میری بیٹی تم بس اللہ پر بھروسہ اور ایمان
رکھو پھر دیکھنا اللہ کیسے سب بناتا ہے۔ دونوں میاں
بیوی میں یہ گفتگو چل رہی تھی کہ باہر کے دروازے
سے ایک دس سالہ بچہ اندر داخل ہوا شلواری قمیص میں
ملبوس ہاتھ میں بلا پکڑے اندر آنے والا بچہ رضا تھا
جو کہ علی بخش کا یتیم بھتیجا تھا۔ وہ ماں باپ کی محبت

سے محروم تھا مگر چچا اور چچی کی آنکھ کا تارا تھا۔ ماں
باپ کے بعد دونوں نے اسے بہت پیار سے پالا
تھا۔ وہ سکول بھی جاتا اور چاچا کے ساتھ کیتوں میں
کام بھی کرتا۔ اس کی دوستی مہربانو سے بہت زیادہ
تھی۔ اب تو خیر مہربانو خود کھانا کھا لیتی تھی پہلے رضا
ہی اسے کھانا کھلاتا تھا۔ اسے اپنے ساتھ باہر لے
جاتا تھا جہاں دونوں خوب کھیلے۔ مہربانو کا بس یہی
ایک دوست تھا۔ لڑکیاں تو اس سے دُور دور رہتی
تھیں انہیں مہربانو کے ساتھ کھیلنے کا حق نہیں آتا تھا۔
مہربانو کے لئے بس ماں باپ اور رضا کا ساتھ تھا وہ
اس میں ہی بہت خوش رہتی تھی۔

چاچا کب آیا ٹو شہر سے؟ اور ڈاکٹر نے کیا کہا
ہے مہر کو؟

وہ ایک دم کئی سوال کر رہا تھا، اب چاچا ساری
تفصیل رضا کو بتا رہا تھا اور وہ یوں نہ رہا تھا گویا
چاچا کے برابر کا ہے اور اسے تسلیاں دے رہا تھا۔

اپنی مہر ضرور دیکھے گی چاچا انشا اللہ۔
ہاں پتر اللہ کرے آپریشن تو خیر ابھی نہیں ہے
اس کے بڑا ہونے پر ہوگا پر ہم غریب لوگ ہیں پتر
اتنے پیسوں کا انتظام کیسے کریں گے؟ میں بوڑھا
آدی اتنا دم نہیں رکھتا کہ محنت مشقت کروں۔

یہ تم کیا کہہ رہے ہو چاچا؟ بات مجھے محض ایک
یتیم سمجھ کر پال رہے ہو بیٹا نہیں سمجھتے ہو مجھے ناں؟

ہر چیز بات نہیں ہے ٹو میرا پتر ہی ہے ہم
دونوں بھی مل کر کچھ نہیں کر سکتے اور ٹو نے ایسا سوچا
بھی کیوں؟ ٹو تو مجھے مہر سے بڑھ کر عزیز ہے۔ رضا
اور ابھی تو میری پڑھائی بہت پڑی ہے پھر تو کڑی یہ
بڑا لبا عرصہ ہے پتر زندگی کا کرے نہ کرے کیا
بھروسہ زندگی کا۔ اچھا ٹو فکر نہ کرنا اللہ مالک ہے روٹی

یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟ کیا کماے گا تو بغیر پڑھے لکھے۔ مزدوری ہی کر سکتا ہے ایک ان پڑھ انسان۔ یہ میرا خواب نہیں ہے رضا تمہیں پڑھنا ہے بہت زیادہ۔

رضا چپ چاپ سب سنتا رہا اب کی بار اس نے چاچا کو کوئی جواب نہ دیا تھا پھر وہ اٹھا اور سکول کی تیاری کرنے لگا۔

سکول جانے والے بچے کب کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے تھے مگر رضا کا کہیں اتنا پتہ نہ تھا۔ چاچی بولائی بولائی کمر گھر جا کر اس کے دوستوں سے پتہ کر آئی تھی سب کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ تو آج سکول آیا ہی نہیں۔ رضا کو کہاں کہاں نہ تلاش کیا گیا مگر وہ نہ ملا۔ جانے اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان۔

رضانے رات کو ہی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ یہ گاؤں چھوڑ کر شہر جائے گا اور نوکری کے لئے ہر طرح کا کام کرے گا اور پھر وہ ڈھیر سارے روپے جمع کرے گا تاکہ مہربانو کا آپریشن ہو سکے۔ یہاں سے اس کی زندگی کا نیا اور مشکل دور شروع ہوا اس نے اپنی طاقت سے بڑھ کر کام کرنا شروع کیا۔

اسے گھر سے نکلے سال ہونے کو تھا اس جیسے بہت سے بچے تھے جو کہ بانے کیسی کیسی مجبوریوں کے تحت گھروں سے نکلے ہوئے تھے۔ وہ جب اکٹھے کھانا کھاتے تو اپنے گھروں سے دُور آنے پر جو مشکلات انہیں ملیں ان پر تبصرہ کرتے اور اپنی ماؤں کے ہاتھوں کے کھانوں کو ترستے۔ وہ بازاری روٹیاں اور سالن کھاتے اور ماؤں کو یاد کرتے۔ کبھی جنتے تو کبھی روتے اور ہفتہ میں ایک دن ایسا بھی آتا جب سب کچھ اچھا سا کھانے کا پلان کرتے۔ تب رضا

کھا جا کر۔ آج کی رات سب پر بہت بھاری تھی مایوسی کے سیاہ دائرے چاروں طرف گھوم رہے تھے تو کبھی امید کی روشن کرنیں انہیں مایوسی کے دائروں سے باہر نکال رہی تھیں۔ مہربانو کے ماں باپ تو پریشان تھے ہی مگر نیند رضا کی آنکھوں سے بھی کوسوں دُور تھی۔

صبح ہوئی تو حسب معمول سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے مگر رضا ابھی تک سویا ہوا تھا۔

اور رضا پتر اٹھ پتر ناشتہ کر سکول کو دیر ہو رہی ہے۔ چاچی نے رضا کو آواز دی مگر وہ ویسے ہی پڑا رہا۔ چاچی دوبارہ چلائی رضا تیرے لیے کچھ نہیں پڑ رہا میں کیا بولے جارہی ہوں تجھے سکول کو دیر ہو جائے گی..... اٹھ فافٹ۔

میں نے اب سکول نہیں جانا چاچی پڑھائی چھوڑ دی ہے۔ رضانے بستر پر لیٹے لیٹے ہی جواب دیا تھا۔

کیا کہہ رہا ہے تو پائل تو نہیں ہو گیا ہے؟ ہوش کر ہوش نیند میں جانے کیا بولتا رہتا ہے۔ سنتے تو ہو ناں میری بات اور تم سن رہے ہو مہر کے ابا یہ کیا بول رہا ہے۔

اٹھ رضا اٹھ پتر سکول کی تیاری کر چاچا جانے پیار سے رضا کو مخاطب کیا۔

میں جاگا ہوا ہوں چاچا میں اب نوکری کروں گا بہت سارا پیسہ اکٹھا کروں گا پھر ہم لکھربانو کا علاج کروائیں گے اور پھر وہ ایک دن ہم سب کو دیکھے گی۔

چاچا نے چونک کر رضا کی طرف دیکھا۔

کبھی ہنس رہی تھی۔ وہ اسے سینے سے لگائے اس کا منہ سرچوم رہی تھی۔

اب اسے لے کر اندر بھی جاؤ گی کہ کبھی میں ہی تماشا کئے رہو گی۔ چاچا کی آواز پر دونوں چونکے۔ اب رضا چاچا کے گلے لگ کے رو رہا تھا۔

چل پڑا اب اندر چل، تینوں گھر میں داخل ہوئے۔ محسن پر پڑی چار پائی پر ایک نہایت حسین جھیل وجود تھا جو کہ مہر بانو کا تھا۔ رضائے جانے کیوں اپنی نظریں چرائیں۔ مہر بانو ہنس رہی تھی ماں نے اسے بتا دیا تھا کہ رضا آگیا ہے۔ اپنی مہر بانو، وہ سوچ کے مسکرایا۔ گلے شکوے فتح ہوئے تو اس نے اپنے پاس موجود رقم چاچا کو اتھادی۔ چاچا رو رہا تھا..... پاگل نہ ہو تو کوئی یوں بھی کرتا ہے۔

بالو اپنی آنکھوں سے یہ دنیا دیکھ لے اس سے بڑھ کر ہمیں اور کیا چاہئے چاچا میری تعلیم کو بہت دیر تھی چاچا اور مجھے امید ہے کہ بہت جلد میں اور رقم جمع کر لوں گا۔ مہر بانو مسکرا رہی تھی۔

سب نئے پنپنوں میں کھو گئے تھے جہاں امید ہی امید تھی روشنی ہی روشنی تھی۔ شہر آنے سے پہلے اس نے بانو سے وعدہ لیا تھا اس کے انتظار کرنے کا۔ اگر میرا نور نہ لوٹا تو؟ بانو نے سوال کیا تھا۔ تو بھی میرا انتظار کرتا؟ وہ مسکرایا۔

اس اندھی کے ساتھ تمہاری زندگی بہت مشکل ہو جائے گی رضا۔

نہیں مشکل نہیں بہت حسین اور خوبصورت ہو جائے گی۔ رضائے جواب دیا۔

وہ شہر لوٹ آیا تھا۔ اس کے جذباتوں میں شدت آگئی تھی۔ مہر بانو کا حسین اور خوبصورت چہرہ اس کی

سب کو منع کرتا۔ نہیں یار میں تمہاری اس فضول خرچی میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے بچت کرنی ہے۔ تب سب زور سے ہتھیر لگاتے اور کہتے اسے بچت کرنی ہے تاکہ اپنی مہر بانو کا علاج کروا سکے۔ وہ شرماتا اپنی مہر بانو..... یہ لفظ اب اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ اس کی نگاہوں میں مہر بانو کا حسین چہرہ آ جاتا اور پھر وہ ہنس پڑتا۔ لو بھلا اتنی سی تو ہے بانو! یہ سب پاگل ہیں پاگل۔ مگر اپنی مہر بانو کا لفظ اس کے دل کو دھڑکا کے رکھ دیتا تھا۔ اس نے گاؤں کا ابھی تک ایک بھی چکر نہ لگایا تھا۔ جانے چاچا چاچی اور مہر بانو سب کیسے ہوں گے۔ سب کے سب مجھ سے بہت ناراض ہوں گے۔ چلو خیر ہے میں سب کو منالوں گا۔

چار سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا اب کہ عید آئی تو سب اپنے اپنے گھر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے وہ بھی وہ نہ سکا اس نے سب کے لئے تحائف خریدے۔ اب وہ چاہ رہا تھا کہ اڑ کے گھر پہنچ جائے۔ اس سے دل کاٹے نہیں جا رہے تھے۔ اس نے اپنی جمع شدہ رقم ساتھ لی اور گاؤں روانہ ہو گیا۔ اب تو گاؤں جانے کے لئے ایک بس بھی آتی تھی۔ لوجی ہمارے گاؤں نے بھی اب ترقی کر لی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ رضا رضا..... آنے والے کو ہر کوئی حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ کہاں گیا تھا؟ کیوں گیا تھا؟ اب کیوں آیا ہے؟ تیرے چاچا اور چاچی تجھے بہت یاد کرتے تھے۔ وہ ان کے سوالوں کے جواب دیتا مگر کی جانب جا رہا تھا۔ چاچی کو جانے کس نے خبر دی تھی۔ وہ باہر دروازے میں ہی کھڑی تھی۔ وہ کبھی رو رہی تھی تو

سیارہ ڈائجسٹ کی حسب روایت ایک اور عظیم پیشکش

شائع
ہو گیا
ہے۔

والدینِ محرم

- ایک تاریخی دستاویز جو انشاء اللہ یقیناً ہر گھر کی کامیابی اور فلاح کا ذریعہ بنے گی۔
- جس میں قرآن اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں:
- والدین کے فضائل، آداب، حقوق، فرائض اور ان کے شایانِ شان مستند مواد اور محکم استنباط پر مبنی واقعات اور دیگر مواد کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

ہر گھر میں پیار و محبت
کی تحریک کا آغاز کیجئے

خود بھی پڑھیے اور دوسروں
کو بھی پڑھائیے

سیارہ ڈائجسٹ - 240 مین مارکیٹ ریوارز گاؤن لاہور
فون: 042-37245412

کا۔ اولاد کا دکھ ماں باپ کے علاوہ اور کون سمجھ سکتا ہے مگر تم نے بیا کسی لالچ کے سب کیا، ایسا کون کرتا ہے۔

ہوں..... رضانے لمبی سانس لی اور مسکرایا۔

خدا کرے تم یہ دن ضرور دیکھو بانو رضانے دل کی گہرائی سے دعا مانگی۔ رضانے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا تاکہ گاؤں سے چاچا چاچی اور بانو آئیں تو رہنے کی کوئی تنگی نہ ہو۔ ڈاکٹر نے آپریشن کا وقت دیدیا تھا۔ سب کی دعاؤں میں شدت آگئی تھی۔ جانے کیا ہوا اک یہی خوف سب کے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ آپریشن ہو گیا کچھ دنوں بعد پٹی کھلی تھی۔ کیا ہوگا؟ سب یہی سوچ کر پریشان تھے۔

آج کا دن سب پر بھاری تھا اور بھر دھڑکتے دلوں کیساتھ سب بانو کے قریب کھڑے تھے سب کو بانو کی خواہش کا پتہ تھا۔

آؤ پتر رضا ادھر آ جاؤ، سانسے۔ چاچا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ڈاکٹر بیٹا اتار رہا تھا سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ بانو کچھ دیر پائلیں جھپکتی رہی۔ اسے لگا وہ سب کو دیکھ سکے گی کیونکہ کچھ دھندلا دھندلا اسے دکھائی دے رہا تھا۔

رضا کہاں ہو تم؟ وہ بولی تھی۔

پھر تصویر واضح ہوتی گئی اسے دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے رضا کو ہی دیکھا تھا اور سر جھکا لیا تھا۔

ماں باپ خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اپنی کامیابی پر ڈاکٹر بھی خوش تھا۔ رضا سے تو خوشی سنبھالے نہ سنبھال رہی تھی۔ اک چھوٹے سے کمرے میں خوشیاں مہک رہی تھیں۔ اب یہ نگلی شرماتی رہے گی۔ رضانے نظریں جھکائے بانو کی طرف دیکھا۔

گاؤں سے لوگ آنا شروع ہو گئے تھے سب شہر

لگا ہوں میں سلیا رہتا۔ وہ اور دل جمعی سے کام کرتا اب اسے صرف اس کی آنکھوں کی روشنی ہی نہیں لوٹانی تھی بلکہ اپنی شادی کے لئے اپنی زندگی کی نئی شروعات کے لئے بہت کام کرتا تھا، بہت محنت کرنی تھی۔ وہ اپنا گزارا روکھا سوکھا کرتا تھا۔ ساری رقم جمع کرنے کی کوشش کرتا۔ دوست یا راسکا مذاق اڑاتے اور اسے کنجوس کا نام دیتے مگر وہ ہنستا اور کچھ نہ کہتا۔

اس نے اپنی ضروریات کو نہایت محدود کر لیا تھا۔ پہلے اس کا مقصد بانو کی پیٹنی کی لوٹنا تھا اب اسے اپنے سپنوں کو حاصل کرنا تھا اسے اتنا کمانا تھا کہ زندگی میں بانو کو اور کوئی دکھ نہ ملے۔ اس نے بہت لکھنیں سبکی ہیں اب وہ اس کی زندگی کے دکھ سیننا چاہتا تھا۔ انہی مقاصد کی وجہ سے اسے مشقت کرنا پڑ رہی تھی اور آخر ایک دن وہ اتنے روپے جمع کر چکا تھا کہ بانو کا آپریشن کسی اچھے ہسپتال میں ہو سکے۔ وہ

گاؤں سے لیا تھا کھروالوں کو خوشخبری سنانے۔ گھر والے اس کے احسان مند تھے اور بہت زیادہ خوش تھے۔ مہربانو بھی چھک رہی تھی۔

بانو جب تم دیکھ سکو گی تو سب سے پہلے کس کو دیکھو گی؟ رضانے بانو سے پوچھا۔

تمہیں جواب فوراً آیا تھا۔

اس لئے ناں کہ تم خود کو میرا احسان مند سمجھتی ہو؟

ناں رضا اس لئے کہ ساری دنیا سے بڑھ کر تمہیں چاہتی ہوں۔ اس نے شرماتے ہوئے جواب دیا تھا۔ مہربانو کے منہ سے نکلے یہ چند الفاظ رضا کو نئی زندگی دے گئے تھے۔

رضامیرے ماں باپ نے میرے لئے جو کیا وہ انہوں نے کرنا ہی تھا۔ ان کا اور میرا ناٹھ تھا ہی خون

شہر میں ہی رکھے گا لہذا وہ دل جمعی سے کام کر رہا تھا۔ اکثر اوقات وہ رات کو بھی کوئی نہ کوئی کام پکڑ لیتا تھا اور اب اس کے پاس اتنے پیسے جمع ہو گئے تھے کہ ہالو کے لئے زیور اور کپڑے بخرا سکے۔ اس نے دوست کی بیوی سے الحجاب کی کہ وہ اس کی مدد کرے کیونکہ اسے عورتوں کی خریداری کی سمجھ نہیں ہے۔ اب وہ بمبائی کے ساتھ بازاروں کے چکر بھی کاٹ رہا تھا۔ اس نے ہالو کے لئے ایک کنکرن بھی خرید اٹھا گو کہ اس کی اوقات نہ تھی مگر شدید خواہش تھی۔ کپڑے بھی اس نے اچھے ہی لئے تھے چڑیاں میک اپ بھی تھا۔ بمبائی نے اس کی خوب مدد کی تھی۔ اب وہ گاؤں جانے کے لئے

ہالو کا پتہ کرنے آ رہے تھے۔ رضا کا خرچہ اور بڑھ گیا تھا۔ اس کا دل کرتا وہ کچھ دن سب کچھ چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے اور ہالو سے خوب باتیں کرے۔ دونوں کی باتیں آنے والے وقت کی باتیں مگر وہ صرف سوچ ہی سکتا تھا عمل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ گھر بیٹھنے کا مطلب ہے دہاڑی سے چھٹی اور چھٹی کا مطلب پیسے نہ ملنا۔ وہ دل کی باتیں دل ہی میں سوچ کر رہ گیا کچھ دن بعد سب لوگ واپس گاؤں چلے گئے تھے۔ چاچا چاچی نے رضا کو کہا تھا کہ اب وہ جلد اپنی اور ہالو کی شادی کی تیاری کرے تاکہ وہ اپنے فرض سے فارغ ہو جائیں۔

وقت گزرتا رہا، رضا کی خواہش تھی کہ وہ ہالو کو

نیند میں خلل فالج کا سبب بن سکتا ہے

بین الاقوامی تحقیقی جریدے میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق نیند میں بے قاعدگی اور خلل سے نہ صرف فالج کا خطرہ بڑھ جاتا ہے بلکہ فالج کے بعد دوبارہ صحت کی جانب بحالی کا عمل بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ دنیا بھر میں بے شمار افراد نیند کی کمی کا شکار ہیں اور یہ تحقیق ان کے لیے تشویش ناک ضرور ہو سکتی ہے۔ جرمن یونیورسٹی کے ماہرین نے نیند میں خلل، فالج کے خطرات اور اس کی بحالی کے درمیان ایک رابطہ دریافت کیا ہے۔ اس مطالعے میں 2 ہزار سے زائد ایسے افراد کو شامل کیا گیا جنہیں یا تو اسکیمک اسٹروک، مہرین مہرینج یا چھوٹا فالج ہوا تھا جس میں فالج کے پہلے دورے پڑتے ہیں۔ مہرینج میں دماغی خون کی نالی پھٹ جاتی ہے جب کہ اسکیمک اسٹروک مریض کو بولنے، چلنے اور ہاتھ ہلانے سے بھی معذور کر سکتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ نیند کے امراض کو دو بڑی اقسام میں بیان کیا جاسکتا ہے، سلیپ ڈس آرڈر یا بیدارگی میں نیند کے دوران سانس رکسنے کے دورے پڑتے ہیں اور دوسری سلیپ ویک ڈس آرڈر ہے جس میں نیند آتی نہیں اور مریض جاگتا رہتا ہے۔ ماہرین نے بتایا کہ جن لوگوں کو نیند میں سانس کا مسئلہ تھا ان کی 72 فیصد تعداد کو اسکیمک اسٹروک واقع ہوا تھا جب کہ 63 فیصد کو مہرینج اور 38 فیصد چھوٹے فالج کے شکار ہوئے۔ ماہرین کے مطابق نیند داغ کیلئے بہت ضروری ہے اور نیند میں سرکٹ کو تندرست اور باقاعدہ رکھتی ہے۔

(سرسل: عمران مشتاق۔ لاہور)

تیار تھا۔

وہ انجانے پنوں میں کھویا بس میں سوار تھا۔ سفر کاٹے نہ کٹ رہا تھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھاگ کر گھر پہنچ جائے۔ مہر و کتنی خوش ہوگی جب وہ یہ سارے گہنے اور کپڑے دیکھے گی۔ وہ اس کے چہرے پر آئے رنگوں میں کھویا ہوا تھا۔ چوٹ کا جب جب اس کا شاپ آ گیا۔

وہ ابھی تک مستقبل کے سنہرے خوابوں میں پھر رہا تھا۔ اڑے سے گھر کا سفر بمشکل کٹ رہا تھا۔ آج تو وہ خود بھی خوب تیار ہو کر آیا تھا۔ گلی میں اس کے آنے کا شور مچ گیا تھا۔ رضا آیا رضا آیا کیا حال ہے؟ کیسے ہو؟ کی مختلف آوازیں اس کے کانوں سے گھرا رہی تھیں۔ وہ مسکراتا سب کو جواب دیتا مہر و کے تصور ذہن میں لائے ہوئے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہی تھا اس نے ایک بار پھر اپنا جائزہ لیا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ محن خالی تھا مہر و اور چاچی کھین دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اندر ہوں گی دونوں وہ یہ سوچتا برآمدے کی جانب بڑھا۔

اندھر کمرے سے چاچی اور مہر و کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اس کمرے کی جانب بڑھا جدھر سے آواز آ رہی تھی۔ اپنا نام سن کر وہ یکدم ڈک گیا۔ تم سوچ نہیں سکتی مہر و تم ہمیں کتنی بڑی اذیت دے رہی ہو کتنے احسان ہیں رضا کے ہم سب پر۔ اور خاص تم پر۔ وہی تو ہے جو تمہیں اندھیروں سے روشنیوں کی طرف لایا ہے۔

تو کیا تم سب۔ مگر مجھے دوبارہ اندھیروں میں رکھنا چاہتے ہو اور اس احسان کے بدلہ اگر تم مجھے اس قید خانہ میں ڈالنا چاہتے ہو تو میں تیار ہوں کر میں

کبھی وہاں رضا کیساتھ خوش نہیں رہوں گی۔

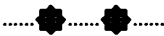
یہ فیصلہ تمہارا بھی تھا مہر و چاچی روتے ہوئے بیٹی سے پوچھ رہی تھی۔

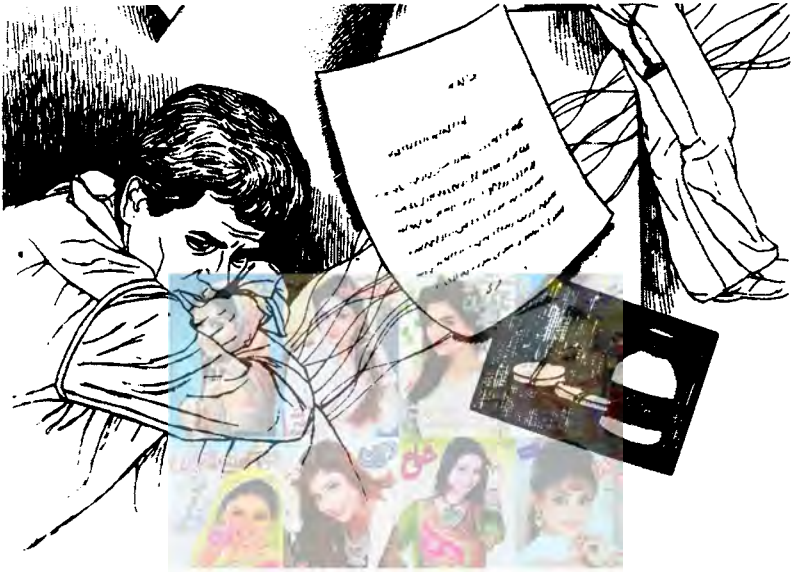
میرا فیصلہ تھا میں اندھی کیا جانتی تھی کہ رضا کیا ہے کبھی ابا یا ٹو نے ذکر ہی نہیں کیا۔ میں تمام عمر زندگی کی خوبصورتیوں کو ترستی رہی۔ اب میں اور بد صورتیاں برداشت نہیں کر سکتی ماں میں نے کہا ہے ناں کہ تم ماسی کو ہاں کر دو۔ کیا کسی ہے مراد علی میں تم خود سوچو بھلا مراد اور رضا کا کوئی مقابلہ ہے۔ رہا احسان تو اماں تم نے بھی تو ماں باپ کے بعد رضا کو کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔ بیٹوں کی طرح پالا ہے تم دونوں نے اسے۔

رضا کے لیے اب مزید کھڑا رہنا مشکل تھا۔

اسے کبھی بھی اپنے سانولے رنگ اور بد صورتی کا اتنا احساس نہ ہوا تھا جتنا آج ہو رہا تھا۔ واقعی مہر و کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کا اور مراد کا زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ گورا چٹا گہرو جواں اور وہ دبلا پتلا عام سا کم شکل و صورت کا انسان۔ وہ اپنے آنسو پی رہا تھا۔ زندگی کی بد صورتی کا احساس بھی آج اسے ہو رہا تھا۔ اندر چاچی اور مہر و کی ٹھکار بڑھتی جا رہی تھی۔ رضا نے برآمدے میں پڑی چارپائی پر سارا سامان رکھا اور گھر سے باہر نکلنے کے لئے قدم بڑھا دیے۔ یہ کہنے اور کپڑے صرف مہر و کے نام کے تھے اب اس کی زندگی میں کسی اور مہر و کو نہیں آتا ہے۔

اس نے اپنے آنسو صاف کئے اور گھر کے دروازے سے باہر نکل گیا..... کبھی نہ آنے کے لئے۔





ایس ایم احمد

آدم خور چیونٹیاں!

چیونٹیاں آنکھ کے حلقوں سے ٹکس کر پیشانی سے برآمد ہو رہی تھیں۔ منہ کا دہانہ کھلا ہوا تھا اگرچہ چہرے کا گوشت ان چیونٹیوں نے کھا لیا تھا۔ تاہم اسے محسوس ہوا کہ شاید اس وقت بھی مسکرا رہا ہے۔ دانتوں کے درمیانی حصے میں بھی وہ خوفناک چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔

ایک شخص کی کہانی جس کے گناہ نے مرتے دم تک اُسکا چہچہا نہ چھوڑا

ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔
لڑکی انتہائی حسین تھی اور نو جوان جذبات میں بالکل اندھا ہو رہا تھا۔ تاریک رات طوفان موسم اور دو جوان جسموں کا قرب ایک عجیب سی سستی میں ڈوبے ہوئے وہ دونوں جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل

آسمان پر رات کا مٹلیں لبادہ پڑ گیا اور ستارے چھپ گئے بادلوں کے دل کے دل اندھیرے میں ادھر ادھر منڈلاتے ہوئے انجانے دیسوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک آسمانی بجلی نے چمک کر ماحول کو ایک لمحے کے لئے روشن کر دیا اور دونوں جسم

”کون ہو تم اور اس طرح اچانک سامنے آ کر خوفزدہ کرنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے نسبتاً سخت لہجے میں کہا۔

سامنے کھڑے طویل القامت نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا وہ مسلسل اسے گھور رہا تھا۔ شاہد نے محسوس کیا کہ وہ شخص دیوانہ ہے یا پھر کوئی سر بھرا لیرا جو شکاری تلاش میں کھات لگائے بیٹھا تھا لیکن چونکہ وہ خالی ہاتھ تھا اس لئے شاہد کو اپنے خیال کے دوسرے حصے سے اختلاف محسوس ہونے لگا۔

اگرچہ وہ اسے سامنے دیکھ کر نرمی طرح سہم کیا تھا لیکن اس نے کسی قسم کے خوف کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ”تم یہ پوچھنے پر حق بجانب ہو دوست۔“ خشک آواز شاہد کی سماعت سے ٹکرائی۔

”کیونکہ آج رات میں تمہاری روح کو شیطان کے حوالے کرنے جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ طویل القامت نوجوان ہنسنے لگا اس کے انداز سے شیطانیت کا اظہار ہوتا تھا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میری کس حرکت سے تم اس فعل پر مجبور ہو؟“ شاہد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”تم نے مجھ سے میری محبوبہ کو چھین لیا ہے۔ اس واقعہ لڑکی کو مجھ سے جدا کر دیا جس سے میں محبت کرتا ہوں۔“

شاہد ابھمن میں پڑ گیا وہ سوچنے لگا کہ یقیناً اس نوجوان کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے اس سے پہلے بھی اس شخص کو نہیں دیکھا تھا چہ جائیکہ اس کی محبوبہ پر قبضہ کرنا بڑی دُور کی بات تھی۔ اس نے اطمینان کا ایک طویل سانس لیا اور مسکرانے لگا۔

”میں تمہیں نہیں جانتا جہاں تک تمہاری محبوبہ کا تعلق

آئے۔ نوجوان نے جھک کر لڑکی کی طرف دیکھا اور سرگوشی کی ”پھر کب ملاقات ہوگی؟“

”کل اسی وقت اسی جگہ یہی سب کچھ ہوگا“ بھول نہ جاتا۔ لڑکی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”شاہد میں تمہیں بے انتہا پسند کرنے لگی ہوں۔ یہ اچانک ملاقات کتنی حسین ہے میں اس لذت کو کبھی نہیں بھول سکتی۔“

”ٹھیک کہتی ہو اب ہم انجینی نہیں رہے۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔“ شاہد نے سرگوشی کی اور پھر لڑکی اس سے جدا ہو کر بائیں سمت چل دی۔ وہ کھڑا اسے دیکھتا رہا حتیٰ کہ اس کے بہم سے جہولے کو اندھیرے نے پوری طرح نگھ لیا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

اس کا گھر وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ جلد ہی وہ سڑک سے ہٹ کر ایک مرتبہ پھر ویران علاقے میں پہنچ گیا۔ یہ جنگل کا کچھ حصہ تھا ہر طرف جھاڑیاں تھیں کہیں کہیں بلند قامت درخت بھی تھے۔ لیکن خورد و جھاڑیوں کی بہتات نے اس حصے کو خاص طور سے ویران کر رکھا تھا۔

جھاڑیوں کے درمیانی راستے پر وہ گھن چلا جا رہا تھا کہ دفعتاً اسے ٹھٹھک کر رُک جانا پڑا۔ اس کے بالکل سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک نوجوان کھڑا تھا جس کے انتہائی سخت گیر چہرے سے وحشت جھک رہی تھی اور آنکھوں کی سرخی کو دیکھ کر جلتے ہوئے انگوروں کا گمان ہوتا تھا۔ بجلی بار بار چمک رہی تھی ہوا کے تیز جھکڑ بادلوں کو دھکیل کر تیزی سے آگے بڑھا رہے تھے۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے رہے شاہد کا دل نرمی طرح دھڑک رہا تھا۔

”سجیدگی سے چاہتی ہے۔“
 ”جب جسم کی تمام منزلیں طے ہو جائیں تو پھر
 کسی سجیدگی کی کمی باقی نہیں رہ جاتی۔“
 شاہد خاموش رہا۔

”میں خود تمہیں ایک دوسرے سے ابھی ہوئی
 حالت میں دیکھ چکا ہوں۔“ اس مرتبہ لہجہ سفاک
 تھا۔ ”میں جانتا ہوں وہ تمہیں چاہتی ہے لیکن کل
 رات اسے تمہاری بجائے میں ملوں گا اور اس کی ایک
 ہی صورت ہے۔“

شاہد کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ صورتحال
 اچانک ہی سجیدگی اختیار کر گئی تھی۔ اس نے فوری
 طور پر تپتی کو کم کرنے کی کوشش کی ”تمہیں غلط فہمی ہوئی
 ہے وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی وہ تو ایک وقتی تقاضا
 تھا۔ جس کے لئے میں بھی مجبور ہو گیا اور یقین جانو
 اس میں غلطی سراسر نیلوفر ہی کی ہے۔ اگر وہ مجھے
 اجابت نہ دیتی تو.....“

اس کا جملہ ادھر ادھر رہ گیا کیونکہ اس نے طویل
 القامت کے ہاتھ میں ہلکا ہوا خنجر دیکھ لیا تھا۔
 آسمان پر بادلوں کا لحاف سرک رہا تھا اور پورے
 چاند کی کرنیں اتنا اُجالا تو کر ہی رہی تھیں کہ وہ
 نوجوان کے ہاتھ میں اس خنجر کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ سمجھ
 گیا کہ اب اس حریف سے بحث بیکار ہے۔

”میرا نام عمر ہے اور میں جذبات کا شہنشاہ
 ہوں۔ میں تمہیں یوں آسانی سے نہیں جانے دوں
 گا۔“

”مشرع تم غلطی پر ہو۔“ شاہد نے ایک مرتبہ
 پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”غلطی نیلوفر کی ہے
 تمہیں یہ خنجر ملے کر اس کے پاس جانا چاہئے تاکہ
 اس قسم کی حرکت کا اعادہ نہ ہو سکے۔“

ہے میرا خیال ہے تم نے غلط آدمی کا راستہ روکا
 ہے۔“

”جھوٹ نہ بولو۔“ وہ شخص فرمایا ”جھوٹ بولنے
 سے تمہاری زندگی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ تم اس سے آج
 رات بھی ملے ہو اور میں اس بات سے بخوبی آگاہ
 ہوں۔“

”وہ کون ہے.....؟“
 ”نیلوفر..... نیلوفر۔“ طویل القامت نوجوان
 نے دہرایا۔

شاہد کا دل ایک مرتبہ پھر دھڑکنے لگا۔ یہ کتنا
 عجیب اتفاق تھا۔ یہاں اس نوجوان کو غلط فہمی نہیں ہوئی
 تھی۔ وہ جس لڑکی سے مل کر آ رہا تھا وہ نیلوفر ہی تھی
 لیکن وہ تو اس لڑکی کے بارے میں بھی زیادہ نہیں
 جانتا تھا۔ وہ راستے میں اچانک ہی اسے مل گئی تھی
 چند ہی لمحوں میں وہ اس حد تک کھل گئی کہ وہ اپنے
 جذبات پر قابو نہ رکھ سکا لذت و سرور کی ان غیر
 متوقعہ گھڑیوں میں اسے ایک لمحے کے لئے بھی اس
 بات کا احساس نہیں ہوا۔ تھا کہ وہ لڑکی کسی مصیبت
 کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے اس نے ہنسنے کی
 کوشش کی اس مرتبہ ہنسنے کے انداز میں خوف کا تاثر
 نمایاں تھا۔

”میں اس لڑکی کے صرف نام ہی سے واقف
 ہوں مسٹر میں اسے نہیں جانتا۔ وہ اچانک کھرا گئی اور
 تم جانتے ہو کہ تمہائی میں کی جوان لڑکی کا قرب کس
 قدر خطرناک ہوتا ہے۔“ شاہد نے مسکرا کر مزاحیہ
 لہجے میں کہا۔

”خطرہ اور خطرے کا صحیح احساس تمہیں اب
 ہو جائے گا۔“ طویل القامت نوجوان فرمایا۔
 ”لیکن مجھے تو اب بھی یقین نہیں کہ وہ مجھے

وقت گزر چکا تھا پھر اس کی کھوپڑی پر پڑا اور وہ بغیر آواز نکالے ختم ہو گیا۔ وزنی پتھر نے اس کی کھوپڑی توڑ دی تھی۔ خون کا فوارہ سا بہہ نکلا اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں عمر کے کرخت چہرے پر مرکز تھیں جیسے وہ مرتے وقت بھی انتقام کی آگ میں جل اٹھا ہو۔

عمر ایک طویل سانس لے کر الگ ہٹ گیا۔ رات کا ایک سرد ہو گئی تھی۔ سرد ہوا کے جمونکے تیروں کی طرح جسم میں پیوست ہو رہے تھے۔ اس نے بائیں ہاتھ کی آستین سے پیشانی پر امنڈے ہوئے سپینے کو صاف کیا اور شاہد کی لاش کا جائزہ لینے لگا۔ چند لمحوں تو اسے احساس ہی نہ ہوا کہ اس سے کیا بات سرزد ہو گئی ہے لیکن جب اسے شاہد کی موت کا یقین ہو گیا اور چاندنی میں اس کی نگاہیں شاہد کی اُلی ہوئی آنکھوں کی طرف اٹھیں تو اس کا پورا جسم کانپ گیا۔

جہاں عمر نے شاہد کا قتل کیا وہ ایک ویران راستہ تھا۔ عمر نے شاہد کی لاش کو کہیں ٹھکانے لگانے کا ارادہ کر کے ادھر ادھر دیکھا اور پھر دائیں طرف دکھائی دینے والی جھاڑیاں اس مقصد کے لئے اچھائی موزوں دکھائی دیں۔ اس نے جبکہ لاش کو اٹھایا اور جھاڑیوں میں گھسٹ چلا گیا۔

لاش اس کے کندھے پر تھی۔ وہ حسمن سے ٹھحال تھا شاید اسی لئے شاہد کا دلا پتا جسم بھی اسے کسی وزنی چٹان سے کم بھاری نہ محسوس ہوا۔ وہ ہانپتا کا پٹا آگے بڑھتا ہوا جنگل کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں اسکی دانست میں آمدورفت شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔ اسے ایک گڑھا دکھائی دیا، گڑھے کے قریب رک کر اس نے گہرائی کا اندازہ لگایا اور

اجانک وہ ایک دوسرے کے بالکل قریب پہنچ گئے جیسے کسی نادیدہ تار سے بندھ کر وہ ایک دوسرے کی طرف کھینچ گئے ہوں۔ خنجر شاہد کے بالکل سر پر پہنچ گیا۔ اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھری گھمائی۔ چھری کا وار کا سیلاب رہا عمر کا رہا اور خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر فضا میں اڑ گیا۔

عمر لاکڑا گیا تھا اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہد نے وزنی چھری کا دوسرا وار اس کے کندھے پر کیا اور پھر بھاگ اٹھا۔ اس جگہ کھڑے ہو کر ایک نیم دیوانے شخص سے لڑنا دانشمندی بخلاف تھا۔ اس لئے فرار ہونے میں ہی عایت نظر آتی۔ لیکن ابھی وہ بیس قدم ہی آگے بڑھا ہوا کہ اسے اپنے کندھے پر سخت ہاتھ کی گرفت محسوس ہوئی۔

وہ ایک جھٹکے سے ڈک گیا، چھری گھمائی لیکن اس مرتبہ وار کا سیلاب نہ ہوا۔ عمر نے پوری قوت سے اسے زمین پر دے مارا تھا۔ وہ چاروں خانے چت

گر پڑا اور پھر اس کی گردن پر ٹھٹھے جیسے سخت ہاتھوں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ وہ ٹھحال ہو گیا، لڑنے کے بجائے مدافعت کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس نے ڈوبتے ہوئے ذہن کے ساتھ عمر کو دھکیلنے کی بھرپور کوشش کی لیکن گردن پر گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔

شاہد نے سر اچھالا، عمر اس پر جھکا ہوا تھا اس لئے لگ کر اس کی ناک پر لگی۔ گردن پر گرفت کمزور ہو گئی اور پھر اس کا گلا آزاد ہو گیا۔ ابھی وہ اٹھنے کی جدوجہد ہی کر رہا تھا کہ اسے سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا عمر کے ہاتھ میں ایک بھاری پتھر تھا۔

”زمین پر بالآخر تمہارا وقت ختم ہو گیا دوست.....!“ عمر فرمایا۔

شاہد کانپ گیا لیکن اب ہر قسم کی جدوجہد کا

ایک جگہ وہ ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے سنبھل گیا۔ فوراً ہی چھڑی کی آواز بھی ختم ہو گئی۔ کوئی نا دیدہ جسم اس کے قریب موجود تھا، کسی غیر مرئی وجود کے احساس سے اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں رک کر کسی مصیبت میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے وہ جیسے جیسے کا پتا لڑتا ہوا راستے تک پہنچ گیا۔ راستے پر پہنچنے کے بعد اس نا دیدہ وجود کا احساس بھی ختم ہو گیا جو اس کی روح تک کو لرز رہا تھا۔ رات گزر گئی تھی مشرق سے سورج کا تھنایا ہوا چہرہ دکھائی دیا اور وہ نڈھال سا جھکے جھکے قدموں سے ان کھیتوں کی طرف ہولیا جن کے اس بار عمر کا گھر تھا۔

وہ مطمئن ہو گیا اب اس کی محبت کی راہ میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ نیلوفر کے جذبات اب صرف اسی کے لئے مخصوص ہو جائیں گے۔ جیسی بے راہ روی کی شکار نیلوفر کا آخری محبوب بھی ختم ہو گیا تھا گویا اس نے آخری کاغذ بھی نکال پھینکا تھا۔

نیلوفر جو خواب تھی اس کی پیشانی پر چند سلوٹس یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ عالم خواب میں کسی پریشانی سے دوچار ہے۔ عمر اس کے پہلو میں لیٹا اسے دیکھ رہا تھا۔ یکا یک نیلوفر کا نازک جسم کا پ گیا اس نے آنکھیں بند رکھیں اور ہاتھ پھیلا کر کہا ”عمر تم کہاں ہو؟“

”میں یہاں ہوں تمہارے قریب۔“ عمر بیڑا دیا۔ ”اوہ.....“ نیلوفر نے آنکھیں کھول دیں۔ ”میں سمجھی کہ شاید تم آج پھر کہیں گھومنے نکل گئے ہو۔“

”میں گیا تھا لیکن اب واپس آ گیا ہوں۔ میں

مطمئن ہو گیا۔ لاش کو گڑھے میں اتار کر اس نے مدہم سی چاندنی میں ایک مرتبہ پھر لاش کا چہرہ دیکھا۔ خون آلود ہچکی ہوئی کھوپڑی اور اُلی ہوئی آنکھوں نے اس کے جسم پر ہچکی ماری کر دی۔ اس نے شاہد کی آنکھوں میں بے پناہ نفرت کے تاثرات منجمد دیکھے اور چونک کر چوں کی طرف متوجہ ہو گیا جن کا ڈھیر اس کے قریب ہی تھا۔ وہ دیوانہ وار چوں کو گڑھے میں پھینکنے کا چاند ہی لحوں میں لاش خشک چوں سے ڈھک گئی۔

لاش چھپ گئی تھی لیکن عمر محسوس کر رہا تھا کہ اس کے آس پاس کوئی موجود ہے۔ اس نے گھبراہٹ ہوئی نگاہ سے گرد و پیش کا جائزہ لیا کوئی دکھائی نہ دیا لیکن دو گھمورتی ہوئی آنکھیں اس کے حواس پر چھا گئی تھیں وہ آنکھیں اسے مسلسل گھور رہی تھیں۔ نفرت کے شعلے برساتی ہوئی خوفناک آنکھیں۔

وہ جلدی سے واپس پلٹا ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ چونک کر رک گیا۔ چھڑی کی آواز واضح طور پر اس کے کانوں سے نکل رہی تھی..... ٹھک..... ٹھک..... وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کے رُکتے ہی آواز بھی بند ہو گئی۔ یوں محسوس ہوا تھا کہ کوئی چھڑی کے سہارے بدوقت تمام چلا ہوا اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

”کون ہے.....؟“ وہ چیخا۔

کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور پھر چلتا شروع کر دیا۔ اس کے آگے بڑھتے ہی چھڑی کی ٹھک ٹھک دوبارہ سنائی دینے لگی۔ وہ تیزی سے چلے لگا آواز بھی تیزی سے سنائی دینے لگی۔ وہ بھاگ اٹھا، ٹھک ٹھک کی آواز طوفانی ہو گئی۔ کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

کی وجہ سے وہ اس کے دل میں نہیں سا سکا تھا۔ اور اب وہ اس کا شوہر تھا اس نے زمانے بھر کی ٹھکرائی ہوئی آبرو باختہ نیلوفر کو سہارا دیا تھا لیکن خود اس کا ذہن نہ جانے کیوں متاثر ہو گیا تھا۔

اس کی حرکات دیوانوں جیسی تھیں، کبھی کبھی تو اسے عمر سے خوف محسوس ہونے لگتا تھا لیکن اس نے اسے کبھی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن عمر کی پریشانی کا سبب دریافت نہ کر سکی۔

اب تو نیلوفر کو یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔

جب شادی کے بعد کئی راتیں یوں ہی گزر گئیں تو ایک رات وہ بھڑک اٹھا، ”آخر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟ جب تم اس قابل ہی نہ تھے تو میری زندگی برباد کرنے سے کیا فائدہ؟“

عمر نے بڑے کرب سے اس کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا ”یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں بات دراصل یہ ہے کہ میں میں تمہارے ساتھ نہیں سو سکتا۔ وہ آنکھیں وہ آنکھیں“ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

عمر کے خواب ایک ہی جیسے ہوتے تھے۔ وہ آنکھیں بند ہوتے ہی دو خوفناک آنکھیں دیکھتا تھا۔ وہ آنکھیں اسے گھورتی رہتیں اور وہ بستر کی چادر کو ہاتھ کی گرفت میں لیتا بے تابی سے کروٹ بدلتا اور پھر جج کر اٹھ بیٹھتا تھا۔ وہ ان آنکھوں سے چپنے کی کوشش کرتا لیکن ناکام رہتا۔ آنکھیں اسے گھورتی رہتیں اور ذہن میں چمڑی کی ٹھک ٹھک کو بجے لگتی تھیں کئی بار وہ اپنے قریب کسی غیر مرئی وجود کو محسوس کرتا خوفناک گھورتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتا اور

رات بھر نہیں سو سکا میرا خیال ہے اب کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں اور سونا چاہتا ہوں۔“ وہ اٹھ کر کھڑکی کی طرف بڑھا باہر جھانکتے ہوئے وہ جیسے غلامیں گھور رہا تھا۔ نیلوفر بھی بستر سے اٹھی اور اس کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنا خوبصورت ہاتھ عمر کے کندھے پر رکھ دیا لیکن عمر نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

”مجھے انسو ہے عمر دراصل میں تمہارے لئے پریشان ہو گئی تھی۔ رات تمہاری حالت ٹھیک نہیں تھی آخر تم کسی ڈاکٹر سے کیوں مشورہ نہیں کرتے۔ کب تک رات بھر ٹھٹھکے رہو گے۔ یہ بیقراری دینی اتھری کی علامت ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں بلاناخبر کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہئے۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں ڈارلنگ۔“ اس نے قدرے نرم لہجے میں کہا ”بالکل ٹھیک ہوں تم گورنٹ کرو۔“

نیلوفر خاموش رہی لیکن وہ جانتی تھی کہ عمر اس سے جھوٹ بول رہا ہے۔ یقیناً اس کے ذہن پر کوئی بوجھ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ تین ماہ سے اس کے قریب نہیں آیا۔ انہوں نے تین ماہ قبل شادی کی تھی لیکن اب تک ایک بھی رات وہ دونوں ایک دوسرے کا حقیقی قرب حاصل نہیں کر سکے تھے۔

یہ راتیں اس نے کس طرح گزاری تھیں یہ تو کچھ اسی کو معلوم تھا لیکن شادی کے بعد اب وہ ادھر ادھر نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے شادی کرتے ہی جنسی بے راہ روی کا لبادہ چاک کر کے پھینک دیا تھا۔ لوگوں نے اسے بری طرح لوٹا تھا لیکن کسی نے وفا نہ کی۔ ہلا خروہ عمر کی آغوش میں سامگئی وہی عروج ایک عرصہ سے اسے چاہتا تھا لیکن بد صورت ہونے

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور ایمان افروز فخریہ پیشکش

قیمت: 175 روپے



40 درخشندہ ستاروں کے

روح پرور اور بصیرت افروز

تذکروں پر مشتمل

- جنہوں نے اپنی آنکھوں سے جلوہ یار کا بے نقاب مشاہدہ کر کے شرف صحابیت پایا
- جنہوں نے منبع رشد و ہدایت ﷺ سے براہ راست کسب فیض کیا
- جنہوں صاحب قرآن ﷺ سے قرآن کے رموز و اسرار سمجھے
- جنہوں نے اپنے خون جگر سے چمنستان اسلام کی آبیاری کی
- جنہوں نے اپنے ارفع سیرت و کردار سے چہرہ انسانیت کی سیاہیاں دھو ڈالیں
- جنہوں نے انتھک مخلصانہ جدوجہد سے جنت نظیر معاشرہ کی صورت گری کی
- جنہوں نے فیصلہ کن اور غیر مصالحانہ ٹکڑے کر باطل کو تہہ و بالا کر دیا

500 صفحات پر مشتمل سفید کاغذ، عمدہ کتابت اور دیدہ زیب سرورق

شائع ہو گیا ہے

سے رکنے کے لئے کہا اور پھر عمر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”مسٹر عمر! میں معذرت چاہوں گا اچانک ہی میری منگیتر نظر آ گئی ہے۔ کیا میں امید رکھوں کہ کسی رات آپ اپنی بیگم کے ہمراہ کلب ضرور آئیں گے۔“

”ہم دونوں رات کے وقت گھر سے نکلتا پسند نہیں کرتے۔“ عمر نے خشک لہجے میں کہا اور تیز چل چلا ہوا آگے بڑھ گیا۔ خالد نے اس کے لہجے کی سختی کو غائب محسوس نہیں کیا یا پھر ممکن ہے وہ منگیتر کے خیال میں گمن اس کی طرف سے مکمل طور پر لا پرواہ رہا۔ وہ کمیت میں گھس کر تیز چل چلا ہوا ادھر بڑھ گیا جہاں وہ حسین لڑکی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

عمر جنگل کی طرف تیزی سے جا رہا تھا۔ آخری راستے پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ خالد اور اس کی منگیتر بانہوں میں ہاتھیں ڈالے جنگل ہی کی جانب چلے آ رہے تھے۔ وہ راستہ پار کرتا ہوا جنگل میں گھس گیا۔ اس کا رخ اسی جانب تھا جہاں اس نے شاہد کی لاش ایک گڑھے میں دفن کر دی تھی۔

جنگل میں سمجھتے ہی اسے کسی وجود کا احساس ہونے لگا۔ کوئی اس کے آس پاس موجود تھا۔ اس نے کئی مرتبہ چونک کر ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی دکھائی نہیں دیا۔ البتہ ٹھک ٹھک کی آوازیں واضح طور پر اس کا قہقہہ کر رہی تھیں۔ اس کا ذہن مختلف اندیشوں میں گھر گیا۔ وہ شاہد کی لاش کو پورے چار ماہ بعد دیکھنے جا رہا تھا۔ چار ماہ بعد وہ کیسا ہو گیا ہوگا.....؟ یہ سوچ کر ہی اس کے بدن پر کچلی طاری ہو گئی۔ ایک مرتبہ تو اس کا جی چاہا کہ واپس لوٹ

پھر اسکے کانوں میں نادیہ چھڑی کی ٹھک..... ٹھک کی آوازیں آنے لگی تھیں..... غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ شاہد کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ باہر نکلا تو اس نے فیملہ کر لیا کہ وہ ہر حال میں شاہد کی لاش کو دیکھنے جائے گا۔ ایک یہی صورت تھی کہ اسے شاہد کے زعمہ یا مردہ ہونے کا علم ہو سکتا تھا۔

دن کی روشنی میں اس نے خود کو ہر طرح سے تسلی دی کہ ایک بے جان جسم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ کھلے کھیتوں کی طرف نکل گیا، ابھی وہ کچھ ہی فاصلہ طے کر پایا تھا کہ ایک بانس آواز سنائی دی۔

”ہیلو..... مسٹر عمر..... کہاں کے ارادے ہیں؟“ وہ ٹھٹھک کر ڈک گیا، اس کے سامنے خالد کھڑا تھا۔ دونوں ایک ہی کلب کے ممبر تھے اس لئے انہیں ایک دوسرے کو شناخت کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

”اگر میں آپ کے ساتھ چلوں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟ کیا خیال ہے مسٹر عمر؟“ خالد نے مسکرا کر کہا۔ ”ویسے کتنی دُور جانے کا ارادہ ہے؟“

”کچھ زیادہ دُور نہیں صبح طبیعت کچھ بوجھل تھی اس لئے کھیتوں کی طرف نکل آیا تھا۔“

”آج کل کلب بھی نہیں آ رہے کیا شادی کے بعد مصروفیات بڑھ گئی ہیں؟“

”یونہی سمجھ لیں۔“ عمر نے سرسری سا جواب دیا اور خاموشی اختیار کر لی۔

دونوں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر آگے بڑھتے رہے۔ اچانک ایک جگہ خالد ڈک گیا اس کی نگاہیں ایک جانب مرکوز ہو گئیں۔ کچھ فاصلے پر ایک حسین لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ خالد نے اسے اشارے

سیاہ رنگ کی غیر معمولی جسامت والی ان گنت چوٹیاں اچانک وہ چونک پڑا اور خیالوں کی دنیا سے نکل آیا۔ آنکھوں کی جگہ اسے گول سوراخ دکھائی دے رہے تھے۔

چوٹیاں آنکھ کے حلقوں سے کھس کر پیشانی سے برآمد ہو رہی تھیں۔ دہانہ کھلا ہوا تھا اگرچہ چہرے کا گوشت ان چوٹیوں نے کھالیا تھا تاہم اسے محسوس ہوا کہ شاید اس وقت بھی مسکرا رہا ہے۔ دانتوں کے درمیانی حصے میں بھی وہ خوفناک چوٹیاں رینگ رہی تھیں۔

”اُف خدایا ان چوٹیوں نے اسے بالکل کھالیا ہے۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور نرم گھاس پر گر گیا۔ کس قدر خوفناک منظر تھا! اس کی روح تک لرز گئی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ آخر وہ اس جگہ کیوں آیا تھا۔ شاید کے مرنے کا تو اسے دُش کر تے وقت ہی یقین ہو گیا تھا ظاہر ہے ٹوٹی ہوئی کھوپڑی کے بعد کوئی شخص بھی زندہ نہیں رہ سکتا، پھر وہ کیوں جنگل کے اس حصے کی طرف چلا آیا.....؟

اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اس جگہ تنہا نہیں ہے۔ لاکھ کوشش کے باوجود وہ کسی کو دیکھنے سے محذور رہا اور پھر تو وہ خوفزدہ ہو کر نرمی طرح چیخ پڑا لاش سے برآمد ہونے والی آدم خور چوٹیاں قطار کی شکل میں اس کے جوتوں تک پہنچ گئی تھیں، ان کا عقبی حصہ سورج کی کرنوں میں چمک رہا تھا اور ننھا سا لیکن خوفناک دہانہ بار بار مکمل کر بند ہو رہا تھا جیسے وہ اس کے جیتے جاگتے جسم کو کھانے کیلئے بے تاب ہوں۔

وہ اٹھا اور بری طرح پاؤں جھٹکنے لگا۔ اس خیال

جائے اس نے کوشش بھی کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی ناپیدہ قوت اسے اس گڑھے کی طرف دھکیل رہی ہو۔ دفعتاً اس نے بایاں کندھا قدام لیا اور نرمی طرح چپھا۔

کسی نے اس کے کندھے پر چھڑی کا بھرپور وار کیا تھا، اس نے خوف سے پٹی پٹی ٹکاپیں اُدھر اُدھر دوڑائیں لیکن دُور دُور کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا۔ دفعتاً وہ دیوانوں کی طرح ہڈیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ اسے یاد آگیا کہ شاید نے اس سے بچنے کے لئے چھڑی سے کندھے پر وار کیا تھا اور اب اسے لاشعوری طور پر وہ تکلیف دہ بات یاد آگئی تھی۔

کاہنتی ہوئی اگلیوں سے اس نے سگریٹ سلگایا اور گہرے کش لگا کر مصائبی اشتہار پر قابو پانے کی کوشش کی، پھر کسی حد تک مطمئن ہو کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اگرچہ وہ اعدا و دُش وہاں تک چلا آیا تھا لیکن بلا آخر اسے محسوس ہوا کہ وہ بالکل اس گڑھے کے قریب پہنچ گیا ہے جہاں اس نے بچوں کے ڈمیر میں شاہد کی لاش کو دفن کیا تھا۔ آہستہ آہستہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے گڑھے پر رکھی ہوئی شاخوں کو کھینچنا شروع کر دیا چار لمبے کی مدت نے بچوں کو خمد کر دیا تھا۔ اگرچہ شاخیں کھینچنے میں کافی دشواری ہو رہی تھی تاہم اس نے پندرہ منٹ سے بھی کم وقفے میں بچوں کی تہہ فتم کر دی اور پھر جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

سامنے شاہد کی لاش پڑی ہوئی تھی، آنکھیں اُٹلی ہوئی اور بالکل اسی حالت میں اسے گھور رہی تھیں جیسے کہ وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کی پیشانی پٹی ہوئی تھی اور غلام میں چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

نرم لہجے میں کہا ”براہ کرم اپنے شوہر کو ہسپتال پہنچانے میں ہماری مدد کریں۔“

نیلوافر کا حسین چہرہ لاش کے چہرے کی مانند سفید پڑ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب عمر کے لئے کوئی آس لگنا ہی بیکار ہے۔ دیوانگی کی حالت اب پوری طرح اس پر غالب آ چکی ہے اس نے سوچا اور خاموشی سے سیزیموں کی طرف بڑھ گئی۔

ہسپتال تک کئی صدیوں کا سفر تھا جب کار ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تو نیلوافر کے چہرے سے رہا سہا خون بھی غائب ہو گیا۔ کار سے اتر کر وہ مسٹر عظیم کی رہنمائی میں ایک اندرونی کمرے تک پہنچی اور پھر چائے کی نیم گرم چسکیوں کے دوران اس سے چند عجیب و غریب سوالات کئے گئے۔ ہر سوال اس کے ذہن پر ہم کا سادھا کہ کر رہا تھا لیکن شوہر کی دیوانگی پر اس قسم کے سوالات سے پہلو بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس سے ایک ایک بات کرید کر دریافت کی گئی لیکن وہ کوئی ایسی بات نہ بتا سکی جس سے عمر کے پاگل پن پر کسی قسم کی روشنی پڑ سکتی۔ تھک ہار کر ڈاکٹر عظیم نے اسے رخصت کر دیا۔

عمر کو دماغی امراض کے ہسپتال پہنچانے کے بعد اسے ایک کمرے میں بند کر کے دروازے میں تالا ڈال دیا دن بھر اس نے کھانے پینے کی کسی بھی چیز کو چھوا تک نہیں۔ اس کے حواس پر دو خوفناک آنکھیں سوار تھیں اور وہ ان سے بچنے کے لئے کمرے میں چکرارہا تھا۔

بار بار اس کی چھٹی عمران کی سماعت سے کمراتی تھیں وہ دروازے سے سرخ شیخ کر چلا رہا تھا ”مجھے باہر نکالو ورنہ میں مر جاؤں گا۔“ عمران اس کی آواز

نے اس کے اعصاب پر شدید حملہ کیا کہ یہ آدم خور چوٹیاں شاہد کی کھوپڑی سے نکل کر اس کی ٹانگوں پر چڑھ گئی ہیں۔ وہ دیوانہ وار پاؤں جھٹکتا ہوا بھاگ اٹھا۔ خوف کی ڈری ڈری چھٹی اس کے حلق سے نکلتی رہیں اور چھڑی کی ٹھک ٹھک تیز آواز سے سنائی دینے لگی۔ بار بار وہ پلٹ کر دیکھتا لیکن چوٹیاں اس کے تعاقب میں نہیں تھیں البتہ کوئی غیر مرئی ہستی اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ چیخا چلاتا جنگل سے نکلا اور کھیتوں میں بھاگتا چلا گیا۔

نیلوافر نے اسے کسی بچے کی مانند پیچھے چلاتے محسوس کیا اس نے لاکھ کوشش کی کہ عمر سے اس حالت کی وجہ دریافت کرے لیکن وہ کچھ نہ بتا سکا۔ بلا خروہ اٹھی اس نے اپنے شوہر کو سونے کا مشورہ دیا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ باہر آتے ہی اس نے دروازے کو تالا لگا دیا پھر ہانپتی ہوئی فون کی طرف بڑھی۔

چار ماہ کی زہر آلود ازدواجی زندگی میں وہ جن حالات سے دوچار تھی وہ مزید خندوش ہو گئے تھے۔ عمر کی حالت دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اس کے ذہن پر کسی خوفناک منظر کا تاثر منجمد ہو گیا ہے۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے دماغی امراض کے سرکاری ہسپتال کو فون کر دیا۔

فوری ہسپتال کا ایک سرکاری آفیسر کمر پہنچ گیا ”آپ کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی مسٹر عظیم۔“ نیلوافر نے پرتشوی لہجے میں کہا ”عمر کو انتہائی خوفناک حادثہ پیش آیا ہے۔“

”کیا آپ نے اسے بند کر رکھا ہے مسز عمر؟“ ڈاکٹر عظیم نے دریافت کیا۔

نیلوافر نے اثبات میں سر ہلایا تو عظیم نے انتہائی

ہوا دروازے تک آیا۔ اس نے دستک دے کر عمر کو متوجہ کرنے کی کوشش کی اور بلند آواز میں کہا ”سنو مسٹر تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔ آرام سے بستر پر لیٹو اور سو جاؤ۔ میں تمہاری حفاظت کر رہا ہوں۔“

”تم نہیں جانتے وہ مجھے جان سے مار ڈالے گا۔“ عمر کرائے لگا۔

”سو جاؤ ابھی بہت رات باقی ہے۔“ نگران نے کہا اور دوسری جانب نکل گیا۔

رات کا دامن ہر لمحہ سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ بادلوں نے آسمان کی روشنی کی طرح آنکھوں پر بھی پردہ ڈال دیا اور پھر سرد ہوائیں چلنے لگیں۔ ہسپتال کا عملہ کمروں میں گھس گیا لیکن دو آفیسر جو ٹائٹ ڈیوٹی پر تھے کوریڈور میں کھڑے باقی کر رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک کی نگاہ اوپر اٹھ گئی۔

”کیا تم نے کچھ محسوس کیا؟“ اس نے اپنے ساتھی کو کہنی مارتے ہوئے سرگوشی کی۔

دوسرے نے دھندلے سے ماحول میں گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر انکار میں سر کو حرکت دیتے ہوئے کہا ”نہیں کچھ نہیں کیوں کیا بات ہے؟“

”اس پاگل کی خاموشی پر اسرار ہے۔“

”یہ دماغی امراض کا ہسپتال ہے۔“ دوسرے

سن کر مسکرایا۔ ”بے چارہ پاگل شاید یہ نہیں جانتا کہ باہر اس کے لئے کس قدر خطرہ موجود ہے۔“

نصف گھنٹے بعد چاند کی کچھ کرنوں کی وجہ سے کمرے میں اُجالا ہو گیا تو اس کے ہونٹوں پر بھی مہر خاموشی ثبت ہو گئی۔ دن بھر عالم دیوانگی میں شر مچاتے گزر گیا تھا۔ تصادم سے اس کے جسم کا جوڑ جوڑ ڈکھ رہا تھا۔ وہ لیٹا اور پھر گہری نیند سو گیا۔ سوتے ہی خوفناک خواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس نے دیکھا کہ وہ اس کڑھے کے قریب کھڑا ہے اور سیاہ آدم خور چوئیاں اس کے پیروں پر رینگ رہی ہیں پھر وہ بھاگ اٹھا لیکن چوئیاں نے اس کا چپچا نہیں چھوڑا۔ وہ کمرے میں لیٹا ہوا ہے اور چوئیاں کی قطار اس کی جانب بڑھ رہی ہے..... آف خدایا وہ چوئیاں۔

اسی لمحے اسے شاید کی موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ وہ کروٹ بدل کر اٹھا اور پھر بدحواس ہو کر دروازے کی طرف بھاگا۔ دونوں ہاتھوں سے دروازہ پھینٹے ہوئے وہ حلق کے بل چیخا ”مجھے باہر جانے دو..... اودہ خدایا..... مجھے جانے دو ورنہ میں مر جاؤں گا۔“

ہسپتال کے نگران نے اس کی چیخیں نہیں توڑیں۔

بہترین دوا

زندگی میں مختلف بیماریوں کا مختلف دواؤں سے علاج ہوتا ہے۔ لیکن طویل تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ انسان کے لئے بہترین دوا ”عزت“ اور ”محبت“ ہے۔

اگر کوئی آپ سے کہے کہ یہ اثر نہیں کرتی تو آپ مسکرا کر کہنا..... دوا کی مقدار بڑھا دو!

(مرسلہ: نورین سفیر۔ لالہ موہلی)

نے تہقہ لگا کر کہا ”ممکن ہے تھوڑا بہت تم پر بھی اثر ہو گیا ہو۔“

”نہیں مجھ سے دور رہو..... نہیں نہیں..... مجھ سے دور رہو۔“ اچانک عمر کی خوفناک آوازیں ان کی سماعت سے ٹکرائیں اور وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

”ہمیں ایک نظر دیکھ لینا چاہئے۔“ ایک آفیسر نے کہا۔

”چھوڑو یا یہ دیوانہ ہے ممکن ہے یہ بوجھ اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا ہو۔“ دوسرے نے کہا اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ رات بھر عمر کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ بار بار وہ چیخا اور فریاد کرتا تاکہ اسے باہر نکالا جائے لیکن کسی نے توجہ نہیں دی۔

سورج نکلنے کے کوئی دو گھنٹے قبل ایک ڈیوٹی آفیسر سے برداشت نہ ہو سکا وہ تیزی سے عمر کے کمرے کی طرف لڑکا اور دروازہ کھولنے لگا۔ عین اسی لمحے اسے عمر کی گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی اور پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

دروازہ کھلتے ہی وہ خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹ گیا، اگلے ہی لمحے خود اس کے طلق سے ٹکلی ہوئی چیخ نے ہسپتال کی عمارت میں خوف کی لہر دوڑا دی۔ سب ہماگ کر وہاں پہنچے۔ وہ پچھلی پچھلی نگاہوں سے کمرے کے عین درمیان میں دیکھ رہے تھے جہاں کبیل نما کوئی چیز حرکت کرتی دکھائی دی۔

”چوٹیاں.....“ ایک بڑ بڑایا اور سب اس کی صورت دیکھنے لگے۔ کمرے میں عمر کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا اور موٹی موٹی خوفناک چوٹیوں کی قطار اب آہستہ آہستہ دروازے کی طرف رینگ

رہی تھی۔

ڈیوٹی آفیسر نے فوراً ہی ڈاکٹر عظیم کو اطلاع دی جس نے ان چوٹیوں کو دیکھ کر اسی لمحے ماہ حشرات الارض کو فون کر کے طلب کر لیا۔ اس نے بڑی باریک بینی سے ان چوٹیوں کا جائزہ لیا اور انہیں آدم خور قرار دے دیا۔

”اگر یہ چوٹیاں آدم خور ہیں تو یہ کہاں سے آگئیں؟“ ڈاکٹر عظیم نے حیرت سے کہا۔

”اس کا سراغ لگانا مشکل نہیں۔ چوٹیوں کی یہ قطار ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔ دراصل یہ شخص یقیناً کسی ایسی جگہ گیا تھا جہاں یہ چوٹیاں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک دو اس کے ساتھ یہاں تک آگئیں۔ ان چوٹیوں کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر یہ کسی آدمی کا خون چکھ لیں تو پھر لاکھوں میل دور بھی اس کا پتہ نہیں چھوڑتیں۔ آئیے دیکھتے ہیں یہ کدھر سے آرہی ہیں۔“

دماغی امراض کے ہسپتال کے شاف کے کئی ممبر ماہر حشرات الارض اور عمر کی بیوی نیلوفر چوٹیوں کی قطار کے ساتھ ساتھ شاہد کی لاش تک پہنچ گئے۔ نیلوفر نے ہڈیوں کے ایک ٹکڑ کو دیکھا تو چیخ کر پیچھے ہٹ گئی اور پھر اس کی نگاہیں شاہد کی چھری پر مرکوز ہو گئیں۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اس چھری کو اچھی طرح سے پہچان گئی تھی یہ شاہد کی واکنگ سٹک تھی جسے اس نے شاہد کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ اس نے ڈوبے ہوئے ذہن کے ساتھ ڈاکٹر عظیم کی آواز سنی جو اپنے کسی آدمی کو پولیس نکلانے کے لئے ہدایات دے رہا تھا۔ اور پھر وہ لہرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔





تیرے سوا کوئی نہیں سو سو سلام
تیرے جلوؤں سے منور دو جہاں
اے حسینوں سے حسین سو سو سلام
عرش تیرا فرش تیرا لوح اور تیرا قلم
زمینت عرش و زمیں سو سو سلام
عرش اعظم سے بھی آگے تو گیا
بزرگبد کے کیں سو سو سلام
السلام اے صاحب کون و مکاں
رحمت العالمین سو سو سلام
شوق ہے بخشش کا طالب یا نبی
یا شفیع الحمد للہ سو سو سلام
(شوق خانواہی۔ خانواہن)

غزل

تم مجھ کو چھوڑ کر نہ جانا
کیا خود کو چھوڑ دوں کہو تو؟
لینا کھ یوں نہ موز مجھ سے
کیا خود کو توڑ دوں، کہو تو؟
تو چاہے تو ترے لئے ہی
یادوں کو چھوڑ دوں، کہو تو؟
مجھ کو تو توڑ ہی دیا ہے
کیا تجھ کو جوڑ دوں، کہو تو؟
اجھ ہے ناپسند تجھ کو

”حمد“
الرحمہم تیرا نام القُدوس تیرا نام
رہتا ہے میری زبان پہ اللہ تیرا نام
تیرے ”کُنْ“ سے پیدا جہاں یہ ہوا
تیرے ”کُنْ“ سے پیدا ہیں ارض و سما
تیرے ”کُنْ“ سے سنوئے تقدیر میرے
الغفور تیرا نام الشکور تیرا نام
رہتا ہے میری زبان پہ اللہ تیرا نام
میں گنہگار ہوں ہاں گنہگار ہوں
مگر تیرے در کی بھکارن بھی ہوں
محاف کر دے مجھے جھولی بھر دے میری
الغفور تیرا نام الرزوف تیرا نام
رہتا ہے میری زبان پہ اللہ تیرا نام
جب سے پیدا ہوئی اک یہی آس ہے
کب دیکھوں گی روضہ کی جہالیاں
ان سے لپٹوں اور دھلوں اپنے گناہ
میری فریاد سن لے بلا لے مجھے
الہ تیرا نام التواب تیرا نام
رہتا ہے میری زبان پہ اللہ تیرا نام
(شمس اقراریہ۔ ساہیوال)

نعت رسول ﷺ

تو امام المرسلین سو سو سلام

کیا اسکو چھوڑ دوں، کبھ تو؟
(بلال احمد فاروقی)

غزل

کبھی نظریں چراتا چاہتا ہوں
کبھی نظریں لٹاتا چاہتا ہوں
غم دوراں گھٹاتا چاہتا ہوں
غم جاناں بڑھاتا چاہتا ہوں
سکون دل لٹاتا چاہتا ہوں
کسی کے ناز اٹھاتا چاہتا ہوں
مجھے درد جدائی دینے والے
تیرے نزدیک آتا چاہتا ہوں
ملی ہے کچھ سکون دل کی دولت
تیرے در پر لٹاتا چاہتا ہوں
غم دوران سے کچھ فرصت ملے تو
ذرا سا مسکراتا چاہتا ہوں
ہوئی تعمیر من کی نفرتوں پر
وہ دیواریں گرانا چاہتا ہوں
انا کے ساتھ تھی کچھ سرکشی سی
مگر اب سر جھکانا چاہتا ہوں
تمہارے نام ہو تعمیر جس کی
اک ایسا گھر بنانا چاہتا ہوں
محبت کی نظر ہو اک ادھر بھی
غم فرقت بھلانا چاہتا ہوں
نجانے میں بھی کیوں منظور آتھیں
حقیقت سے چراتا چاہتا ہوں
(منصور احمد لاہور)

غزل

تم مجھے بھول جاؤ میں تمہیں بھول جاؤں
یہ دونوں طرف سے ممکن ہو نہیں سکتا

سمندر کے گہرے نیلگوں پانیوں میں
عکس تمہارا ڈھونڈتا ہوں نظر کچھ نہیں آتا
آنکھیں گہری جمیل کی مانند تھیں تمہاری
ہونٹ پھول کی پتھریوں جیسے!
میرا سکھ جھن لٹنے والے یہ تو بتاؤ
کس طرح کتنی ہیں راتیں کس طرح دن گزرتا ہے؟؟
میری برادریوں کا سوگ مٹانے والے
دکھ جب تمہیں ستائیں تو نہ دینا گلہ کوئی مجھے
جہاں میں اور بھی تو غم ہیں رونے کے لئے
کسی اور غم پہ رو لینا مجھے افسوس نہ ہو گا
(اعجاز احمد - ساہیوال)

غزل

پھولوں کو تو ہر کوئی توڑ سکتا ہے
مگر خوشبو کو کوئی نہیں پکڑ سکتا ہے
ہر لمحہ اس کی خوشنودی کا خیال رہتا ہے
کتنا ہی پہ مزاج اُسکا مٹو سکتا ہے
پچھی اور پردیسی کا کیا بھروسہ
اک چلا جاتا ہے اور دوسرا اڑ سکتا ہے
کتنی مددیں لگ جاتی ہیں گھر بنانے میں
لیکن ایک ہی لمحے میں یہ اُڑ سکتا
دل اگر ایک بار ٹوٹ جاتا ہے تو
پھر یہ دوبارہ کبھی نہیں جڑ سکتا ہے
میں تو اس کو مٹا ہی لوں شاید
اس دل کا کیا اعتبار جو اکڑ سکتا ہے
لحلی کے لٹنے کی بات نا کرو تم قیاس سے
خوشی سے اُسے دیوانگی کا دورہ پڑ سکتا ہے
(نسرین اختر نیلا - لاہور)

دیا کاغذِ قلم آجکل نہ کھوتا
بھی تو ہیں غمِ دل کے ازالے
(وحید شیرازی۔ جہلم)

جینا مونا

اک پردہ پھونایا ہے اور چھ شیشے تڑوائے ہیں
اس کے بدلے یارو "اس" نے دو سولا کھٹی پائے ہیں
"دوڑو بھاگو مدد کرو ہم پر ظلم ہے یہ کیسا؟"
اک سیمیں پردے پر آ کر ایک صفائی یہ چیخا
"ظالم لوگو! خود بھی "جیو" اور ہم کو بھی اب جینے دو
خوفِ خدا دل میں رکھو اور اتنا ستم بھی مت ڈھاؤ
چینل ہے یہ عام سبھی کا یہ تو نہیں سرکاری ہے
"عائی" کے حالات بتانا کیا یہ بڑی غداری ہے؟

"ہائے ہائے! ہے انیائے" ہر اک ہی یہ کہتا تھا
غرب ترس لوگوں کو آیا جب یہ مٹھر دیکھا تھا
ایک وزیر بھی ساتھ میں اپنے پولیس کا دستلے آئے
سب سے پھر انیسویں کیا اور نمبر اپنے بنوائے
اور پھر صاحب! راز کھلا کہ ملی بھگت یہ ساری تھی
چالاکی تھی سازش تھی مکاری تھی عیاری تھی
جینے والے جیتے ہیں اور مرنے والے مرتے ہیں
چالاکوں کے ہشیاروں کے پیٹ ہمیشہ بھرتے ہیں
(پروفیسر محمد عریف خان۔ صادق آباد)

اس ماہ کا شاعر

میراث نام جاوید اقبال ہے۔ میں لاہور میں پیدا ہوا
کچھ جوہات کی بنا پر سکول چھوٹ گیا میں پھر آرٹ اور
ادب سے دل لگا لیا ریڈیو سننے کا شوق تھا گیت غزلیں
سننا یوں شاعری کا شوق ہوا انسانِ رومان پرست ہوتو
موسمِ خودی کد کد ادا دیتے ہیں اور جذبے ہاتھوں میں قلم

نظم

میرے پیار میں کتنا پیار
میں تجھ کو کیسے تلاؤں
میں تیرے رنگِ روپ کا دیوانہ
تیرے انگ کا دیوانہ
تیری ہر ادا مجھ کو پاگل کر دے
میں کہنے لگا خود کو
میں پاگل ہوں
تیرے پیار میں پاگل ہوں!

(انیس فرینڈ)

غزل

کسی کی جستجو پاؤں کے چھالے
بادِ مختصر سا ہوں سنبھالے
بہت اچھا لگے ببولے سے کوئی
جب اُس کے نام سے مجھ کو نکالے
ستم سہ کے سنکر کو دعا کیں؟
دل مجھوں تجھے میرا خدا لے
مجھے کل حوصلہ دینا ہے تجھ کو!
جی بھر کے آج لے مجھ کو نزالے
مثال اپنی ہے اُس خالی مکاں ہی!
پڑے ہوں جس کے ہر اک در پہ تالے
سنبھلا اے اندھیروں کے ہراساں!
لگ لے جائیں نہ تجھ کو اچالے
نمے دتوں میں ہو کوئی تو پُرسان
عجب خوش فہیوں میں یار پالے
کیے مسند نشیں گردوں نے لا کر
بلا کے جو ملے کم ظرف والے

اب اس ک شہر میں ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں
فراز آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں
(احمد فراز)

پکڑا دیے ہیں سو جب بھی مدھوتی ہے کچھ لکھ لیتے ہیں
پھول میگزین میں کچھ بنائے کہانیاں لکھیں نظمیں
غزلیں لکھیں ایک اشاعتی ادارے میں بھی کام کیا اب
ایک جنرل مشور چلا رہا ہوں اور لکھنے پڑھنے سے شغف
ہے بس یہ ہے مردِ ادب زندگی۔

تازه کلام

عالم رنگ و بو پہ چھایا ہے دھواں
دور افق پہ ہے روشنی کا سماں
دیکھ رہی ہے جو نظر وہ ہے نہیں
سراب ہے نظر آتا ہوا آب رواں
یہ جو چاند ہے سر آسمان چمکتا
ہے تھت زریں کہ ہے اک جہاں؟
چہرے سے جو رقصاں ہیں زیرِ فلک
روحِ حقیقت ہے بادلوں کا کارواں
زریں پہ تئی یہ آسمان کی صہمت
حد نظر ہے زروں کا ہے جہاں
(عابد اقبال)

☆☆☆☆

پہنچنے پر غزل

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
 سوا اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے بولے تو باتوں سے پہوز جھڑتے ہیں
 یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں
 نظر اٹھے تو یہ سمجھو کہ دین و دل تو گئے
 سو پروان تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں
 سنا ہے اس کے شبتاں سے متصل ہے بہت
 مکین ادھر کے بھی جلوے احر کے دیکھتے ہیں
 رکے تو گردش اس کا طواف کرتی ہیں
 ملے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

خاصی اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعره کا تعارف بطور تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہوتا چاہتے ہیں وہ اپنا تازہ غزل/تلم/پندیدہ شاعر کی غزل/تلم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کو پتہ پر کر کے پیارہ ڈائجسٹ: 244 میں مارکیٹ ریوایز گاؤن لاہور مر ارسال کریں۔

کوین برائے اس ماہ کا شاعر

کی قابلیت:

یہاں اے

تصویر

مسئلہ کریں

پسندیدہ شاعر:.....

پسندیدہ غزل/ نظم

تاریخ عدائش / ص ۷۰

شادی شدہ / غیر ستاری ش :

10

ای میل:-

نوٹ: اپنی پسند ناپسند شاعری کی ابتدا حراج اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔



پاکستانی گیم ڈویلپر... سعدیہ بشیر

بڑکیوں کے محض گھر گرتی اور گڑیوں سے کھیلنے کا زمانہ اگرچہ پرانا ہو گیا اور ہمیں کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، وٹمنکس جیسے کھیلوں میں لڑکیاں نہ صرف حصہ لیتی بلکہ کامیابی کے چمکے کا ذوقی نظر آتی ہیں۔ تاہم اب بھی کئی کھیل ایسے ہیں جن کا نام آتے ہیں لوگ انہیں صرف لڑکوں کا شغل سمجھتے ہیں۔ ایہ ۱۰۰ ایک کھیل ویڈیو گیمز کا ہے۔ لیکن اسلام آباد کی رہائشی سعدیہ بشیر نے نہ صرف اس شوق کو اپنایا بلکہ نئے انداز اور نظریہ کے ساتھ ویڈیو گیمز بنانا بھی شروع کیا۔



بچپن میں بھائیوں کے ساتھ جا کر ویڈیو گیمز کھیلنے کی شوقین سعدیہ بشیر کا تبس اس وقت بڑا حجب انھوں نے یہی گیمز ایک سبیلی کے کمپیوٹر پر کھیلیں۔ اس جدید شین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے تبس میں انھوں نے

والدین سے ضد کر کے اپنا سکول چھوڑا کیونکہ وہاں کمپیوٹر کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ والدین نے ان کا شوق اور پڑھائی میں لگن دیکھ کر ان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ کہتی ہیں: ”میں نے 13 سال کی عمر سے کمپیوٹر پروگرامنگ شروع کی۔ چونکہ میری کمپیوٹر میں ویڈیو گیمز کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اس سے لیے میں نے اسے بھی ساتھ ساتھ جاری رکھا۔“ کالج میں بھی اچھے تعلیمی نتائج کے بعد انھوں نے اہمی مضمون میں گریجویشن کرنے کا فیصلہ کیا تو انہیں احساس تھا کہ ان کے مالی حالات اس کے تحمل نہیں ہو سکتے۔ ایسے میں تعلیمی ادارے نے ان کی قابلیت کے پیش نظر انہیں سکا لرشپ حاصل کرنے کا موقع دینے کا یقین دلایا۔ سعدیہ نے اپنی قابلیت سے ہائیر ایجوکیشن کمیشن کی جانب سے سکا لرشپ حاصل کی اور گریجویشن مکمل کی۔ دوران تعلیم مجھے کمپیوٹر گرافکس کے شعبے نے کافی متاثر کیا۔ میں نے وہیں سے ویڈیو گیمز بنانے کا آغاز کیا۔“

پاکستان میں ویڈیو گیمز بنانے سکھانے والے کسی ادارے کی عدم موجودگی کی وجہ سے سعدیہ نے اپنے شوق کے لیے ڈیڑھ سال تک ویڈیو گیم اڈسٹری میں مختلف ملازمتیں کیں لیکن انہیں لگتا تھا کہ جو وہ کرنا چاہتی ہیں وہ نہیں ہو پا رہا۔ اُن کا کہنا ہے کہ ”مجھے احساس ہوا کہ جو میرا خواب ہے کہ اپنی گیمز کیسے بنائی جاتی ہیں اسے کیسے سیکھا جائے؟ اس لیے میں نے اپنے ماسٹرز کا تھیسز شروع کیا۔ اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ ویڈیو گیم بنانے میں کیا



غلطیاں کی جاتی ہیں اور کیا کارآمد چیزیں ہیں۔“
اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سعدیہ کو خیال آیا کہ جو کچھ انھوں نے
تعلیم اور تحقیق سے سیکھا ہے یہ سب اس فیلڈ میں آنے کے
خواہشمند کئی نوجوانوں کو سیکھنے کے لیے کہیں بھی میسر نہیں ہے۔
اس لیے انھوں نے اپنی ملازمت ترک کر کے ”پکسل آرٹ
اکیڈمی“ کے نام سے ایک ادارہ شروع کیا جہاں وہ نوجوانوں کو
ویڈیو گیمز بنانے کی تربیت دیتی ہیں۔

جلد بیدار ہونی والی خواتین کی سنسور کا

کم شکار ہوتی ہیں

برطانیہ کی برشل یونیورسٹی میں رہنے والی ایک تحقیق میں سامنے آیا ہے کہ ایسی عورتیں جو صبح جلدی بیدار ہونے
میں دقت محسوس نہیں کرتیں ان میں چھاتی کے سرطان کا امکان کم ہوتا ہے۔ برشل یونیورسٹی کے تحقیق کاروں کو
انسانی جسم میں قدرتی گھڑی اور چھاتی کے سرطان میں تعلق ملا ہے لیکن یہ معلوم کرنے کے لیے کہ صبح سویرے
اٹھنے والی خواتین میں چھاتی کے سرطان کے کم امکانات کی وجوہات ابھی تک معلوم نہیں ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے
کہ یہ تحقیق اچھی صحت میں نیند کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔

ہر انسانی جسم میں ایک خود کار گھڑی موجود ہوتی ہے جو چوبیس گھنٹوں کے نمونے پر کام کرتی ہے۔ اس سائنسی
اصطلاح میں سیریکڈین دوم (شب روزہ تبدیلی) کے طور پر جانا جاتا ہے۔ خود کار جسمانی گھڑی ہر انسانی عمل،
نیند سے لے کر موڈ تک سب کو متاثر کرتی ہے۔ لیکن انسانی جسم میں موجود اس گھڑی کا اپنا منفرد وقت ہوتا ہے
اور وہ دوسرے انسان میں موجود گھڑی کے وقت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ صبح اٹھنے والے لوگوں میں جسمانی
توانائی کا عروج بھی جلدی ہوتا ہے اور پھر شام کو جلدی تھک بھی جاتے ہیں۔ دیر سے اٹھنے والے لوگ صبح بیدار
ہونے میں دقت محسوس کرتے ہیں لیکن شام کو ان کی صلاحیتیں زیادہ آشکار ہوتی ہیں اور وہ دیر سے سونا پسند
کرتے ہیں۔

برشل یونیورسٹی کے تحقیق کاروں نے اعداد و شمار کو پرکھنے کے لیے ایک انوکھا انداز اپنایا ہے۔ تحقیق کاروں نے
جلدی اور دیر سے بیدار ہونے والوں میں فرق جانچنے کے لیے ڈی این اے کے 341 تراشوں کا تجزیہ کیا اور
پھر اس علم کی روشنی میں ایک لاکھ اسی ہزار عورتوں پر تجزیہ کیا۔ اس تحقیق میں ظاہر ہوا کہ ایسی خواتین جو صبح جلدی
اٹھنے میں دقت محسوس نہیں کرتیں ان میں چھاتی کے سرطان کے امکانات ان خواتین سے کم ہوتے ہیں، جو صبح
بیدار ہونے میں دقت محسوس کرتی ہیں۔

تحقیق میں ڈی این اے کے ایسے تراشوں کو استعمال کیا گیا جو پیدائشی طور پر انسان میں موجود ہوتے ہیں
لہذا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا رشتہ انسانی جسم کی گھڑی ہے۔

جویریہ کامران

سیارہ کچن کارنر



خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور مٹی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی پوری سہولت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی مٹی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

آدھا چائے کا چمچ، خشک اور لیگانو آدھا چائے کا چمچ، چوتھائی چائے کا چمچ، پیاز چوبڑا 3 چوتھائی کر، نمک حسب ذائقہ، کالی مرچ 1 چائے کا چمچ، مرچ آدھا چائے کا چمچ۔

ترکیب: پیکٹ کی ہدایات کے مطابق گلش تیار لیں۔ ایک پین میں کھانے کا تیل، لہسن اور ڈال کر درمیانی تیز آگ پر 2-3 منٹ پکالیں۔ ٹماٹر، بیڑل، اور لیگانو، چینی، نمک، کالی مرچ ڈال بلائیں۔ پھر اس ساس کو اٹھنے دیں جب تک خشک ہو جائے۔ اب اہلی ہوئی سیکنڈی ڈال کر طرح کس کر لیں۔ پھر تیار کئے ہوئے گلش کو کرا سیکنڈی میں ڈال کر اچھی طرح کس کر لیں۔ تیار کی ہوئی سیکنڈی سردنگ ڈش میں رکھ کر اس پاحران چیز، موزریلا چیز ڈال کر c' 80

Chicken Parmesan Spaghetti



اجزاء: گلش 200g، سیکنڈی پاستہ 1 پیکٹ، زیتون کا تیل 1 چوتھائی کپ، لہسن کی جویں 2 عدد، پاحران چیز (باریک کٹی) آدھا کپ، موزریلا چیز (باریک کٹی) آدھا کپ، کین ٹماٹر 1 کپ، خشک بیڑل

گاجر، اُبلے ہوئے منر اور سفید مرچ ڈال کر چاول اچھی طرح کس کر لیں۔

بیکٹ پر دی گئی ہدایات کے مطابق نکلس تیار کر لیں۔ اب ایک پلیٹ میں چاول ڈال کر اس پر نکلس رکھ دیں۔ سویٹ اینڈ سورس اس کے ساتھ سرو کریں۔

کارن چاٹ

اجزاء: سویٹ کارن (ڈیزہ کپ) 'لہسن



پاؤڈر 1 چائے کا چمچ، نمک آدھا چائے کا چمچ، کالی مرچ آدھا چائے کا چمچ، کارن فلور 4 کھانے کے چمچ، کھانے کا تیل، فرائی کے لئے۔

چاٹ کے اجزاء: لال لوبیہ آدھا کپ، ہرا پیاز آدھا کپ، پیاز آدھا کپ، دھنیے کے پتے آدھا کپ، سبز مرچ 1-2 عدد (آپشنل)، نمک حسب ذائقہ، کالی مرچ 1 چوتھائی چائے کا چمچ، چلی ساس 1 چائے کا چمچ (آپشنل)، لیموں کا رس 1 چائے کا چمچ

ترکیب: ایک پیٹن میں سویٹ کارن، لہسن، پاؤڈر، نمک، کالی مرچ اور کارن فلور ڈال کر اچھی طرح کس کر لیں۔ اب درمیانی آگ پر کارن فلور کوٹ کئے ہوئے سویٹ کورن کو 6-8 منٹ فرائی کر لیں۔

ایک باؤل میں فرائی کئے ہوئے سویٹ کارن، لال لوبیہ، ہرا پیاز، دھنیے کے پتے، ہری مرچیں، نمک، کالی مرچ اور چلی ساس اور لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح کس کر لیں۔

5-6 منٹ بیک کر لیں۔ فریش پارسلے کے ساتھ گارنش کر کے سرو کریں۔

سویٹ اینڈ سورس



اجزاء: اُبلے چاول ڈیزہ کپ، اُبلے منر آدھا کپ، گاجر آدھا کپ، کھانے کا تیل 2 کھانے کے چمچ، لہسن چوہ 1 چائے کا چمچ، پیاز چوہ آدھا کپ، سویا ساس 1 چائے کا چمچ، سرکہ 1 چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، سفید مرچ آدھا چائے کا چمچ، کالی مرچ آدھا چائے کا چمچ، انڈہ 1 عدد۔

سویٹ اینڈ سورس اس اجزاء: سفید مرچ آدھا چائے کا چمچ، پانی 1 چوتھائی کپ، کارن فلور 1 کھانے کا چمچ، انڈہ 2 تہائی کپ، سرکہ 1 تہائی کپ، انڈہ شوکر 1 تہائی کپ، کچپ 3 کھانے کے چمچ، سویا ساس 1 کھانے کا چمچ، چلی ساس 1 کھانے کا چمچ

نوٹ: جب: سویٹ اینڈ سورس تیار کیلئے ایک پیٹن میں انٹاس جوس، سرکہ، براؤن شوکر، کچپ اور سویا ساس ڈال کر اچھی طرح کس کریں۔ پھر اس کچر میں سفید مرچ، چلی ساس، پانی اور کارن فلور ڈال کر اچھی طرح کس کر لیں۔ اب ایک پیٹن میں کھانے کا تیل، باز، لہسن ڈال کر تھوڑا سا کس کریں پھر انڈہ ڈال کر اچھی طرح کس کر لیں۔ اب اس میں اُبلے ہوئے چاول، نمک، کالی مرچ، سرکہ، سویا ساس،



URDU TUBE
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com



روپ متی اور باز بہادر

بھارت کی ریاست مالوہ کے مغلیہ دور کے ایک مسلمان افغان بادشاہ
باز بہادر اور اس کی ہندو محبوبہ روپ متی کی تاریخی داستان محبت!

شریف آرہن

دل کشی کا باعث نہ ہو کیونکہ میڈیا نے محبت کے
تقدس کو اس قدر پامال کیا ہے کہ محبت کا وہ روحانی
ضرر ایسا اور سبق اب فقط تاریخ کے اوراق میں دفن
ہو چکا ہے۔ لیکن ہمارا یہ ادبی اور دراشی فریضہ بنتا
ہے کہ ان داستانوں کو گاہے گاہے طشت از بام

اگرچہ حقیقت میں واقع ہونے والی یہ ایک عجیب
تاریخی محبت کی داستان ہے جس پر متحدہ قلمیں اور
ڈرامے لکھے اور پیش کیے جا چکے ہیں مگر رومانوی
جذبات کا جو، جو ہر ان عجیب کہانیوں میں نمایاں ہے
محبت کا وہ مفہوم آج کی نئی نسل کے لیے شاید اتنی

دھر آواز سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنا تعارف کروا دے ہوئے جب اس کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ ”روپ متی“ کی بابت اسے پہلے ہی عاتبانہ علم تھا۔

باز بہادر نے اسے اپنے ہمراہ اپنے محل مانڈو میں چلنے کی دعوت دی۔ اس نے یہ شرط رکھ کر سامی بھرنی کے میں: ریائے ریوا کی پرستار ہوں چنانچہ اگر اس کا پانی ادھر سے گزار سکو تو چل سکتی ہوں۔ باز بہادر نے یقین دلایا اور اسے وہاں سے لے جا کر محل کے نزدیک دریائے ریوا کی ایک، جمیل تعمیر کروادی۔ لیکن جب روپ متی کے والد کو اس بات کی خبر ہوئی کہ بادشاہ مسلمان ہے اور میری بیٹی جو کہ ایک راجپوت نسل کی ہندو لڑکی تو اپنی راجپوت ذات پر فخر کا نگہا کرتے ہوئے بیٹی کو اس بندن کو چھوڑ دینے کی ضد کی۔ چونکہ بیٹی کو اپنے والد سے شدید محبت تھی لہذا باطل خواستہ والد کو حلد واپس گھرانے کا وعدہ دے کر رات کی تاریکی میں مرنے کو ترجیح دی اور زہر کا خیال منہ کو لگانے سے قبل موت کا نغمہ گاتا شروع کر دیا۔

ابھی وہ اپنی تین گورکھ کر زہر کا خیال منہ کو لگانے ہی والی تھی کہ باز بہادر آ پہنچا اور اسے والد کی تحویل سے چھرا کر بطور دلہن محل میں لے آیا۔ باپ مقابلے کی تاب نہ لا کر چپ: دگیا۔

لیکن تاریخ کے دیگر اوراق میں اس کہانی کی سچائی بیان کر کے کہا گیا ہے کہ دراصل بائزید کو اپنے والد کی طرف سے ایک صوبے سارنگ پور کی جاگیر بھی ملی تھی۔ اس شہر میں ایک برہمن جادو رائے کافی با اثر شخص تھا اور بائزید سے اس

کرتے رہیں۔ اسی ادبی فکر کے باعث اس کہانی کو مظهر عام پر لا کر قارئین کے لیے ذوق کی تسکین کا سامان مہیا کرنا مقصد ہے۔

بھارت کی سولہویں صدی کی معروف ریاست مالوہ (موجودہ مدھیہ پردیش) کا مختصر سا تاریخی جائزہ لیں تو شیر شاہ سوری نے قادر شاہ کو شکست دے کر شجاعت خان کو مالوہ کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ بائزید خان اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا جو اپنے والد کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوا۔ اپنے دو بھائی دولت خان اور مصطفیٰ خان اور ان کے دیگر مخالف ساتھیوں کو برمی طرح شکست دے کر خود مختار سلطنت بن: داور ”باز بہادر“ شاہی لقب اختیار کیا۔ بعد ازاں اس نے گوندوانہ کی ریاست پر حملہ کر کے وہاں بھی تسلط قائم کرنا چاہا مگر وہاں کی حکمران ”رائی درگاوتی“ کے ہاتھوں برمی طرح مات کھائی۔

باز بہادر نہ صرف ایک جنگجو حکمران تھا بلکہ اپنے دور کا موسیقی کا عظیم پرستار بھی گردانا جاتا تھا۔ دوسری طرف روپ متی ایک مایہ ناز گلوکارہ، شاعرہ اور موسیقار تھی۔ وہ دھرم پور کی ایک ہندو شہزادی تھی۔ ایک دن باز بہادر کا شکار کی غرض سے دریائے نرمدا کی وادی سے گزر ہوا، وہ ایک ہرن کا پیچھا کر رہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں ایک نہایت ہی سُر پیلی آواز گونجی۔ لہذا اس نے ہرن کا تعاقب چھوڑ کر اس آواز کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ جب قریب پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک انتہائی حسین و شیرازہ ایک تین کے ذریعے اپنی مستی میں سڑوں کے رنگ کبھی رہی تھی۔ وہ اس کے پُرکشش حسن اور سحر آگین

جیون ساتھی بنا دے۔ جادو رائے نے بخوشی رضا مندی ظاہر کر دی۔ تاریخ کے مطابق ہاز بہادر مسلمان اور روپ متی ہندو تھے لہذا کہتے ہیں وہ اس لحاظ سے محل میں اس کی ساتھ بلور داشتہ تھی۔ مگر جب وہ محل میں داخل ہوئی تو محل کا گوشہ گوشہ اس کے استقبال کے لیے جگمگا اٹھا۔ ہاز بہادر کی اپنی محبت میں جنونی کیفیت کا تو یہ عالم تھا کہ دنیا و مافیہ سے قطعی لاپرواہ ہو کر اس کے قرب میں شب و روز گزارنے لگا۔ حکومت کے تمام امور اپنے وزراء کے سپرد کر دیئے۔

امور سلطنت سے بے توجہی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس دوران کچھ واقعات ظہور پذیر ہونے لگے جن میں مغل شہنشاہ ہمایوں کی بھارت آمد، اس کی وفات اور پھر اس کے بیٹے اکبر بہ لقب مغل اعظم تخت نشین ہونا وغیرہ شامل ہیں۔

جب مانڈو میں مغل اعظم اکبر کی متحد فتوحات کی اطلاع پہنچی تو روپ متی نے اپنے دیوانے محبوب

کی کافی گہری دوستی تھی۔ ایک دن جادو رائے نے اپنے دوست کو اپنے گھر ایک پر تکلف دعوت پر مدعو کیا۔

کہتے ہیں کہ تقریب میں شہزادے کی نگاہ اس کی بیٹی روپ متی پر پڑی۔ بائزید نے اس کے حسن و جمال کے چرچے اپنے ایک ساتھی سے پہلے بھی سُن رکھے تھے۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ مگر مذہبی عقادت کے باعث والد سے قطعی اظہار کی جسارت نہ ہوئی۔ ادھر یہ کیفیت روپ متی میں پیدا ہو چکی تھی اور وہاں بھی اظہار میں یہی مذہبی رکاوٹ عیاں تھی۔ دونوں کی محبت خاموشی کا لبادہ اوڑھے رہی۔

والد کے انتقال کے بعد بائزید مالوہ کا حکمران بن گیا اور شاہی لقب ”ہاز بہادر“ رکھا گیا۔ اس نے ایک روز جادو رائے کو اپنے دربار مانڈو نکالا اور سارنگ پور کا صوبہ اسے بطور خلعت دینے کی پیشکش کی مگر اس شرط پر کہ وہ اپنی بیٹی روپ متی کو اس کا

”حد امن فضل ربی“

ایک عالی شان پلازا کے سامنے شیطان کھڑا زار و قطار رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ انسان بہت احسان فراموش مخلوق ہے۔ ایک راہ گیر نے شیطان کو آہ و زاری کرتے اور انسان کو برا بھلا کہتے دیکھا تو وہ رک گیا اور اس نے شیطان سے اس کی وجہ پوچھی۔ شیطان نے کہا۔ ”کروڑوں روپے مالیت کا یہ پلازا دیکھ رہے ہو؟“ حامی خدا بخش نے یہ پلازا میرے مشوروں پر محل کے نتیجے میں حاصل شدہ سرمائے سے تعمیر کیا مگر جب یہ پلازا مکمل ہو گیا تو میرا شکر ادا کرنے کی بجائے اس کی پیشانی پر مونے لفظوں میں ”حد امن فضل ربی“ لکھوا لیا۔

راہ گیر نے ”حد امن فضل ربی“ پر ایک نگاہ ڈالی ہا آواز بلند پڑھا اور آگے چل دیا۔

(تحریر: خطاء الحق قاسمی۔ مرسلا: زاہد علی خان۔ سوات)

اس بدعتی کا علم ہوا تو وہ ایک پھول بیچنے والی کا بھیس بدل کر محل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ ادم خان کو اس کے محل سے بھاگ جانے کا تین دن بعد پتہ چلا۔ اس نے فوج کا ایک دستہ اسے گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیا۔ روپ متی کافی دشواریوں سے گزرنے کے بعد اپنے بھائیوں کے پاس حفاظت اور مدد کے لیے آگئی۔ کیونکہ والد کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا اور والدہ نے اپنے ہی دیور سے شادی رچا لی تھی۔ ادم خان کے سپاہیوں نے دھاوا بول کر اس کے سارے بھائیوں کو قتل کر دیا اور روپ متی کو گرفتار کر کے واپس لے آئے۔ اسے یقین ہو گیا کہ بھائیوں کے ساتھ ساتھ شائد اس کے محبوب باز بہادر کو بھی قتل کر دیا گیا ہو گا کیونکہ اب تک اس کے بارے میں بھی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ کرب و الم کی اس کیفیت میں کہے گئے اس کے کچھ دردناک اشعار اب بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔

جب اس نے محسوس کر لیا کہ اب ادم خان سے نجات کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا، نہ عزیز و اقارب اور نہ ہی اس کا محبوب ساتھی تو اس نے ادم خان کے مسلسل دباؤ پر تین روز بعد اس سے شادی کا وعدہ کر لیا۔

اسے یہ کہہ کر یقین دلایا کہ ان تمام میں اس کے سوگ اور غم کی کیفیت کچھ کم ہو جائے گی۔ ادم خان اس کی یوں رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے خوشی سے جھوم اٹھا اور محل میں جشن کا اہتمام شروع کر دیا۔ روپ متی نے محسوس کیا کہ

باز بہادر کو مشورہ دیا کہ وہ سرمستی کی کیفیت سے باہر نکلے اور حکومت کی ہاگ ڈور پر اپنی گرفت مضبوط کرے۔ چنانچہ جب اکبر نے مالوہ پر حملہ کیا تو باز بہادر مقابلے کے لیے میدان میں اتر آئے۔ جلد ہی واپس ماٹو لوٹا پڑا کیونکہ پیچھے بہرام خان نے بغاوت شروع کر دی تھی۔

اکبر نے اپنے ایک جرنیل ادم خان کو کا (اکبر کا سوتلا بھائی) اور میر محمد کو مالوہ فتح کرنے کے لیے بھاری فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ باز بہادر نے ان کے حملے کو پسپا کرنے کی خاطر سارنگ پور کا رخ کیا۔ گھسان کی جنگ ہوئی مگر اسے بُری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ باز بہادر اپنی جان بچانے کے لیے خانہ لٹھ کی جانب بھاگ گیا۔

اس کی ہار اور ردپائی کے نتیجے میں ادم خان نے اس کی تمام جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ حتیٰ کہ محل کی تمام خواتین اور لڑکیاں بھی اسیر کر لیں۔ روپ متی کے صن و جمال کو دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس قدر حسین چہرہ اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ پہلے تو اس نے باز بہادر کی اس سے بے وفائی کا طعنہ دیا اور پھر اپنے حرم کی ملکہ بنانے کی پیشکش کی۔ روپ متی نے اس کا یہ ارادہ بھانپ کر اسے سختی سے جھڑپائی کہ ایک قانع کو یہ زینا نہیں دیتا کہ وہ ایک شکست خوردہ افغان کی عزت و ناموس کی یوں تذلیل کرے ورنہ بھی محل اس کے لیے روزِ شرمندگی کا باعث ہوگا۔

روپ متی کا یہ ردِ عمل دیکھ کر اس نے اس پر جبر آزمانے کا ارادہ کیا۔ محل کے ایک خواجہ سرا کے ذریعے جب روپ متی کو ادم خان کی



سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور ایمان افروز فخریہ پیشکش



شائع ہو گیا ہے

URDU TO BE
خلفائے راشدین نمبر کی چھ نمایاں خصوصیات

- - خلفائے راشدین کے عشق رسول کے حوالے سے ایمان افروز واقعات۔
 - - خلفائے راشدین کی ذاتی اور گھمبیلو زندگی کی مکمل تصویر۔
 - - اسلام کی سر بلندی کے لیے ان کی بے مثال قربانیوں کے تذکرے۔
 - - حضور پاکؐ اور خلفائے راشدین کے حوالے سے دلچسپ روایات۔
 - - خلفائے راشدین نگاہِ ملت میں۔
- اس علاوہ خلفائے راشدین کے دور خلافت کے معاشی، سماجی، تعلیمی نظام اور ان کے عسکری کارناموں کا تفصیلی احوال۔

۵۰۰ صفحات پر مشتمل سفید کاغذ، عمدہ کثابت اور دیدہ زیب سرخ و قہر کے ساتھ خلفائے راشدین نمبر، منظر عام پر آگیا ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن لاہور میں

Faithfulness."

اس کہانی کے مطابق باز بہادر، خاندیش جا کر روپوش ہو گیا مگر بد قسمتی سے ایک بار اکبر (مغل اعظم) کے ہاتھوں شکست اور پھر ایک بار فوج ضرور ملی۔ شکست کھا کر وہ دوبارہ بھاگا مگر 1570ء میں مغل سپاہیوں کے ہاتھوں اسیر ہوا اور مجبوراً اسی شخص کی حکمرانی میں اسیر رہا یعنی ادم خان جس کی وجہ سے اس کی محبوبہ کی بربادی انجام پذیر ہوئی۔ کہتے ہیں کہ باز بہادر نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ اسے بھی روپ متی کے نزدیک دفن کیا جائے۔

اس دوران باز بہادر پر روپ متی کی جدائی اور اپنے احساسِ جرم یا بے وفائی کی اصل صورت کیا تھی؟ تاریخ اس پر خاموش ہے۔

چنانچہ آج بھی ان دونوں کے حواشات اگرچہ کنڈرات کی صورت سارنگ پور میں موجود ہیں اور آج بھی وہاں یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ جب کوئی شخص ”روپ متی“ کے حزار پر اس کا نام لے کر اسے پکارتا ہے تو بازگشت میں اسے ”باز بہادر“ کی آواز سنائی دیتی ہے۔

بلاشبہ ان دو محبت کرنے والوں کی یہ بھی تاریخی داستان محبت کی اصل غایت کو دنیاوی رسوم و تقود اور پابندیوں سے بالاتر گردانتی ہے۔ جوں طیل جبران: ”حسن کی بھی ایک الگ زبان ہوتی ہے جو لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ ایک غیر فانی زبان ہے اور دنیا کا ہر انسان اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔“

باز بہادر سے محروم ہو چکی ہوں تو اب زندہ رہنے کا کیا مقصد رہ گیا۔ لہذا اس رات وہ اٹھی اور دلہن والا عروسی لباس زیب تن کیا جو شادی کے وقت باز بہادر نے اسے پیش کیا تھا۔ پھر اچھائی ماپوسی کی کیفیت میں اس نے اپنی بین اٹھائی اور دیر تک قوطیت اور فرات کے نئے لاپتی رہی۔ پھر وہ عروسی کرے میں مٹی اور پاؤ ڈر شدہ میرے کاہر طلق میں اُتار لیا۔

دوسری صبح جب ادم خان اس کے عروسی حجرے میں داخل ہوا تو اسے سوتا ہوا پایا۔ اس نے روپ متی کا ہاتھ تمام کر اسے بیدار کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو دوسرے جہان سدھار چکی تھی۔ چنانچہ اسے جمیل کے قریب سارنگ پور ایک حزار بنا کر دفن دیا گیا۔

جہاں تک باز بہادر کی روپ متی سے محبت اور پھر اطلاع دیئے بغیر فرار ہونے کا قصہ ہے تو اس پر ہندو مورخین اور تبصرہ نگاروں نے باز بہادر کو بزدل اور بے وفا گردانا ہے مگر مجھے کافی کھوج کے بعد اس رومانوی کہانی کی سچائی کا اصل مفہوم احمد اعلیٰ عیسوی طوطمان کی روپ متی کی کہانی سے ملا ہے جو اس نے 1599ء میں تحریر کی۔ یعنی روپ متی اور باز بہادر کے انجام کے اٹھائیس (28) سال بعد۔ پھر یہ کہانی مختلف ہاتھوں سے گزر کر 1926ء میں ایک انکس دانشوری۔ ایم۔ کرمپ (C.M. Crump) کے ہاتھوں آکسفورڈ پریس میں انگریزی میں درج ذیل عنوان سے ترجمہ ہوئی۔

"The Lady of the Lotus:

Roop Mati Queen of Mandu.

A Strange Tale of



URDU TUBE

حضرت مالک بن دینارؒ

پروفیسر غلام رسول

آپؑ اللہ کی ان برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگی یاد الہی اور مخلوق خدا کی بہتری میں صرف کردی!

پہلے کہہ دیا ہوتا تاکہ میں سفر کے لئے کوئی اور وسیلہ تلاش کرتا۔ بزرگ کی بات سن کر کشتی کا مالک سخت بدتمیزی اور بدگلائی پر اتر آیا۔ اس نے اللہ کے اس نیک اور عاجز بندے کو اس قدر مارا کہ اس پر غشی طاری ہو گئی۔ کشتی والا کوئی بہت ہی ظالم اور سنگ دل

ایک مرتبہ کوئی بزرگ کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ جب کشتی مین منہ حار میں پہنچ گئی تو طلاح نے ان بزرگ سے کراہے طلب کیا۔ بزرگ نے فرمایا کہ میرے پاس تو تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے اگر ایسی ہی بات تھی تو مجھے کشتی میں سوار کرنے سے

مجھے اس مسجد کا متولی بنا دیا جائے۔ چنانچہ دل میں یہ نیت رکھ کر آپؐ نے اس مسجد میں اس قدر نمازیں پڑھیں اور اتنے زیادہ احکاف کئے کہ جن کا کسی طور بھی شمار ممکن نہیں مگر اس عبادت و ریاضت کے باوجود مسجد میں آنے والے دوسرے نمازیوں نے کبھی آپؐ پر توجہ نہ دی۔ آپؐ مسلسل ایک سال تک اس مسجد میں پوری یکسوئی سے نمازیں پڑھتے رہے۔ ٹھیک ایک سال گزر جانے کے بعد جب آپؐ مسجد سے باہر برآمد ہوئے تو غیب سے یہ آواز آئی کہ اے مالک بن دینار تجھے اب نائب ہو جانا چاہئے۔ یہ سنتے ہی آپؐ کو قلبی طور پر سخت صدمہ ہوا کیونکہ غیب سے عدا آنے کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ مسلسل ایک سال تک خود غرضانہ عبادت میں مصروف رہے تھے جس پر اب آپؐ بجا طور پر شرمندگی اور عذارت محسوس کر رہے تھے۔

چنانچہ مالک بن دینارؓ کے دل کو یہ بات ایسی لگی کہ انہوں نے ایک رات اپنے قلب کو ہر قسم کی ریا اور خود غرضی کے جذبے سے پاک کر کے خلوص نیت سے عبادت کی اور اگلی صبح جب وہ مسجد کے دروازے پر تشریف لائے تو انہوں نے وہاں ایک بہت بڑے جھوم کوکڑے پایا۔ یہ لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ مسجد کا نظام ٹھیک طریقے پر استوار نہیں ہے اس میں بہت سی بے ضابطگیاں اور بے قاعدگیاں ہیں لہذا مناسب ہوگا کہ مسجد کے نظام کو چلانے کے لئے اسی شخص کو متولی بنا دیا جائے جو مسلسل ایک سال سے اس مسجد میں ذکر الہی میں پوری یکسوئی کے ساتھ مصروف ہے۔ چنانچہ یہ تمام لوگ اکٹھے ہو کر آپؐ کے پاس پہنچے اور جب آپؐ نماز سے فارغ ہو چکے تو لوگوں نے عرض کیا کہ ہم

انسان معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جب بزرگ کی فحشی و در ہوئی تو اس نے بزرگ سے دوبارہ کرایہ طلب کرتے ہوئے کہا کہ اگر تم نے کشتی میں سفر کرنے کا معاوضہ ادا نہ کیا تو میں تمہیں دریا کی طوفانی موجوں کے سپرد کر دوں گا۔ ابھی اس صلاح نے اپنی بات بھی مکمل نہ کی تھی کہ اچانک کچھ مچھلیاں منہ میں ایک ایک دینار دے پانی کے اوپر کشتی کے پاس آئیں اور ان بزرگ نے ایک مچھلی کے منہ سے دینار لے کر کرایہ ادا کر دیا۔ ادھر ملا یہ ساری صورتحال دیکھ کر قمر قرظ کا پٹنہ لگا اور فوراً آپؐ کے قدموں میں گر کر معافی طلب کرنے لگا۔ مگر یہ بزرگ کشتی میں سے دریا پر اتر گئے اور پانی پر چلتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اللہ کے اس نیک صاحب کرامت بزرگ کا نام حضرت مالک بن دینارؓ تھا۔ آپؐ کے نام کے ساتھ لفظ دینار لگنے کی وجہ تسمیہ بھی یہی تھی۔

حضرت مالک بن دینارؓ خواجہ حسن بھریؒ کے ہم عصر تھے اور ان کا شمار دینی پیشواؤں میں ہوتا تھا۔ آپؐ کی پیدائش اپنے والد محترم کے دور غلامی میں ہوئی اگرچہ ظاہری طور پر آپؐ غلام زادے ہیں لیکن باطنی طور پر آپؐ فیوض و برکات کا سرچشمہ ہیں اور آپؐ کا شمار باہتمام صاحب کرامت و صاحب ریاضت میں ہوتا ہے۔

شکل و صورت کے اعتبار سے مالک بن دینارؓ انتہائی حسین و جمیل تھے۔ دمشق میں سکونت پذیر ہونے کی وجہ سے آپؐ حضرت امیر معاویہؓ کی مسجد میں احکاف کیا کرتے تھے۔ ایک روز عبادت کے دوران اچانک آپؐ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش کچھ اس قسم کے حالات پیدا ہو جائیں کہ

باہمی اور متفقہ فیصلے سے آپؐ کو مسجد کا متولی بنانا چاہتے ہیں۔

یہ سنتے ہی مالک بن دینارؓ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ اے میرا! میں ایک سال تک محض اس لئے ریاکارانہ اور خود غرضی کی عبادت میں مصروف رہا کہ مجھے مسجد کی تولیت حاصل ہو جائے مگر ایسا نہ ہوا لیکن اب جبکہ میں صدق دل سے تیری عبادت میں مشغول ہو گیا ہوں تو تیرے حکم سے تیرے بندے مجھے اس مسجد کا متولی بنانے آ پہنچے ہیں اور مجھ پر یہ بھاری ذمہ داری ڈالنا چاہتے ہیں لیکن اے خدا میں تیری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب نہ تو میں تولیت قبول کروں گا اور نہ ہی تیرے اس پاک گھر سے باہر قدم رکھوں گا۔ یہ عہد کرنے کے بعد آپؐ دوبارہ عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے۔

بحیثیت ایک انسان کے حضرت مالک بن دینارؓ کو اپنی کمزوریوں خامیوں اور کوتاہیوں کا بھی پورا احساس تھا۔ آپؐ کے بارے میں کوئی شخص اچھا یا بُرا جو کچھ بھی کہتا آپؐ اسے انتہائی صبر و تحمل سے سنتے اور کئی کئی روز تک اس بات کو غفل کی کوئی پر رکھ کر پرکھتے۔ مثلاً ایک مرتبہ جب کسی عورت نے آپؐ کو ریاکار کے نام سے آواز دی تو حضرت مالک بن دینارؓ نے فرمایا کہ کسی نے بیس سال سے مجھے میرے اصلی نام سے نہیں پکارا تھا لیکن اے خاتون! آفرین ہے تجھ پر کہ تو نے مجھے پہچان لیا کہ میں کون ہوں۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ جب میں نے مخلوق کو اچھی طرح سے پہچان لیا تو مجھے اس کی قطعاً خواہش نہ رہی کہ کوئی مجھے بد کہے یا نیک کہے کیونکہ میں نے ہر اچھا کہنے والے یا بُرا کہنے والے کو مبالغہ آرائی کرتے ہوئے پایا ہے لہذا لوگ مجھے نیک کہیں یا بد

کہیں میں روزِ حشر کی سے بدلہ نہیں لوں گا۔ خود شناسی کے ساتھ ساتھ آپؐ میں لوگوں کو پرکھتے اور ان کے باطن کو بھی سمجھنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ مثلاً ایک مرتبہ حضرت مالک بن دینارؓ مریض کی حراجِ پرسی کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر جب آپؐ نے دیکھا کہ مریض قریب المرگ ہے اور زندگی کے آخری سانس گن رہا ہے تو آپؐ نے اسے کلمہ پڑھنے کی تلقین فرمائی لیکن جب وہ کلمہ پڑھنے کے بجائے بار بار دس اور گیارہ کہتا رہا تو آپؐ نے اس کا سبب دریافت کیا۔ آپؐ نے جب ایک مرتبہ پھر کلمہ پڑھنے کے لئے کہا تو مریض نے قناعت کے عالم میں بتایا کہ جب وہ کلمہ پڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے سامنے آگ کا پہاڑ آ جاتا ہے اور آگ کے شعلے اس کی جانب لپکتے ہیں۔ حضرت مالک بن دینارؓ نے مریض کے پاس کھڑے دوسرے لوگوں سے پوچھا کیا یہ شخص سود کا کاروبار کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا اعلیٰ حضرت یہ تو بالکل سچ ہے لیکن آپؐ نے کیسے جانا؟ اس پر حضرت مالک بن دینارؓ نے فرمایا کہ جس شخص کو دم آخر دشواری نظر آئے تو سمجھ لو کہ وہ کم تو لے والا اور سود کھانے والوں میں سے تھا۔

بعض اوقات سیدھے سادے اعزاز میں آپؐ اس قدر گہری اور معرفت کی بات کہہ جاتے تھے کہ آپؐ کے معتقدین اور اہل مجلس و طیرہ حیرت میں پڑ جایا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ بصرہ شہر میں کسی مقام پر آگ لگ گئی اور غلّی خدا پیچ و پکار کرنے لگی۔ حضرت مالک بن دینارؓ جب اپنا عصا لے کر محبت پر چڑھے تو لوگوں کو بہت زیادہ مصیبت میں دیکھا۔ کچھ تو آگ میں جل رہے تھے اور کچھ کود

مسجد میں کوئی یہودی داخل ہو گیا ہے۔ لڑکے کا باپ یہ سنتے ہی ڈٹ اے کر مسجد کی طرف دوڑا لیکن آپؐ کو شناخت کر کے انتہائی محضرت خواہ ہوا اور کہنے لگا اعلیٰ حضرت بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے محلے میں دن کے وقت ماسوائے یہودیوں کے کوئی کچھ نہیں کھاتا اور سب لوگ روزہ رکھتے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ لڑکے کو آپؐ کے یہودی ہونے کا شبہ ہوا لہذا میں آپؐ سے التجا کرتا ہوں کہ آپؐ اس کی خطا معاف فرمادیں۔ اس آدمی کی بات سن کر آپؐ نے عالم جوش میں فرمایا کہ بچوں کی غیبی زبان ہوتی ہے وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔

پھر مالک بن دینارؒ نے اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا اے دو جہانوں کے مالک! تُو نے مجھے بغیر کھجور کھائے ہی یہودیوں میں شامل کر دیا اور اگر میں کہیں بھولے سے کھجور کھا لیتا تو کون جانتا ہے کہ میرا انجام کفار سے بھی بُرا اور بدتر ہوتا۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت مالک بن دینارؒ نے کھجور کو کبھی چھونے کی خواہش بھی نہ کی۔

آپؐ لوگوں کو ہمیشہ نیکیوں اور پرہیزگاروں کی محبت میں بیٹھنے کی تلقین کرتے تھے۔ ایک روز آپؐ نے اہل مجلس سے فرمایا کہ جس شخص سے قیامت کے روز کوئی فائدہ حاصل نہ ہو اس کی محبت میں بیٹھنا فضول ہے۔ دینی دنیا تو یہ محض ایک خوبصورت دھوکہ ہے جو کہ بڑے بڑے عالموں اور دین داروں کو بھی فریب و دگر سے اپنا تال بٹا لیتی ہے۔ آپؐ نے مزید فرمایا کہ جو شخص لغو باتیں زیادہ اور عبادت کم کرتا ہے اس کا علم قلیل قلب اندھا اور عمر ریگناں جاتی ہے کیونکہ میرے نزدیک اخلاص سے بہتر کوئی دوسرا عمل نہیں ہے۔

کر باہر نکلنے کی کوشش میں معروف تھے۔ اسی طرح بعض افراد آگ میں سے اپنا مال و اسباب نکالنے کی فکر میں تھے۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے فرمایا کہ ہلکے پھلکے لوگ تو نجات پا گئے مگر ہماری بھر کم لوگ ہلاک کر دیئے گئے اور روز محشر بھی یہی منظر دیکھنے کو ملے گا۔

حضرت مالک بن دینارؒ کا نظریہ یہ تھا کہ نفس کے خلاف جہاد کرنا انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل ہے۔ اور جو شخص نفس پر قابو پانے پر قادر ہے تو سمجھ لو کہ اس نے اپنی آخرت کے لئے بہتر سامان کر لیا۔ روایت ہے کہ آپؐ نے بصرہ میں چالیس سالہ قیام کے دوران کبھی ایک کھجور بھی نہیں کھائی تھی۔ آپؐ لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ کھجور نہ کھانے سے نہ تو میرا پیٹ کم ہو گیا ہے اور نہ ہی تمہارا پیٹ بڑھ گیا ہے لیکن چالیس سال بعد ایک مرتبہ جب آپؐ کے دل میں کھجور کھانے کی خواہش شدت اختیار کر گئی تو آپؐ نے نفس سے فرمایا کہ میں تمہاری اس خواہش کی تکمیل کبھی بھی نہ کر پاؤں گا لیکن جب آپؐ کو خواب کی حالت میں غیب سے کھجور کھانے کا اشارہ ہوا اور یہ فرمایا گیا کہ نفس پر سے باندی ختم کر دو جب آپؐ نے بیداری کے بعد اپنے نفس سے کہا کہ میں اس شرط پر تمہاری یہ خواہش پوری کروں گا کہ تمہیں سات روز تک مسلسل روزے رکھنا ہوں گے۔ چنانچہ روایت ہے کہ مالک بن دینارؒ نے نفس کشی کی نیت سے ایک ہفتے کے لئے روزے رکھے۔ اس کے بعد آپؐ نے بازار سے کچھ کھجوریں خریدیں اور مسجد شریف لے گئے۔ ابھی آپؐ کھجوریں کھانے کا ارادہ ہی فرما رہے تھے کہ ایک لڑکے نے اپنے باپ کو آواز دے کر کہا بابا

آپ سے تحریریں طلب کرتا ہے

سیارہ ڈائجسٹ

اور آپ کو صلاحیتوں کے اظہار کے بھرپور مواقع فراہم کرتا ہے

کیا آپ زندگی میں کبھی عجیب و غریب واقعات سے دوچار ہوئے ہیں؟

کیا آپ نے کہیں کوئی دلچسپ بات پڑھی ہے؟

کیا آپ یا آپ کے کسی واقف کار کے ساتھ کچھ ان ہونے واقعات گزرے ہیں؟

زیادہ سے زیادہ دو ہزار الفاظ میں ہمیں لکھ بھیجئے، ہم اسے آپ کی تصویر اور

تعارف کے ساتھ شائع کریں گے

کوئی دلچسپ کہانی جو پڑھنے والوں پر تاثر چھوڑ جائے

اسلامی تاریخی پس منظر میں لکھی جانے والی کہانی

انگریزی یا کسی اور غیر ملکی زبان سے ترجمہ شدہ کہانی

شرائط

- 1- کاغذ کے ایک طرف لکھئے۔
- 2- کھلا اور صاف سُٹھرا لکھئے۔
- 3- بہتر ہے ٹائپ کروالیجئے۔
- 4- اقتباس یا تلخیص کی صورت میں اصل حوالے یا کتاب کا نام مع مصنف لکھئے۔
- 5- کہانی کے اختتام پر اپنا نام پتا لکھنا نہ بھولئے۔
- 6- مختصر تعارف اور پاسپورٹ سائز تصویر مسودہ کے ساتھ منسلک کریں۔
- 7- مسودہ واپس چاہیے ہو تو جوابی لفافہ ساتھ بھیجئے۔

نفس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، اے نفس میں تجھے کسی معاصت کی وجہ سے اذیت نہیں دیتا بلکہ تجھ کو صبر کا مقام دلوانے کے لئے ایسا کرتا ہوں تاکہ اس کے بدلے میں تمہیں لازوال نعمت حاصل ہو جائے۔ حضرت مالک بن دینارؒ نے ایک مرتبہ حاضرین محفل سے فرمایا، یہ مثل میرے لئے ناقابل فہم ہے کہ جو شخص چالیس دن تک گوشت نہیں کھاتا اس کی عقل کمزور پڑ جاتی ہے جبکہ میں نے بیس سال تک گوشت نہیں چکھا لیکن اس کے باوجود میری عقل میں کمی آنے کے بجائے اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ شدید بیماری کے بعد جب آپؐ صحت یاب ہوئے تو کسی ضرورت کے تحت انتہائی مشکل سے گرتے پڑتے بازار تشریف لے گئے۔ محسن اتفاق سے اس وقت سامنے سے بادشاہ سلامت کی سواری آمدی تھی۔ سواری کو راستہ دلوانے کے لئے پہریداروں نے لوگوں کو ادھر ادھر ہٹانے کے لئے ایک شور بلند کیا۔ حضرت مالک بن دینارؒ اس قدر کمزوری محسوس کر رہے تھے کہ انہیں راستے سے ہٹنے میں تھوڑی سی تاخیر ہو گئی۔ چنانچہ ایک پہریدار نے آپؐ کو اس زور سے کوزا مارا کہ تکلیف کی حالت میں آپؐ کے منہ سے اس پہریدار کے بارے میں یہ کلمہ نکل گیا کہ خدا کرے تیرے ہاتھ کٹوا دیئے جائیں۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ چند ہی روز بعد کسی جرم کی پاداش میں اس پہریدار کے ہاتھ کٹوا دیئے گئے تاہم آپؐ کو اس کی یہ حالت دیکھ کر انتہائی قلق ہوا اور آپؐ نے دل میں کہا کہ کاش کرب کی حالت میں میرے منہ سے پہریدار کے بارے میں یہ کلمہ نہ نکلا ہوتا۔

حضرت مالک بن دینارؒ کے بارے میں کسی بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ آپؐ کو اور حضرت محمد واسعؒ کو بہشت کی جانب لے جایا جا رہا ہے۔ اس بزرگ کے دل میں خیال آیا کہ دیکھیں بھلا مالک بن دینارؒ جنت میں پہلے پہنچتے ہیں یا محمد واسعؒ۔ چنانچہ یہ دیکھ کر کہ مالک بن دینارؒ کو محمد واسعؒ سے پہلے جنت میں داخل کیا گیا ہے بزرگ نے ملائکہ سے دریافت کیا کہ محمد واسعؒ تو مالک بن دینارؒ سے زیادہ عامل و کامل تھے مگر اس کے باوجود مالک بن دینارؒ کو جنت میں ان سے پہلے داخل کیا گیا آخر اس کی کیا منطق ہے۔ اس پر ملائکہ نے بزرگ کو جواب دیا کہ تم صحیح کہتے ہو لیکن تمہیں شاید یہ علم نہیں کہ محمد واسعؒ کے پاس پہنچنے کے لئے دو لباس تھے جبکہ مالک بن دینارؒ کے پاس صرف ایک لباس تھا لہذا اسی لئے مالک بن دینارؒ کو بہشت میں پہلے داخل کیا گیا ہے کیونکہ ان میں محمد واسعؒ کی نسبت صبر و ضبط اور قناعت پسندی کا جذبہ زیادہ ہے۔

سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کرنا آپؐ کا خاصا تھا۔ پر تکلف پکوانوں کے بجائے آپؐ روٹی سوکھی روٹی کھا کر روزہ افطار کیا کرتے تھے لیکن ایک مرتبہ بیماری کے باعث جب آپؐ کو گوشت کھانے کی خواہش ہوئی تو آپؐ نے بازار جا کر کچھ گوشت خریدا اور گھر کی جانب روانہ ہو گئے مگر قصاب کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے ایک شخص اس غرض سے پیچھے پیچھا کہ جا کر دیکھو وہ گوشت کا کیا کرتے ہیں۔ ادھر مالک بن دینارؒ نے کچھ دور چل کر گوشت کو سونکھا اور پھر فرمایا کہ اے نفس سونگھنے سے زیادہ تیرا حصہ نہیں اور یہ کہہ کر انہوں نے وہ گوشت ایک فقیر کو دے دیا۔ حضرت مالک بن دینارؒ نے ایک بار پھر

حضرت عاتق بن ابی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ وہ نکاح کرنا چاہتی ہے۔

تم کس سے نکاح کرنے کی آرزو مند ہو؟ حضرت عاتق بن ابی نے پوچھا۔ اس پر لڑکی نے جواب دیا میری خواہش ہے کہ مالک بن دینار سے میرا نکاح ہو جائے کیونکہ وہ پرہیزگار دین دار اور ذکاوت میں معروف رہنے والے انسان ہیں۔ میں

آپ دنیا داری سے ہمیشہ دور رہے تھے۔ یہاں پر رنگینوں اور دلکشیوں کو دیکھ کر مالک بن دینار پر ایک قسم کا خوف طاری ہو جایا کرتا تھا۔ معقول ہے کہ بصرہ میں کوئی امیر آدمی انتقال کر گیا اور اس کی وسیع جائیداد اور مالی دولت کی وارث اس کی اکلوتی لڑکی تھی جو کہ انتہائی خوبصورت اور قیامت خیز شخصیت کی مالک تھی۔ ایک دن اس لڑکی نے

اخلاقی تربیت اور کردار سازی کی کمی

دل آزاری اور حق تلفی بعض اوقات ایسی نفرت اور حسد کو پیدا کرتی ہے کہ معاشرے میں یہ ایک نا سور بن کر ابھرتی ہے اور اپنی لپیٹ میں پورے معاشرے کو محسوس کر دیتی ہے۔ نایاب صرف توجہ اور محبت چاہتی تھی۔ احساس کمتری بھی اسی وقت جنم لیتی ہے جب نظر انداز کرنے والے بھی اپنے ہوں اور حق تلفی کرنے والے بھی۔ ہمارے گھروں میں نا انصافی اور حق تلفی عام ہو چکی ہے کیونکہ والدین بھی اولاد میں فرق رکھنے لگے ہیں۔ والدین خود ہی اپنے بچوں میں نفرت اور احساس کمتری پیدا کرتے ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ دنیا میں آدمی سے زیادہ کراہی اور کٹ اور کٹ و عارت اسی ایک وجہ سے ہوتے ہیں۔ نایاب ایک نفسیاتی مریض بن چکی ہے کیونکہ بچہ روئے اور اپنے ہی گھر میں بار بار دھکے کھاتا ہے۔ ہمارے زیادہ خوبصورت نہ ہونے کی وجہ سے بڑے عاتق سے لپکا جانا اس کے لیے اذیت ناک معمول بن چکا تھا۔ ہمارے معاشروں میں بیٹی خاص کر بڑی بیٹیوں کو عزت نہیں دی جاتی حالانکہ بیٹی تو رحمت ہوتی ہے اور حضور ﷺ نے بھی فرمایا کہ خوش نصیب ہے وہ عورت جس کی پہلی اولاد بیٹی ہو۔ دیسے تو ہر چیز میں ہم اسلام اور مذہب کو درمیان میں لے آتے ہیں لیکن بیٹیوں کے معاملے میں ہمارا مذہب جو کچھ کہتا ہے اس کو کیوں اپنایا نہیں جاتا۔ کیوں شکل و صورت اور رنگ کو ترجیح دی جاتی ہے، کیوں ایک بیٹی کو دوسری پر فوقیت دی جاتی ہے، کیوں کسی اولاد کو کچھ بھی نہیں اور کسی اولاد کو سارا پیار دے دیا جاتا ہے۔ آخر کیوں؟ کیوں گھروں میں بچوں کو بہنوں اور بیٹیوں کی عزت کرنا نہیں سکھائی جاتی، کیوں ہمارے معاشرے میں پڑھے لکھے اور اُن پڑھ دونوں طرح کے لوگ لڑتے وقت ماں، بہن اور بیٹی کی گالیاں دیتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے میں فنی اور دنیاوی تعلیمات کے ساتھ ساتھ قرآن کی تعلیم اور اخلاقی تربیت پر زور دیا جائے والدین کو چاہئے کہ وہ اپنی ساری اولاد کو ایک برابر سمجھیں کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دیں۔

(صدف ثار۔ لاہور)

ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ تو بادشاہ سے بھی زیادہ رحیم و کریم ہے۔ نوجوان کی یہ بات سن کر مالک بن دینار واپس لوٹ آئے لیکن چند ہی روز بعد جب لوگوں نے دوبارہ اس نوجوان کے مظالم کی شکایت کی تو آپؐ پھر اس نوجوان کو نصیحت کرنے تشریف لے گئے لیکن اتنے میں غیب سے عدا آئی کہ میرے دوست کو پریشان مت کرو۔

غیب کی یہ عدا سن کر حضرت مالک بن دینار حیرت زدہ رہ گئے اور انہوں نے اس نوجوان سے جا کر کہا کہ میں اس غیبی آواز کے متعلق تجھ سے پوچھنے آیا ہوں جو کہ میں نے راستے میں سنی ہے۔ نوجوان یہ سن کر خود بھی حیرت زدہ رہ گیا اور پھر ایک منہمک ارادے کے ساتھ پر عزم اعزاز میں کہنے لگا کہ اگر یہ بات ہے تو میں اپنی تمام دولت خدا کی راہ میں قربان کرتا ہوں۔ چنانچہ کچھ ہی دن بعد وہ نوجوان اپنا پورا اثاثہ خیرات کر کے نامعلوم سمت کی جانب روانہ ہو گیا۔ پھر ایک مرتبہ مالک بن دینار جب مکہ معظمہ پہنچے تو انہوں نے اس نوجوان کو وہاں انتہائی کمزور اور قریب المرگ حالت میں دیکھا جو اس وقت مسجدے میں پڑا کہ رہا تھا خدا نے مجھ کو اپنا دوست فرمایا ہے اس لئے میں بھی اس کے احکام پر اپنا تن من و دھن سب کچھ قربان کروں گا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کی رضا اور خوشنودی صرف عبادت سے ہی حاصل ہوتی ہے اور آج سے میں کوئی بھی ایسا کام کرنے سے بچی تو بہ کرتا ہوں جو اس کی تسلیم و رضا کے خلاف ہوگا۔ پھر حضرت مالک بن دینار نے دیکھا کہ اتنا کہنے کے بعد وہ نوجوان اسی وقت اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔

حضرت مالک بن دینار کے بارے میں ایک

ان سے اس لئے شادی کرنا چاہتی ہوں تاکہ دینی کاموں میں وہ میری معاونت کر سکیں۔

چنانچہ حضرت ثابت نبائی نے اس لڑکی کا پیغام مالک بن دینار تک پہنچا دیا۔ جس پر آپؐ نے فرمایا کہ میں تو دنیا کو طلاق دے چکا ہوں اور چونکہ عورت کا شمار بھی دنیا میں ہوتا ہے اس لئے طلاق شدہ (جسے طلاق دی ہو) عورت سے نکاح جائز نہیں ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اگر نظر کرم ہو جائے تو بڑے بڑے گنہگار اور پاپ کرنے والے بھی نیکوکار اور پرہیزگار بن جاتے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک بدمعاش قسم کا نوجوان حضرت مالک بن دینار کے پڑوس میں رہتا تھا اور شرفاء اس نوجوان کے ہاتھوں خاصے پریشان تھے چنانچہ ایک مرتبہ لوگوں نے آپؐ سے اس کے مظالم کی شکایت کی مگر آپؐ نے جب اس نوجوان کے پاس جا کر اسے نصیحت کی تو وہ آپؐ کے ساتھ خاصی گستاخی سے پیش آتے ہوئے بولا کہ میں حکومت کا آدمی ہوں اور کسی کو میرے کاموں میں دخل دینے کی قطعی ضرورت نہیں کیونکہ میں اپنے اچھے برے فعل کا خود ذمہ دار ہوں حضرت مالک بن دینار نے جب اس سے فرمایا کہ میں بادشاہ سے تیری شکایت کروں گا تو اس نے جواب دیا کہ بادشاہ بہت رحمدل اور نرم مزاج ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ میرے خلاف کسی کی بات سننا گوارا نہیں کرے گا۔

اگر بادشاہ نے تمہارے خلاف شکایت نہ سنی تو میں اللہ تعالیٰ سے تیری شکایت کروں گا۔ مالک بن دینار نے کہا۔

اس پر نوجوان نے غریب اعزاز میں مسکراتے

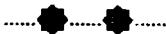
واقعہ مشہور ہے کہ کسی لمحہ سے آپؐ کا مناظرہ ہو گیا۔ آپؐ بھی اپنے موقف کو حق سے تعبیر کرتے رہے اور لمحہ بھی اپنے موقف کو درست ثابت کرنے پر حلا رہا۔ یہ صورت حال دیکھ کر لوگوں نے فیصلہ کیا کہ آپؐ کے اور اس لمحہ کے ہاتھ آگ میں ڈالا جائے لہذا جس کے ہاتھ آگ سے محفوظ رہیں گے اس کو حق ہی پر تصور کیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں میں سے کسی کے ہاتھ کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اس پر طے یہ پایا کہ لمحہ اور مالک بن دینار دونوں ہی حق ہی پر ہیں۔ مگر آپؐ اس صورت حال سے بہت افسردہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کرنے لگے کہ اے باری تعالیٰ میں نے پورے ستر سال تیری عبادت و ریاضت میں گزار دیئے مگر تو نے مجھے ایک لمحہ کے برابر قرار دیا۔ اس پر غیب سے آواز آئی کہ اے مالک تمہارے ہاتھ کی وجہ سے ایک لمحہ کا ہاتھ جلے گا کیونکہ تمہیں اس کی خوشی نہیں ہے اگر وہ تمہارا ہاتھ آگ میں ڈال دیتا تو بھی تیرا وہ جل جاتا۔

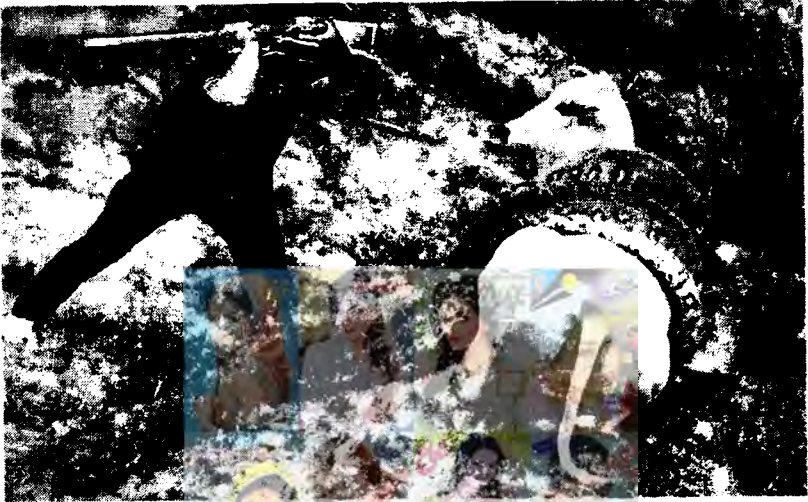
حضرت مالک بن دینار کی تعلیمات اور فرمودات آج کے دور میں بھی بسنے والے انسانوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ آپؐ ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے تھے اور ہر لمحے آپؐ پر خوف خدا طاری رہتا۔ آپؐ جب بھی ایسا کہ عبادت الایک تسعین قرأت کرتے تو مضطرب و بے قرار ہو کر رونے لگتے تھے۔ کسی نے جب آپؐ سے اس کا سبب پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ میں تیری عبادت کرتا ہوں اور تجھ سے ہی مانگا ہوں لیکن مجھے رونا اس بات پر آتا ہے کہ ہمارے اعمال اس قرآنی آیت کے بالکل برعکس

ہیں۔ ہم خدا سے مدد مانگنے کے بجائے اپنے نفس کے بچاری ہو چکے ہیں اور رحمت خداوندی کو چھوڑ کر دوسروں سے مدد و اعانت طلب کرتے ہیں۔

حضرت مالک بن دینار قہر الہی سے اس قدر خنجرہ رہے تھے کہ آپؐ رات کو زیادہ الہیمان کے ساتھ سو بھی نہ پاتے تھے۔ ایک روز آپؐ کی صاحبزادی نے کہا کہ آپؐ تھوڑی دیر آرام فرمایا کریں تو بہتر ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا اے دختر نیک! میرے نزدیک زیادہ سکون کے ساتھ نہ سونے کی دو وجوہات ہیں: اول یہ کہ میں قہر الہی سے ڈرتا ہوں اور دوم مجھے یہ اندیشہ رہتا ہے مبادا مجھے مہتا دیکھ کر سعادت کی دولت واپس لوٹ جائے۔ آپؐ کی عظمت و برتری کا اعجازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اس قدر عبادت و ریاضت کے باوجود آپؐ خود کو ایک خطا کار بندہ تصور کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے حاضرین مغل سے فرمایا کہ اگر مسجد کے دروازے پر کوئی یہ صدا لگائے کہ تمام لوگوں میں کم تر اور بدتر کون ہے تو اسے مجھ سے بدتر اور کوئی نہیں ملے گا۔

بلاشبہ یہی عاجزی اور انکساری ہی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی پہچان ہوتی ہے۔ حضرت مالک بن دینارؒ کی تمام زندگی بھی ایسی ہی صفات سے عبارت ہے۔ زندگی کے آخری لمحات میں جب کسی نے آپؐ سے عرض کیا کہ پیر و مرشد کوئی وصیت فرمائیں تو آپؐ نے فرمایا کہ تقدیر الہی پر راضی رہو تاکہ روز حشر تمہیں عذاب سے نجات مل سکے۔ حضرت مالک بن دینارؒ اللہ کی ان برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگی یاد الہی اور مخلوق خدا کی بھتری میں صرف کر دی۔





اڑوے کا شکار

URDU TUBE
جادید اقبال
A HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutube.com

اڑوے کو جال میں الجھا دیکھ کر ہم فاتحانہ انداز میں اسکی طرف بڑھے۔ اچانک اُس نے اپنے پچیلے بدن کو جھنجھوڑا جال کی دسیاں کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئیں۔ اڑوے نے ایک فلک شکاف، چمکناڑی اور ہماری طرف لپکا۔ ہم اس رفتار سے وہاں سے بھاگے کہ اگر یہ سویمنر روڈ کا مقابلہ ہوتا تو ہم گولڈ میڈل ضرور جیت لاتے۔

ایک موٹی بلا سے مقابلے کی کہانی جس نے لوگوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کر رکھا تھا

بندوق سے نشانہ لے کر لہلی دبا دی۔ شوں کی آواز کے ساتھ موٹی سوئی بھی گولی نکلی اور اڑوے کی کھال میں پیوست ہو گئی۔ اڑوے نے جبر جبری سی لی اور ہماری طرف دیکھا بے ہوشی کی گولی بے اثر ثابت ہوئی۔

وہ اڑوہا ایک بہت بڑے درخت کی موٹی سی شاخ پر لپٹا ہوا تھا، ہم اسے دم بخود دیکھ رہے تھے۔ پھر اڑوے نے اپنا خوفناک منہ کھول کر اگھڑائی کی ہمیں اس کے دہانے سے آگ کے شعلے نکلنے نظر آئے۔ ہمارے ایک ساتھی نے بے ہوش کرنے والی

سے بھاگے کہ اگر یہ سو میٹر دوڑ کا مقابلہ ہوتا تو ہر گولڈ میڈل ضرور جیت لاتے۔

اپنے کپ بچھ کر ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ یہ دیوہیل اڈھا پچھلے ایک مہینے میں دو زندہ انسانوں کو لٹک چکا تھا اس کے ڈر سے قریبی دیہات کے لوگ نکل مکانی کر گئے تھے۔ ضلعی حکام کے لئے یہ اڈھا درد سر بنا ہوا تھا۔ آخر حکومت کو اسے مارنے پر انعام کا اعلان کرنا پڑا۔ ہم نے چیخ کر قبول کیا اور پچھلے چار دنوں سے ہم اس اڈھے کی تلاش میں تھے۔ آج وہ ہمیں نظر آیا مگر اسے پکڑنے کے ہمارے دونوں حربے ناکام ہو گئے۔ ہم اس عظیم الشان اڈھے کو مارنا نہیں

اڈھا ایک دم سنے کی طرف مڑا اور نیچے کی طرف آنے لگا۔ ہمارے ساتھی نے ایک اور گولی چلائی مگر وہ اڈھے کی موٹی کھال سے رگڑ کھا کر نیچے زمین پر گر پڑی۔ درخت سے اتڑ کر اڈھا ہماری طرف بڑھا۔ یہ دیکھ کر ہم نے جلدی سے وہ جال اس پر پھینکا جو ہم اپنے ساتھ لائے تھے۔ اڈھا جال کی رسیدوں میں الجھتا چلا گیا۔ اڈھے کو جال میں الجھا دیکھ کر ہم فاتحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھے۔ اچانک اڈھے نے اپنے پچھلے بدن کو مجھوڑا جال کی رسیاں کچے دھاگے کی طرح نوٹ گئیں۔ اڈھے نے ایک ٹلک شکاف چننا ڈھاری اور ہماری طرف لپکا۔ ہم اس رفتار سے وہاں

URDU تہانہ

ایل ایل بی کی کلاس میں پروفیسر صاحب نے لیکچر کے دوران سوال کیا "قانون کی اصطلاح میں تہانہ کسے کہتے ہیں؟" سوال کا پوچھتا تھا، پوری کلاس مچھلی بازار کا سا پیش کرنے لگی۔ ہر طالب علم بڑھ چڑھ کر جواب دے رہا تھا مگر جواب سب ہی غلط تھے۔ بالآخر پروفیسر صاحب نے خود ہی جواب دیا "ایسی کوئی جگہ، عمارت یا مقام جسے صوبائی حکومت اپنے حکم نامے کے تحت تہانہ قرار دے وہ تہانہ کہلائے گی۔" اس پر ایک شریر طالب علم کھڑا ہوا اور بولا "اس تعریف کی روشنی میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ جگہ یا مقام جہاں شریف لوگ جانے سے کترائیں اور خوف کھائیں مگر جرائم پیشہ اور سماج دشمن عناصر کو وہاں کوئی خوف محسوس نہ ہو اور پولیس ان سے دوستانہ برتاؤ رکھے وہ تہانہ کہلائے گی۔" یہ ایک شوخ جواب سہی مگر اس میں پوشیدہ تلخ حقیقت کی صداقت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے۔ عام آدمی کے نزدیک تہانہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں حق و انصاف کا خون ہوتا ہے، شریفوں کی پگڑیاں اچھلتی ہیں، عزتوں کا ٹیلا مٹتا ہے۔ پاکستانی سماج میں تہانہ خوف و دہشت اور ظلم کی علامت ہے۔ اس موضوع پر لاتعداد کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ ان گنت فلمیں بھی بنائی جا چکی ہیں مگر کسی کہانی یا فلم میں تہانے یا پولیس کا مثبت پہلو شاید ہی کسی نے اُجاگر کیا ہو۔

(مدرسہ: عمران خالد، فیصل آباد)

آیا۔ اژدھے کے قریب آتے ہی بکرا دہشت سے دم سادھے پکڑا ہو گیا۔ اژدھے نے بچرے کے گرد ایک پکڑا کاٹا اور پھر کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے بکرے کے قریب پہنچ کر اسکی طرف منہ کر کے زور سے سانس کھینچا۔ بکرا گویا اڑتا ہوا اس کے غار نما منہ میں چلا گیا۔ اژدھا لپٹ کر بکرے کو ذمہ ہی نکلنے لگا۔ عین اسی وقت جھاڑیوں میں چھپے ہمارے ساتھیوں نے رسہ کھینچ کر بچرے کا دروازہ بند کر دیا اور رسہ ایک درخت کے موٹے سٹم کے گرد لپیٹ کر گرہ لگا دی۔ اژدھے نے خطرہ بھانپ کر بچرے سے لٹکا چاہا مگر خود کو چاروں طرف سے بند پا کر اپنی دم زور سے تھمائی۔ جھگ میں جیسے طوفان آگیا بچرہ زور زور سے لرزنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اژدھا بچرہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ہم تیزی سے درختوں سے اترے ایک ساتھی نے تاک کر بے ہوشی کی گولی ماری جو اژدھے کے کان کے قریب نرم جھک گئی۔ کچھ دیر تو اژدھے نے طوفان اٹھائے رکھا پھر وہ ڈھیلا پڑنے لگا۔ بے ہوشی کی گولی اثر دکھائی تھی۔ پھر اژدھا بے ہوش ہو کر گر پڑا تو ہم بچرے میں داخل ہو گئے اور موٹے رسوں سے بے ہوش اژدھے کو جکڑ لیا۔

دو تاروں بھری ایک دھمکتی شام تھی جب ہم اس اژدھے کو لئے شہر میں داخل ہوئے۔ سارا شہر اژدھے کو دیکھنے کیلئے اٹھا ہو گیا۔ بعد میں اژدھے کو بھاری قیمت پر ایک چڑیا گھرنے ہم سے خرید لیا اور ہم حکومت کی طرف سے اعلان کردہ انعام کے بھی حقدار ہوئے۔

چاہے تھے ہمارا ارادہ اسے زعمہ پکڑنے کا تھا مگر اس کی طاقت کا مظاہرہ دیکھ کر ہمارے حوصلے پست ہو گئے۔ دو دن اور منصوبہ بندی میں گزر گئے مگر اس عفریت کو قابو کرنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر ایک ساتھی کے ذہن میں یہ اچھوتا خیال آیا کہ کیوں نا اژدھے کو بچرے میں بند کر کے بے بس کر دیا جائے۔ اس خیال سے ہم سب نے اتفاق کیا۔ چنانچہ ہم واپس آئے اور ایک فولادی بچرہ تیار کرانے میں لگ گئے۔

ایک مہینے بعد ہم ایک ٹرک پر بچرہ لادے جھگ کے باہر اپنے کمپ پر پہنچ گئے۔ چارے کے طور پر ایک بکرے کا بندوبست بھی کر لیا گیا۔ اژدھے کے معمولات کا جائزہ لینے سے پتا چلا کہ وہ دن کا بیشتر حصہ سو کر گزارتا ہے اور رات کو شکار کے لئے نکلتا ہے۔ کچھ جھگ کی ایک غار اس کا مستقل ٹھکانا تھی۔ بڑی مشکل سے پتھرہ محروم بچرہ جھگ میں پہنچانے کے لئے تیار ہوئے وہ بھی ہماری معاونت پر۔ مضبوط رسوں کی مدد سے بچرہ کھینچ کر اژدھے کے ٹھکانے کے قریب پہنچا دیا گیا۔ ایک مضبوط رسہ اس کے فولادی کنڈے سے گزار کر ہمارے دو ساتھی جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ باقی قریبی درختوں پر ہتھیار لے کر بیٹھ گئے۔

ہم اژدھے کے غار سے نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی غار سے ایک خوفناک پتھار سنائی دی پھر گرد و غبار کے طوفان کے ساتھ اژدھا غار سے نکل آیا۔ اژدھے کو دیکھ کر بکرا ڈر کر رسہ تزانے کی کوشش کرنے لگا۔ بکرے کی آواز سے اژدھا بچرے کی طرف چلا

طلسم زادی

ایم اے راحت

(قسط: 15)

ایم اے راحت کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں پاکستان کے ناول نگاروں میں اُن کو جو مقام ملا وہ بہت کم لکھنے والوں کو مل سکا ہے۔ آج ایم اے راحت ہم میں موجود نہیں مگر اپنی تحریروں کے ذریعے وہ ہمیشہ پڑھنے والوں کے دلوں پر راج کرتے رہیں گے۔ اُن کا زیرِ نظر ناول ایسی دلچسپ اور مدقوں یاد رہنے والی تصنیف ہے جسے قارئین کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

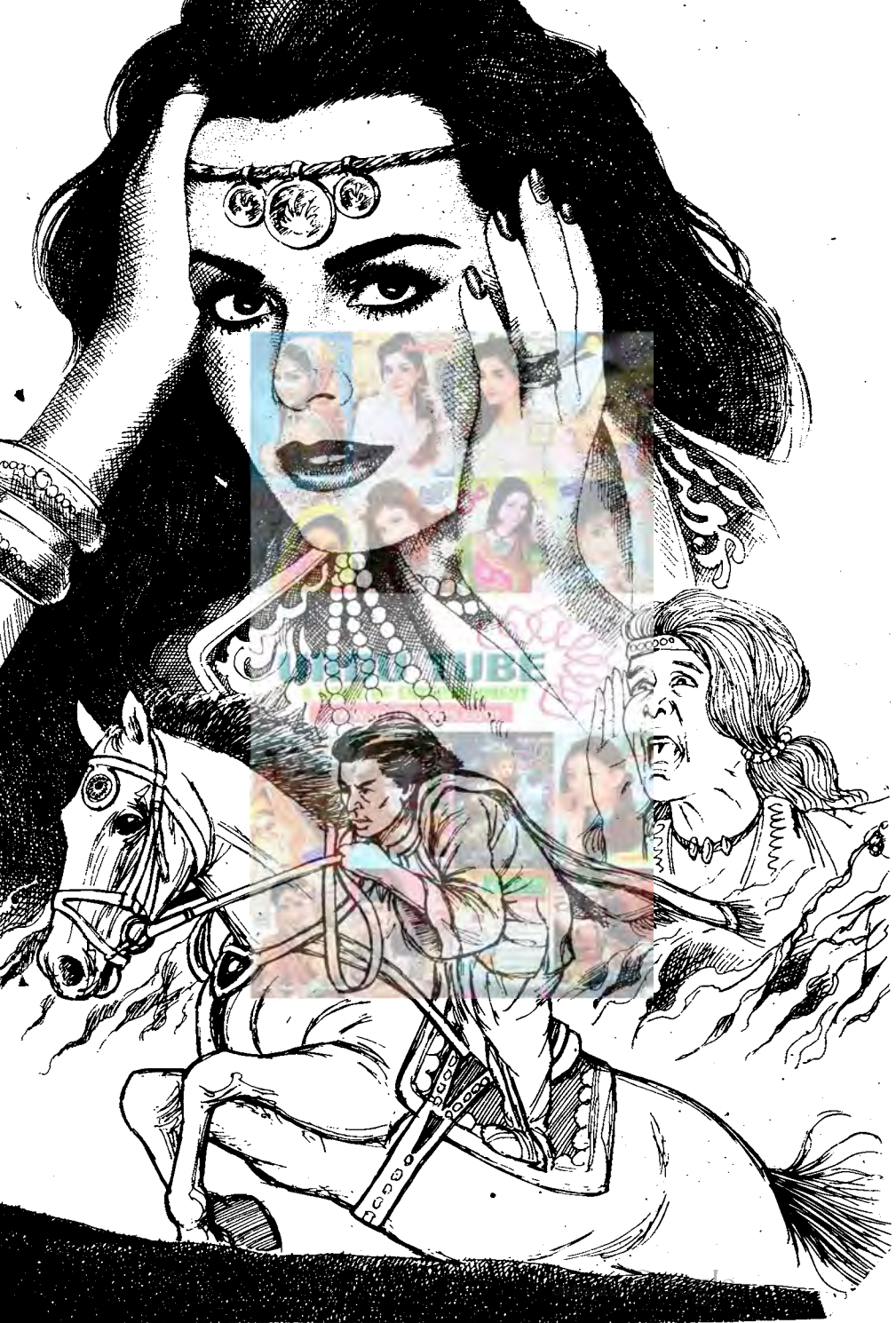
عقل و دانش سے پرے ایک ایسی دنیا ہے جس کا تصور ایک پراسرار خواب کی مانند ہے لیکن ہر داستان ایک ٹھوس حقیقت کی حامل ہوتی ہے کیونکہ دانشوروں کا کہنا ہے کہ زبان سے نکلا ہر لفظ سچ ہوتا ہے چاہے وہ کسی بھی حد تک ناقابلِ فہم ہو۔ یہ داستان بھی اپنی طرز کی ایسی ہی انوکھی داستان ہے بزرگوں کی قائم دشمنی کا رشتہ جب دونو جوانوں نے دوستی میں تبدیل کیا تو ایک دلکش کہانی نے جنم لیا۔ مہم جو خاندانوں کو ایک ایسی ہستی دستیاب ہوئی جس سے اسرار و رموز کے بیثار ساپ لپٹے ہوئے تھے انوکھے اور پراسرار واقعات نے مہم جوؤں کو اکسایا کہ وہ اس کی حقیقت معلوم کریں پھر ایک ٹیم وادی حیرت چل پڑی اور ایک انوکھی طلسم ہوشربا کا آغاز ہو گیا۔

حسین طرزِ نگارش واقعات کی فسوں سازی اور سنسنی خیز واقعات کا نظم آپ کو اس وقت تک گرفت میں رکھے گا جب تک آپ اس قسط وار ناول کی آخری نظم نہ پڑھ لیں۔

(ایڈیٹر)

بارے میں جب سوچتا ہوں تو صرف ایک احساس ہوتا ہے صرف ایک احساس وہ یہ کہ وہ اگر اب بھی زندہ ہیں تو قدرت کا ایک ایسا معجزہ ہمارے سامنے آئے گا جس پر مشکل ہی سے یقین کیا جاسکتا ہے۔ وہ ہولناک دریا مجھے یاد ہے اس میں تو چٹانیں بھی سلامت نہیں رہ سکتیں کسی گوشت پوست کے وجود کا زندہ رہ جانا ناممکنات میں ہے۔ باقی رہ گئے کرل اور قتل نہ جانے وہ کہاں گم ہو گئے۔"

"صورتحال کچھ عجیب ہوئی ہے پروفیسر یہ اعتراف کر لیتا چاہئے کہ ہماری یہ مہم ناکام ہوگئی ہے۔ جو مقصد ہم لے کر چلے تھے وہ تقریباً ختم ہو گیا۔ اب ہم اگر کسی طرح ان شرحوں کی قید سے آزاد بھی ہو جائیں تو کیا کریں گے۔ اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر وہاں کے سفر کے لئے فیرت اجازت نہیں دیتی۔ انہیں تلاش کرنے کے لئے وسائل نہیں ہیں اور پھر یہ قید۔ غزال اور راج دیو کے



گارساں نے آنکھیں کھول دیں غصیلی نظروں سے
راؤ کو گھورتا رہا پھر کیولا ”تم خوش ہو؟“

”یہ سب کچھ غیر معمولی نہیں ہے۔ شر دھانے
اسی طرح ہمارا تعاقب بھی کر رہے تھے اور ہم اس
کے لئے تیار تھے کہ کسی بھی وقت ان کے قیدی بن
جائیں ہر چند کہ ہم ان سے مقابلہ کرتے رہے ہیں
لیکن اس کے لئے بھی تیار ہے ہیں کہ کسی بھی وقت
ان کے ہاتھوں گرفتار ہو جائیں۔ اس صورت میں
بھی ہم اپنے تحفظ کے لئے ایک لائحہ عمل رکھتے
تھے۔“

”کیا؟“

”یہ جنگلی ہیں اگر بہت ذہین ہوتے تو ان
جنگلوں میں نہ رہتے اس لئے ذرا بھی موقع ملے پر
ہم انہیں ششے میں اتار سکتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی جلد
بازی ہوگی تو پھر اس نقصان کا ازالہ نہ ہو سکے گا۔“

”ادھ لنع نقصان سے پہلے ہی کچھ ہو جائے گا
مجھے یقین ہے۔ آہ تمہارے ساتھی بھی کچھ نہ کر سکے
بظاہر تو یوں لگتا ہے جیسے ہم بھوک سے ہی مر جائیں
گے۔ میری کیفیت۔“ وہ اچانک رک گیا۔ ”وہ دیکھو
وہ دیکھو کمال ہو گیا واہ۔“

اچانک گارساں قلقلاری مار کر اٹھ بیٹھا۔ راؤ
سکندر نے گردن گھما کر دیکھا بہت سے شر دھانی اندر
داخل ہو رہے تھے۔ انہوں نے لکڑی کے بنے ہوئے
ٹٹٹ ہاتھوں میں اٹھارے کتے جن پر بستے ہوئے
گوشت کے بڑے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔ ان
سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ چند ٹٹٹوں میں
جنگلی بھل بھی نظر آ رہے تھے۔ مٹی کے بہت سے
برتنوں میں دودھ تھا۔ گارساں کے دوسرے ساتھیوں
میں بھی زندگی دوڑ مگی اور وہ عیدوں کی طرح

”ایک بات بتائیے راؤ سکندر۔“ اچانک بھرت
چندر نے کہا اور سب اسے دیکھنے لگے ”یہ شر دھانے
ہمیں ہی گرفتار کر کے لائے ہیں نا؟“

”ظاہر ہے۔“

”اگر کسی طرح انہیں کوئی لالچ دلایا جائے اور
کہا جائے کہ ان جنگلوں میں جو لوگ غائب ہو گئے
ہیں ان کے پاس کوئی قیمتی شے موجود ہے تو کیا یہ ان
لوگوں کو تلاش نہ کریں گے۔ اس طرح ہمیں دو
فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ نمبر ایک تو یہ کہ وہ ہمیں
فوری طور پر کوئی نقصان پہنچانے سے گریز کریں
گے۔ دوسری بات یہ کہ اگر لالچ میں آ گئے تو ان
لوگوں کو تلاش کر لائیں گے اس طرح ممکن ہے ہم
پھر یکجا ہو جائیں۔ مشترکہ طور پر ہمارے ساتھ جو کچھ
بھی ہو بہتر ہے ورنہ زندہ بچ جانے والے ہمیشہ
کرب کا شکار رہیں گے۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ جس
طرح ایڈمنڈ گارساں پروفیسر غوری کے جال میں
پھنس کر خزانے کے لالچ میں ہمارا دوست بن گیا
ہے بالکل یہی کوشش ان شر دھانیوں کے ساتھ کی
جائے۔ خوش قسمتی سے ان میں ایک ایسا بھی موجود
ہے جو ہماری زبان بھی سمجھتا ہے۔“

بھرت چندر کی بات قابل غور تھی۔ چند لمحات
بعد راؤ نے کہا ”ہاں اچھی تجویز ہے بشرطیکہ ہمیں اس
کا موقع ملے۔“

”گارساں کو کنٹرول کرنا ضروری ہے کہیں وہ
دیوانگی میں کوئی حماقت نہ کر بیٹھے!“ پروفیسر غوری
نے کہا۔

”میں اس سے بات کرتا ہوں۔“ راؤ سکندر
نے کہا اور پھر اٹھ کر گارساں کے پاس جا بیٹھا۔
”تم بہت پریشان نظر آ رہے ہو گارساں؟“

خواہش کا اظہار بے معنی ہے ہمارے لئے۔“ راؤ نے کہا۔

”تم ہمارے دشمن ہو تم نے ہمارے بہت سے ساتھیوں کو ہلاک اور بہت سوں کو زخمی کیا ہے اس کے بعد کیا ہم تمہیں دوست سمجھ سکتے ہیں۔ آؤ سردار تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

سب لوگ خاموشی سے ان کے زرخے میں چل پڑے۔ راستے میں ایڈمنڈ نے راؤ سے کہا ”تم نے مجھے لیڈر بنایا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ لیڈر کی حیثیت سے تم سردار سے گفتگو کرو۔ تم جو کچھ اس سے کہو گے وہ میری نمائندگی ہوگی۔ اور ہم تم سے انحراف نہیں کریں گے۔“

”جیسا تم پسند کرو ایڈمنڈ۔“ راؤ نے کہا۔

”اور پھر اس وقت لیڈر کوئی نہیں ہے ہم سب قیدی ہیں۔“

”نہیں ڈیئر ایڈمنڈ۔ تم بہر حال ہمارے لیڈر ہو ان حالات سے بہر حال ہمیں نجات مل جائے گی اس کے بعد ہم تمہاری ہی رہنمائی میں کام کریں گے۔“ راؤ سکندر نے کہا۔

پروفیسر غوری یا ہجرت چندر کو راؤ کے اس انداز میں گفتگو کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ راؤ بے حد ذہین اور موقع شناس ہے۔ ایڈمنڈ کے حوازی کو وہ سمجھ چکا ہے اور جانتا ہے کہ کس طرح ان حالات سے نمٹا جاسکتا ہے۔ البتہ ایڈمنڈ نے کسی قدر جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا ”نہ جانے تم اس قدر اُمید کیوں ہو؟“

”یہ میرا مذہب ہے ڈیئر ایڈمنڈ۔ جب حالات ہمارے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں اور ہم خود کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتے تو ہمارے چہرے

ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے۔ یہ چیزیں ان کے سامنے رکھ دی گئیں اور گارساں کے سامنے ان پر ٹوٹ پڑے۔

”اوکو“ اوجا نورو انسان بنو دوسرے لوگ بھی ہیں پیچھے ہو ورنہ ایک ایک کو گولی مار دوں گا“ سوری راؤ۔ سوری فریڈ یہ کئی روز بھوکے رہ کر پاگل ہو چکے ہیں لو تم بھی گوشت لو۔“

”ہم صرف پھل لیں گے گارساں۔ کیوں پروفیسر کیوں ہجرت؟“

”بالکل“ پتہ نہیں کونے جانور کا گوشت ہے۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ گارساں بولا۔ ویسے

بھی گارساں کے ساتھیوں نے پھلوں پر توجہ نہیں دی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہ پھل اور دودھ استعمال کیا۔ وہ یہاں بیچنس دیکھ چکے تھے اس لئے دودھ پینے میں کسی کو عار نہ ہوا۔ شکر سیر ہونے کے بعد گارساں بھی چونچال نظر آنے لگا تھا۔

شام ہونے لگی تھی اور اسکے ساتھ ہی خشک ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں جو رات کو کافی سرد ہو گئیں۔ موسم اتنا سرد کہیں نہیں محسوس ہوا تھا ان لوگوں کو اس سرد موسم سے کافی پریشانی ہوئی تھی۔ کسی نہ کسی طور صبح ہو گئی سورج کے ساتھ موسم بدل گیا تھا۔ دیسے احاطے کے گرد رات بھر شرودھانوں کا چہرہ رہا تھا۔ صبح کو انہیں باقاعدہ ناشتہ دیا گیا تھا جو پھلوں وغیرہ پر مشتمل تھا۔ دن کو کھارہ بجے انہیں وہی نوجوان نظر آیا جو تعلیم یافتہ تھا۔ اس کے ساتھ بہت سے مسلح شرودھانی تھے۔ ان سب کو احاطے سے باہر آنے کا اشارہ کیا گیا تھا۔ تعلیم یافتہ شرودھانی نے کہا ”کیا تم لوگ شرودھانی ہستی دیکھنا چاہتے ہو؟“

”ہم تمہارے قیدی ہیں اس لئے تم سے کسی

آسمانوں کی جانب اٹھ جاتے ہیں اور ہم اپنی اُلجھن اس کے سپرد کر دیتے ہیں جو ہمارا حقیقی کندہ ہے اور جس نے ہم سے کہا ہے کہ مایوسی گناہ ہے۔“
”اوہ ان حالات میں بھی تم مذہب کی ٹانگ پکڑے ہوئے ہو۔“ ایڈمنڈ گارساں نے کہا اور راؤ سکندر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہاں ایڈمنڈ گارساں مذہب ہمارا سہارا ہوتا ہے بہتر ہے تم اس موضوع پر گفتگو نہ کرو۔“
ایڈمنڈ گارساں ہونٹ سکڑ کر خاموش ہو گیا تھا۔ شردھانی بستی ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ چھوٹے بچے نظر آ رہے تھے اور کہیں کہیں عورتیں بھی جن میں نوجوان لڑکیاں بھی تھیں۔ بوڑھی عورتیں بھی تھیں لیکن ایک بات ان لوگوں نے محسوس کی وہ سب کے سب بد وقت تھے۔ نوجوان لڑکیوں کی آنکھوں میں چھوڑا پن نہیں تھا۔ وہ سادہ نگاہ سے قیدیوں کو دیکھتیں اور نفرا نواز کر کے آگے بڑھ جاتیں۔ راؤ سکندر گہری نگاہوں سے اس ماحول کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ شردھانی نوجوان ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ بستی کافی وسیع و عریض تھی۔ ان کا سفر بالآخر ایک ایسی جگہ ختم ہوا جہاں ایک اور بہت بڑا احاطہ پھیلا ہوا تھا۔ شردھانی نوجوان نے انہیں اس احاطے کے دروازے سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اب یہ تو اندر جا کر ہی معلوم ہو سکتا تھا کہ دوسری سمت کیا ہے اور ان کی تقدیر ان کے مستقبل کے لئے کیا فیصلہ کئے ہوئے ہے۔ احاطے میں ایک عجیب سی کیفیت نظر آئی جبکہ جبکہ ہانسون پر چھتیں بنا دی گئی تھیں۔ احاطہ کافی وسیع و عریض تھا اور بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان چھتوں کے نیچے شردھانی نظر آ رہے تھے لیکن جو انوکھا منظر ان کی نگاہوں کے

سامنے آیا وہ بڑا تعجب خیز تھا۔ چھتوں کے نیچے زمین پر گھاس بچھی ہوئی تھی اور اس گھاس پر ریشی شردھانی نوجوان پڑے نظر آ رہے تھے۔ ان کے ملاح ان کا علاج کر رہے تھے گویا یہ ہسپتال تھا جس کی تصدیق ساتھ آنے والے شردھانی نوجوان نے کر دی۔ وہ کہنے لگا۔

”یہ ہماری علاج گاہ ہے اور تمہیں یہ علاج دیکھ کر یقیناً حیرت ہوگی کیونکہ میں تمہاری دنیا کا طریقہ علاج دیکھ چکا ہوں۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ ہم لوگ اپنے زخموں کا علاج کس طرح کرتے ہیں۔“
شردھانی نوجوان کی رہنمائی میں یہ لوگ ایک چھت کے نیچے پہنچے۔ یہاں ایک ایسا شردھانی نوجوان موجود تھا جس کی آنکھ کی جگہ گہرا غار نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھ خالص گہنی تھی لیکن اس غار پر کوئی دوا وغیرہ نہیں رکھی گئی تھی بلکہ ایک بوڑھا شردھانی آنکھ کے قرب و جوار کے گوشے صاف کر رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنے ہاتھوں کو دھو کر اپنی ایک انگلی آنکھ کے اس غار میں داخل کر دی۔ ایڈمنڈ گارساں نے منہ بنا کر زرخ تبدیل کر لیا تھا لیکن راؤ سکندر اور دوسرے لوگ بغور اس طریقہ علاج کو دیکھ رہے تھے۔ شردھانی ریشی نوجوان ہوش میں تھا لیکن بالکل پرسکون۔ غالباً اس کی آنکھ کا یہ زخم سن کر دیا گیا تھا۔ پھر وہ آنکھ کے اس غار سے چھوٹے چھوٹے گوشت کے ٹکڑے نکالنے لگا جنہیں وہ انتہائی احتیاط سے لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر رکھتا جا رہا تھا۔ قریب ہی ایک بھورے رنگ کا سیال رکھا ہوا تھا جسے بار بار وہ اس آنکھ میں ڈکا دیتا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے کام سے فارغ ہو گیا اور اس نے لکڑی کا وہ گول ٹکڑا اپنے ایک اور ساتھی کی جانب بڑھا دیا۔

”میں کہتا ہوں ان تمام فضولیات سے ہمارا کیا تعلق ہے ہمیں یہ سب کچھ کیوں دکھایا جا رہا ہے؟“
گارساں جھج کر بولا اور نوجوان نے گردن ہلا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر بولا۔

”تعلق ہے مسٹر۔ ان سب کو جو نقصان پہنچا ہے اسے تم پورا کرو گے۔ جس کی آگہ ضائع ہوئی ہے اسے تمہاری آگہ درکار ہے۔ جس کے پاؤں ضائع ہوئے ہیں اسے تمہارے پاؤں۔“

☆☆☆☆☆

سنہری روشنی کے اترنے کا انداز عجیب تھا لیکن چند ہی لمحات کے بعد روشنی کی لاتعداد شعاعیں چمٹ سے نیچے اتر آئیں۔ جب کرل کی سمجھ میں صورتحال آ سکی۔ ان طلسمی غاروں سے اوپر چاند لکل آیا تھا اور بلند یوں کے سوراخوں سے اس کی شعاعیں اندر آگئی تھیں۔ عظیم الشان غاروں کا یہ سلسلہ روشن ہوا تو یہاں کا خطر اجاگر ہو گیا۔ روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ ہی جھنجھٹا ہون کی آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ انہیں بے شمار انسانی بدن نظر آئے جو ان غاروں میں جگہ جگہ سجھہ ریز تھے۔ پھر ایک گونج دار انسانی آواز ابھری۔

”ترورا شودیا آہوتا۔ ترورا شودیا آہوتا کہ۔“
آواز بے حد ہولناک تھی۔ کرل نے گہری سانس لی اور آہستہ سے بولا۔

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“ اس نے یہ سوال خود سے کیا تھا لیکن قدیل فوراً بول اٹھی۔

”وہ کہہ رہا ہے چاند کے پچارو اٹھ جاؤ دیوتا کے درشن کرؤ وہ ہمارے درمیان آ گیا ہے۔“ کرل فیروز نے چونک کر قدیل کو دیکھا اور ایک بار پھر کانپ کر رہ گیا۔ قدیل کا چہرہ بھی چاند ہی کی طرح

شرورحانی نوجوان وہاں سے آگے بڑھ گیا تھا۔ ایک اور چمٹ کے نیچے ایک ایسا غص نظر آیا جس کا داہنا پاؤں ران کے پاس سے کاٹ دیا گیا تھا۔ شرورحانی نوجوان نے کہا۔

”اس کی ایک ٹانگ تمہاری چلائی ہوئی گولیوں سے چھلنی ہو گئی تھی اور اس قابل نہیں تھی کہ وہ جسم پر موجود ہے چنانچہ اسے کاٹ دیا گیا اور اب اس کی جگہ نئی ٹانگ لگا دی جا چکی۔“

”کیا تم لوگ اس طریقہ علاج میں کامیاب ہو؟“ راؤ سکندر نے بے اختیار پوچھا۔

”صدیوں سے ہمارے ہاں یہی طریقہ علاج رائج ہے اور تمہارے ہاں کے طریقہ علاج سے کہیں زیادہ کامیاب ہے۔“

”گویا دوسری ٹانگ اس کے جسم سے منسلک کر کے تم اسے دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل بنا سکتے ہو۔“ راؤ سکندر نے پوچھا اور شرورحانی نوجوان ہنس پڑا پھر بولا۔

”نہ صرف چلنے پھرنے کے قابل بلکہ یہ معمول کی زندگی گزارے گا اور بالکل پہلے کی مانند ہوگا۔“

راؤ سکندر نے تحسین آمیز انداز میں گردن ہلائی اور وہ شرورحانی نوجوان کے ساتھ وہاں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے بہت سے ڈی شرورحانی نوجوانوں کو دیکھا اور اس عجیب و غریب طریقہ علاج پر انکھٹ بدعاں رہ گئے۔

”تمہاری جدید سائنس کی عمر ہی کیا ہے۔ انسان تو اریوں سال سے جی رہا ہے اور تم سے بہتر انداز میں جیتا رہا ہے۔ تم اپنے آج کے طریقہ علاج کو موثر کہتے ہو یہ سب کچھ وہ ہے جو صدیوں سے کام آتا رہا ہے۔“



سیارہ ڈائجسٹ

ایک اور عظیم الشان، ایمان افروز اور فخریہ پیشکش



قرآن کے اہم مضامین

- ★ وہ قرآنی احکام جن کا جاننا ایمان، اعتقاد اور اعمال درست رکھنے کیلئے انتہائی ضروری ہے۔
- ★ اس نمبر کا مقصد پیغام الہی تک ایک آسان راستہ فراہم کرنا ہے اپنی مرضی کا عنوان فہرست میں دیکھیں اور قرآن کی تمام متعلقہ آیتوں پر غور کر لیں۔
- ★ اس نمبر میں کلام الہی عربی متن اور اردو میں انتہائی آسان عام فہم اور دلکش پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔
- ★ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کیلئے اس نمبر کا مطالعہ ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواڑ گارڈن مین مارکیٹ لاہور۔ فون نمبر: 37245412

شیطان قہقہہ بلند ہوا۔

”زوردار تیرا زوردار تیرا“ اس نے کسی قدر طعنیہ انداز میں کہا اور قدیل خاموش ہو گئی۔ اسی وقت کچھ آدمی ایک عمارت سے باہر نکلے ان کے ہاتھوں میں آبدار کھانڈے تھے۔ وہ بہت خوشنظر نظر آرہے تھے۔ کھانڈے ہاتھوں میں سنبالے ہوئے وہ ان دونوں کے گرد آکھڑے ہوئے۔ بوڑھے نے پھر قدیل سے کچھ کہا تھا۔ قدیل نے نفرت سے گردن جھٹکی اور پھر آہستہ قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔ کرمل سکتے کے عالم میں کڑا رہ گیا تھا لیکن عقب سے کسی نے اسے دھکا دیا اور وہ رگرتے رگرتے بچا۔ ایک کھانڈے بردار نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تھا۔ کرمل خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا گے بڑھنے لگا۔ قدیل سینہ تانے پر وقار انداز میں چل رہی تھی۔ کھانڈے برداروں کا رخ ایک دہانے کی طرف تھا اور وہ انہیں اسی طرف لے جا رہے تھے۔ عمارت کے اس دہانے کے پاس پہنچ کر وہ رک گئے اور انہوں نے ان دونوں کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ قدیل خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ اندر گہری تاریکی تھی لیکن دہانے سے اندر قدم رکھ کر کرمل کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ نیچے پتھریلی زمین نہیں تھی بلکہ یہ کھڑکی کا فرش معلوم ہوتا تھا۔ مدہم مدہم روشنی یہاں بھی آرہی تھی لیکن دوسرے لمبے باہر سے ایک آواز ابھری اور اندر گہری تاریکی پھیل گئی۔ غالباً دہانے پر کوئی چٹائی دروازہ بند کر دیا گیا تھا غالباً یہ ان کا قید خانہ تھا۔ ابھی کرمل کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اچانک نیچے کی زمین ہلنے لگی۔ ایک چڑچڑاہٹ سی ابھری تھی اور انہیں نیچے کی چوڑی زمین آگے کی سمت سرکتی محسوس ہوئی تھی۔ کرمل نے بے اختیار قدیل کا

دک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نیچے مڑے قدموں کی مانند روشن تھیں اور اس میں سیاہ پتلیوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ کرمل سہم کر رہ گیا تھا اس طلسمی دنیا میں اسے اپنا وجود بہت ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے اور اس احساس نے اس کے جسم پر منوں وزن لا دیا۔ اس کے اعصاب ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔

رفتہ رفتہ سجدہ کرنے والے آٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ بلند و بالا قامت کے قوی پیکل مرد تھے جن کے جسموں پر برائے نام لباس تھے اور یہ لباس بھی بس چوں یا کھالوں سے بنے ہوئے تھے۔ عمارت کے اس وسیع و عریض طلسم کدے میں چاندنی نے بھی کمال دکھایا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے چھت کے سوراخوں کا یہ نظام خصوصی طور پر قائم کیا گیا ہے۔ عمارت کا گوشہ گوشہ جھونک رہا تھا۔ دیواروں میں عمارت کے دوسرے چھوٹے چھوٹے دہانے نظر آرہے تھے۔

پھر ایک ایسے ہی چھوٹے دہانے سے ایک اور شخص نمودار ہوا۔ اس کے بدن پر سیاہ رنگ کا ڈھیلا ڈھالا لباس تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب آنے لگا اور اچانک ہی کرمل فیروز کے ذہن میں چھنا کا سا ہوا۔ اس نے اس شخص کو پہچان لیا تھا۔ یہ انہی دونوں بوڑھوں میں سے ایک تھا جو انہیں جنگلوں میں ملے تھے اور ان میں سے ایک کو قدیل نے ہلاک کر دیا تھا۔ اس وقت یہ بوڑھے تھکا پھوٹا نظر آتے تھے لیکن اس وقت بوڑھے کی دونوں آنکھیں قدیل کی آنکھوں کی مانند روشن تھیں۔

دفعتہ قدیل کے حلق سے ایک طویل آواز نکل ایک مسلسل آواز جو بیٹھنے کے رونے کی آواز سے مشابہ تھی۔ ساتھ ہی بوڑھے کے حلق سے ایک

کراں آسمان پر اسرار ستاروں سے مزین تھا۔ آخر میں اس نے اس جگہ کو دیکھا جہاں وہ کھڑے ہوئے تھے۔ نامہوار تختوں کو جوڑ کر ایک کٹھنہ سا بنایا گیا تھا جس کی لکڑی سال خوردہ تھی اور تھوڑی سی قوت لگانے سے ٹوٹ سکتی تھی۔ اطراف کی رکاوٹیں بھی لکڑی اور درختوں کی چھالوں سے بنے ہوئے رسوں کی تھیں لیکن جس منظر نے کرل کا سانس بند کر دیا وہ بچے کا منظر تھا۔ چاندنی کی دھند میں نیچے ناقابل یقین گہرائیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ زمین سے سینکڑوں فٹ اوپر خلا میں سفر کر رہے تھے اور یہ سفر ناپائیدار تختوں سے بنے ہوئے ایک کٹھنہ میں طے کیا جا رہا تھا۔ کرل نے آنکھیں بند کر لیں۔ گہرائیاں دیکھ کر چکر بھی آسکتا تھا اور اس کے

بعد.....

قدیل یا تو وقتی عدم توازن کا شکار تھی یا پھر دہشت زدہ کیونکہ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کرل کا سانس پھولتا رہا پھر اس نے ہمت کر کے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ وہ اس سخت سلیمانی کی پرداز کا طریقہ جاننا چاہتا تھا۔ اس کی نظریں چاندنی میں گھورنے لگیں۔ وہ پہاڑیاں کوئی سو گز پیچھے رہ گئی تھیں جن کے سوراخ سے نکل کر یہ کٹھنہ باہر آیا تھا۔ چار رسیاں چل رہی تھیں جن میں دو اوپر تھیں اور دو نیچے اور ان کا عمل یقیناً انسانی ہاتھوں کا رہین منت تھا۔ کسی چرخی کے ذریعہ انہیں اس کٹھنہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا تھا۔ کرل کو وہ چڑچاہٹ بھی یاد آئی جو فرش کھٹکنے سے صرف ایک لمحہ قبل سنائی دی تھی اور اس کے بعد یہ فرش چل پڑا تھا۔ عبوری پہاڑیوں میں وہ سیاہ دھبہ بہت بے نیاک نظر آ رہا تھا جس سے یہ رسیاں باہر نکلی تھیں۔ کرل کی

ہاتھ پکڑ لیا۔ قدیل خود بھی بری طرح لڑکھائی تھی۔ کرل ایک ہاتھ سے قدیل کو سنبھالے ہوئے تھا دوسرا ہاتھ اندھیرے میں کوئی سہارا ٹٹولنے لگا۔ کوئی شے اس کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ یہ ایک سخت اور کمزوری لکڑی کا کندا تھا جسے اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ قید خانے کی حد تک تو کوئی ایسی بات نہیں تھی اس کے امکانات ہو سکتے تھے لیکن فرش کا اپنی جگہ چھوڑ دینا ناقابل فہم تھا۔ اس کے بعد کوئی بھی دہشت ناک صورتحال پیش آ سکتی تھی۔ کرل بے اختیار اس سمت کھٹکنے لگا پھر سے وہ اس قید خانے میں داخل ہوئے تھے لیکن دو قدم چل کر ہی اسے احساس ہوا کہ ادھر بھی کوئی رکاوٹ کھڑی ہوگئی ہے۔ زمین کی جنبش اب صرف جنبش نہ رہی تھی بلکہ اس کے کھٹکنے کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ بس یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی سواری پر کھڑے ہوں اور وہ آگے بڑھ رہی ہو۔ کوئی اچھائی اقدام جان لیا بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لئے کرل ساکت ہو گیا لیکن اس کا دل کتھنیوں میں دھڑک رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہو جائے گا۔ کوئی خطرناک عمل..... قدیل بالکل خاموش تھی۔

چوبی فرش مسلسل آگے بڑھتا رہا یہ جگہ بھی عجیب تھی غالباً کوئی سرنگ..... لیکن اچانک ہی انہیں اس سمت روشنی نظر آئی جو پھر اس انوکھی سواری کا رخ تھا۔ پھر ایک دم کرل کے حلق سے ایک گھسی گھسی آواز نکل گئی۔ دوڑتا ہوا فرش چھت سے بے نیاز ہو گیا تھا اور دونوں چاندنی میں نہا گئے تھے۔ کرل نے سہی ہوئی نظروں سے آسمان پر نکلے چاند کو دیکھا پھر اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ چاندنی اور کمر میں لپٹی پہاڑیاں تاحہ نگاہ نظر آرہی تھیں۔ چھت پر بے

کے لئے بار بار اس میں لگی ہوئی لکڑیاں پکڑی پڑ رہی تھیں۔ کڑے کڑے پاؤں شل ہو گئے تو کرل نے قدیل سے کہا ”بیٹھ جاؤ قدیل۔“

اور قدیل چونک پڑی۔ اس نے ویران نظروں سے کرل کو دیکھا اور پھر جھکے جھکے اعزاز میں بیٹھ گئی۔ کرل بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”تمہیں پہلے اس کا غرض نہیں تھا؟“ کرل نے سوال کیا۔

”کس کا؟“ قدیل کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

”یہ لوگ تمہارے دشمن ہیں؟“

”ہیں..... میں نہیں جانتی۔“ قدیل نے جواب دیا اور کرل کے دل میں جھنجھلاہٹ بیدار ہو گئی۔ اگر

کچھ نہیں جانتی تھی وہ تو پھر کشتی میں بیٹھ کر سفر کیوں شروع کر دیا تھا لیکن چھ لکات کے بعد وہ نارمل ہو گیا۔ اسے قدیل کے الفاظ یاد آ گئے تھے اور یہ

سچائی بھی تھی۔ کچھ پر اسرار تو تھیں اس کے ذہن کو کر دیتی تھیں اور وہ بول پڑتی تھی جبکہ اس کا بچپن تو اسی دنیا میں گزرا تھا۔ وہ خود اپنی اس کیفیت سے

پریشان تھی اس پر جھنجھلاہٹ بیکار ہے۔

”ان واقعات کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا اکل۔“

”تمہیں اس کشتی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟“

”بس مجھے یاد آیا تھا وہ کشتی واپسی کے لئے وہاں پوشیدہ کی گئی تھی۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ جب

میں واپس آؤں گی تو یہ کشتی میرے سفر میں معاون ہوگی۔ مجھے یہ جگہ یاد تھی۔“

گردن گھوم گئی۔ اب وہ دوسری سمت دیکھ رہا تھا جہاں انہیں جانا تھا۔ ادھر بھی اتنی ہی بلند و بالا پہاڑیاں تھیں جتنی یہاں تھیں لیکن ان کا قاصد بے پناہ تھا۔ اس طویل و غریب وادی میں کٹھنہ سسٹ رومی سے سفر طے کر رہا تھا۔ پھر کرل کو ایک اور

وحشت ناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ وادی کے مین درمیان پہنچ کر کٹھنہ ڈک گیا تھا۔ اس کے

ڑکتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے کائنات ساکت ہو گئی ہو۔ اس کے کان نرمی طرح سننا رہے تھے۔ یہاں

اچھی خاصی سردی تھی لیکن کرل کا بدن پسینے سے تر ہو رہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد سرد ہوا میں پسینے

سے جھپکے بدن میں برہمچوں کی طرح چبھنے لگیں۔ کرل کے بدن میں کچھیاں دوڑنے لگیں جو خوف

اور سردی کا مشترک نتیجہ تھیں۔ اس کا کلیجہ جیسے منہ سے نکلا آ رہا تھا۔ بدن اس جھپکے کے لئے تیار تھا جو دوبارہ

سفر شروع ہونے سے گئے والا تھا اور یہ انتظار اور جان لیا تھا لیکن جب کئی منٹ اسی طرح گزر گئے تو

ایک دوسرے تصور نے رہی سہی جان نکال لی۔ کٹھنہ کے کالج میں ڈک جانا بے معنی نہیں ہو سکتا۔ وہ

اس غلاء کے قیدی ہیں۔ یقیناً انہیں غلاء میں مطلق کر کے قید کر دیا گیا ہے۔ ”تو کیا؟ کیا آہ۔“ یہ ایک

خوفناک کوشش تھی انہیں شاید خوف ہوگا کہ کہیں غاروں میں وہ کوئی کارروائی نہ کر ڈالیں حالانکہ اس کا

کیا سوال تھا کم از کم کرل تو یہاں آ کر کچھ کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ وہ تو کچھ سمجھ ہی نہیں پایا تھا

قدیل نے پر اسرار طور پر وہ کشتی تلاش کی تھی اور سفر شروع کیا تھا لیکن اس سفر کا یہ انجام۔

لحے دمک بن کر گزرتے رہے۔ ہوائیں اس جمولے کو ہلکورے دے رہی تھیں اور خود کو سنبھالنے

”کیا تمہیں معلوم تھا کہ اس کشتی کے ذریعہ سفر کر کے ہم کہاں پہنچیں گے؟“
”نہیں۔“

”ہوں۔“ کرل ایک شکاری سانس لے کر بولا اور پھر خاموشی طاری ہو گئی۔

یہ رات کرل کو اپنی زندگی کی طویل ترین رات معلوم ہوئی تھی صبح ہی نہ ہو پاری تھی۔ رخ ہواؤں نے رگوں میں خون نمود کر دیا تھا۔ غلطی سے بھی نیچے لٹا چلی جاتی تو دل بیٹھنے لگتا تھا۔ صبح کے وقت گاڑی کھرچنے اترنے لگی اور ماحول نظروں سے روپوش ہو گیا۔ پھر اُجالا پھیل گیا۔ سردی اب بھی کافی شدید تھی۔ ٹوں ٹوں روشنی پھیلتی جا رہی تھی مناظر دھند کی آغوش سے برآمد ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ سورج نکل آیا۔

قدیل بڑھ چلا تھا۔ کرل نے اس کا چہرہ دیکھا اور اس کے دل میں غزال جاگ گیا۔ ”یہ غزال کی محبت ہے اس کی بیوی ہے وہ..... میرا غزال زندہ ہے اور..... اور..... قدیل مجھے اس کے حوالے کرنی ہے۔“

”قدیل۔“ اس نے پیار سے قدیل کو پکارا۔
”جی اکل؟“
”سردی لگ رہی ہے؟“
”نہیں؟“

”پریشان ہو؟“
”ہاں اکل اب کیا ہوگا؟“

”تم نے اس بوڑھے شخص کو پہچان لیا جس کے ایک ساتھی کو تم نے ہلاک کر دیا تھا۔“

”ہاں وہ کومولا تھا۔ میرا دشمن۔ وہ کومولا تھا۔ ایک کومولا کہیں نے مار دیا تھا وہ مجھ سے کے یون

لینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے مار دیا۔ اور اکل میں دوسرے کومولے کو بھی مار دوں گی۔ اس کی موت ضروری ہے وہ بھی کے یون ہیں۔ وہ دونوں کے یون تھے جس طرح کے یون مجھے روشن راستے دکھاتے ہیں اسی طرح ان کی تاریک آنکھیں ہمارے دشمنوں کو ہمارے بارے میں بتاتی ہیں۔ جو کچھ وہ دیکھتے ہیں ان کے دماغوں کے ذریعے دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔“ قدیل نے بتایا۔ کرل حیرت سے اس کے یہ انکشافات سن رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ سب کچھ کیا تھا۔ قدیل کے انکشافات حیرت انگیز ہوتے تھے۔ لیکن وہ خود کچھ نہیں تھی عجیب شخصیت تھی اس کی، لیکن وہ سب کچھ تو بتا چکی تھی اس کے بعد کرل اس سے اور کیا سوال کرتا۔ اس نے ایک بار پھر اس خون نمود کرنے والے ماحول کو دیکھا۔ واقعی اب کیا ہوگا وہ لوگ ان کے بارے میں کیا ارادے رکھتے ہیں؟ یہ اعزاز ہو چکا تھا کہ وہ قدیل کے دشمن ہیں۔

وقت گزرتا رہا۔ سورج چڑھنے کے ساتھ ساتھ موسم کچھ بہتر ہونے لگا تھا۔ ماحول واضح ہو چکا تھا نیچے ہولناک گہرائیاں تھیں اور اوپر کھلا آسمان ویسے اگر ان کیلئے یہی خلائی قندیشب کر لی گئی ہے تو موت بہت جلد انہیں آ لے گی۔ ایک ہی رات نے بدن چور چور کر دیا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ دونوں اس کٹھن میں بے بس بیٹھے ہوئے تھے اور کرل آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بار بار بہت دور نظر آنے والی ان پہاڑیوں کو گھورنے لگا تھا جہاں سے ان کے سفر کا آغاز ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اس تلاش میں تھیں کہ ادھر کوئی تحرک نظر آئے لیکن وہاں خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ اچانک ہی ان کے جسموں کو

ایک جھٹکا اور ان کے حلق سے آوازیں نکل گئیں۔ چند لمحات تو کچھ سمجھ میں نہ آیا لیکن جب یہ جمولے نما شے آگے سرکنے لگی تو انہیں احساس ہوا کہ ان کے سفر کا دوسرا دور شروع ہوا ہے۔ وہ دوسری جانب ہی سرک رہے تھے یعنی انہیں ان کی جگہ سے آگے بڑھایا جا رہا تھا۔ کرل نے قدیل کا چہرہ دیکھا، وہ کبھی ہوئی بیٹھی تھی اور اس وقت صرف ایک عام لڑکی لگ رہی تھی۔ کرل کی ٹاہیں ان پہاڑیوں کی جانب اٹھ گئیں جو دھر رہے تھے۔ وہاں بھی کوئی انسانی وجود نظر نہیں آتا تھا۔ جمولا معمول کے مطابق آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب وہ ان ہیبت ناک پہاڑیوں کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ دیکھا ہی ایک سوراخ ان پہاڑیوں میں بھی نظر آ رہا تھا جیسے سوراخ سے نکل کر یہ جمولا یہاں تک پہنچا تھا۔ بلاخر جمولا پہاڑی چٹانوں میں داخل ہو گیا اور باہر کی کھلی فضا کے بعد اس تک و تاریک سوراخ میں داخل ہو کر کرل کو ایسا ہی محسوس ہوا جیسے سخت سردی میں بدن کے کھلے ہوئے حصوں پر لطف اڑھ لیا جائے۔ یہاں کا موسم معتدل تھا اور جس سرنگ میں یہ جمولا سفر کر رہا تھا وہ بھی زیادہ طویل نہ ثابت ہوئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ پھر کھلی جگہ نکل آئے۔ یہ جگہ ایک چوڑی اور مسطح چٹان کی شکل میں تھی اور بہت دور تک میدان کی شکل میں پھیلتی چلی گئی تھی۔ وہاں انہیں بھورے رنگوں کے لوگ نظر آئے جو دوسری طرف نظر آنے والے لوگوں سے مختلف نہیں تھے۔ یہ سب مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ جمولا رک گیا۔ ادھر بھی دو چرخیاں لگی ہوئی تھیں جو بھدی اور موٹی لکڑی سے بنائی گئی تھیں اور چار آدمی ان چرخوں کو تھما رہے تھے جن کی مدد سے جمولا

یہاں تک آیا تھا۔ انہوں نے اپنا کام ختم کر دیا اور جمولا رک گیا۔ اس کے بعد انہیں جمولے سے باہر آنے کے لئے کہا گیا۔ کرل نے ان کے احکامات کی پابندی ضروری سمجھی چنانچہ اس نے قدیل کو سہارا دیا اور دونوں جمولے سے اتر آئے۔ لیکن اچانک ہی قدیل پر پتلی پتلی رسیوں کی کندیں پھینکی گئیں اور پھندے اس کے جسم میں جگہ جگہ کس گئے یہ عمل کرل کے ساتھ نہیں دہرایا گیا تھا۔ انہوں نے صرف قدیل کو اپنا قیدی بنایا تھا۔ کرل کے رگ و پے میں چنگاریاں بھڑکنیں۔ قدیل کے ساتھ یہ سلوک اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ غراتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے قریب کھڑے ہوئے ایک شخص پر حملہ کر دیا۔ اس نے اس شخص کو اٹھا کر زمین پر دے پٹا اور اس کا وہ نیزہ جھین لیا جو اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔ نیزے کی تیز دھار والی انی سے اس نے رسیوں پر وار کئے اور بڑی مہارت سے دوریاں کاٹ دیں لیکن پھر چاروں طرف کھڑے ہوئے وحشی کرل کی جانب لپکتے ان کے حلق سے غصیلی آوازیں نکل رہی تھیں۔ کرل نے نیزہ سنبھال لیا اور مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ وحشی جونہی اس پر حملہ آور ہوئے کرل نے ان میں سے ایک کے سینے پر وار کیا اور نیزہ وحشی کے سینے میں پیوست ہو گیا لیکن عقب سے دوسرے وحشی نے لاٹھی کی طرح نیزے سے وار کیا اور کرل کی گردن پر لاٹھی پڑی۔ کرل کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ نیزہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس نے پلٹ کر حملہ کرنے والے وحشی کو دیکھا وحشی دوسرا وار کر رہا تھا کہ کرل نے اس کی لاٹھی کو ہاتھوں پر روکا اور پھر اس پر گرفت کر کے اس وحشی کو بھی اٹھا کر

غزال نے کہا۔

”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“ غزال نے ایک کھری سانس لیکر گردن جھٹکی اور یوں اس سے قبل تم میرے ساتھ کیا کرتی رہی ہو کیا تم دو راتیں مجھے بے وقوف نہیں بناتی رہی ہو۔ میں نے تو تمہارے مذاق کا مذاق نہیں مانتا۔“

”ہڈن کتا ہڈن۔ تم لکھ لو اس بات کو کہ اس کی موت میرے ہی ہاتھوں آئے گی۔“

”اس وقت ہڈن ہمارے درمیان کہاں سے آ گیا؟“

”وہی تو آ گیا تھا اور بھینا اس نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔“

”خیر چھوڑو اچھا مذاق کیا تم نے واقعی ان دو راتوں نے مجھے سحر زدہ کر دیا تھا۔“

”تم سمجھ نہیں پائے تھے کہ میرا تعلق ان لوگوں سے ہو سکتا ہے۔“

”جیسا بار جب تم مجھے نظر آئیں تو ان لوگوں کو میں نے دیکھا بھی نہیں تھا اور پھر یہ جنگل اور پہاڑیاں نجانے کسی کیسی کھانڈوں کی ظہر ہیں یہاں کوئی بھی بات ناقابل یقین نہیں محسوس ہوتی ہے۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے تم بھی کوئی دریائی مخلوق ہو۔“

وہ ہنس پڑی اور اس کا موڈ تبدیل ہو گیا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا ”ویسے میں نے بڑی ذہانت سے یہ پروگرام ترتیب دیا تھا۔ میں تو کسی راتیں اسی طرح تمہارے ساتھ لطف اندوز ہوتی۔ تمہیں کسی لگ رہی تھی میں اس وقت؟“

”بہت عجیب، بہت حیرت ناک“ غزال نے کہا اور لڑکی کے چہرے پر مسرت کے آثار نمودار

زمین پر دے چٹا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سے وحشیوں نے اس پر چلا تگ لگائی اور کرل کو دیوچ لیا۔ اسے زمین پر لٹا کر نرمی طرح رکیدا جانے لگا اور کرل اپنے ہوش و حواس قابو میں نہ رکھ پایا۔ گردن کی ضرب نے ہی اسے پکڑا دیا تھا اور اس کے بعد یہ پے در پے حملے اس کی آنکھوں میں سیاہی کی چادر رینگ آئی اور چند لمحات کے بعد وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

لڑکی نے غزال کو دیکھ کر کسی خاص کیفیت کا اظہار نہیں کیا تھا اور اسی طرح خاموش بیٹھی بیٹھاری کے اعزاز میں دوسری طرف دیکھتی رہی۔

”ہیلو سبک زادی۔“ غزال نے اسے پکارا اور وہ گردن کھما کر غزال کو گھورنے لگی۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے پھر اس نے سر دھجے میں کہا ”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“

”اوہ نہیں بلکہ میں حیران ہوں کہ اس وقت کسی دائرے کے بغیر تمہارے الفاظ میری سمجھ میں آرہے ہیں۔“ غزال نے مسکراتے ہوئے کہا اور لڑکی جھلا گئی۔ اس نے شاخ پر پہلو بدلا اور جھکی ہوئی شاخ جو اس کے وزن سے نیچے جھک آئی تھی ہلکی سی جنبش سے اوپر اٹھنے لگی اور لڑکی ایک دم کئی فٹ اوپر اچھل گئی۔ اس کے حلق سے آواز نکلی تھی پھر اس نے شاخ کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا اور لٹک کر نیچے کود آئی شاخ اپنی جگہ پہنچ گئی تھی۔ غزال دلچسپ لگا ہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے کہا ”دیکھو میں اپنی توہین کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی یہ میری کمزوری ہے۔“

”مگر میں تمہاری توہین کہاں کر رہا ہوں۔“

ہو گئے۔ غزال اس کا تجربہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا کرتا ان حالات میں کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک شدید بیزاری کا شکار تھا۔ ذہن میں پیدا ہونے والے دوسو سے قندیل کی یاد نا مساعد حالات کسی چیز کا کوئی حل سامنے نہیں تھا اور اس نے یہی فیصلہ کر لیا تھا کہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دے۔ جب کوئی عمل سامنے نہیں ہے تو پھر زندگی کے چند لمحات صرف دوسووں کے درمیان کیوں گزارے جائیں۔ چنانچہ اس لڑکی سے تھوڑی سی تفریح ہی تھی۔ لڑکی کہنے لگی:-

”میرا نام سفینہ ہے۔ پروفیسر شمسیت بے کی بیٹی ہوں۔ ڈیڑی بس یوں کہو کہ میرے باپ ہیں اس لئے میں ان کے بارے میں کوئی برا لفظ نہیں استعمال کر سکتی۔ شاید تمہیں اس بات کا علم نہ ہو اور نہیں ہوگا کیونکہ ہڈن میرے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا تو میں کہہ رہی تھی کہ ہم لوگ اپنے وطن میں اچھی خاصی حیثیت کے مالک ہیں۔ انفرہ میں ہماری شاعراں ہائش گاہ ہے۔ ایک فارم بھی ہے جو بہت وسیع و عریض زمینوں پر پھیلا ہوا ہے۔ بہترین آمدنی ہے۔ ڈیڑی کی اپنی ایک لیبھارڈی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ خزانوں کیلئے دیوانے ہو گئے ہیں۔ میں کہتی ہوں خزانے انسانی زندگی سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہوتے۔ کیا کریں گے وہ ان خزانوں کا لیکن انہوں نے ان کے لالچ میں ایک پُر سکون زندگی کو ہڈی اور اب ان وحشت ناک دیوانوں میں بھگ رہے ہیں۔ میں جانتی ہوں خود بھی کافی پریشان ہیں۔“

”لیکن تم ان کے ساتھ کیوں چلی آئیں؟“
”بس میری ماں نہیں ہے اور ڈیڑی میرے

بہترین دوست بھی رہے ہیں بلکہ یوں کہو کہ میری سب سے گہری دوستی انہی سے ہے۔ انہیں تھا چھوڑنے کو بھی نہ چاہا۔ میں کیا کرتی اتنے دن ضد کر کے چلی آئی۔ لیکن بعد میں احساس ہوا کہ بعض اوقات خدیں کتنی حماقت آموز ہوتی ہیں۔ بہر طور اب جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا۔ اس دوران جب سے ہم ہندوستان کے ان جنگلات میں داخل ہوئے ہیں مجھ پر بار بار بیزاری طاری ہوئی۔ ابتداء میں تو یہ ماحول کچھ پسند آیا تھا۔ جنگل کی زندگی میری لئے اچھی ہے لیکن مجھے صبح سورج نکلنے سے پہلے یہاں کا منظر سے حد حسین لگتا ہے جب انسانوں کی آبادیوں سے دور نئے نئے پرنے بڑے بڑے جانور زمین کے تمام رہنے والے اپنے اپنے معمولات کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ انسانوں کی مانند یہ جاندار جانور بھی رزق کے لئے پریشان رہتے ہیں اور جدوجہد کے بغیر انہیں کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ یہ تجربہ میرے لئے بہت ہی دلکشی کا باعث تھا۔ لیکن ایک ہی شے کو کب تک دیکھا جائے۔ شام کو اپنے اپنے گھونسلوں میں واپس لوٹنے والے پرنے رات کو ان دیرانوں کو منور کر دینے والا چاند بے شک بہت خوبصورت لگتا ہے لیکن اب میں ان مناظر سے تنگ آ گئی ہوں۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا اور یہ لوگ یہ سب کے سب وحشی کہتے ہیں اس سے پہلے ہم ایڈمنڈ گارساں کے ساتھ تھے لیکن یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ وہی ان تمام مصیبتوں کا باعث بنا۔ ڈیڑی سے اس کے تعلقات تھے اور اس نے ڈیڑی کو اس کے لئے مجبور کیا تھا کہ ہم ہندوستان کے جنگلوں میں آوارہ گردی کریں۔ پھر یہ مسٹر لوکس ڈی پارلو بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے

باعث دلکشی ہے۔ بہت سی باتیں کریں گے ہم لوگ بلکہ یوں سمجھ لو کہ تمہارا سہارا مل جانے کے بعد میرا دل بھی ان جھگوں میں لگ جائے گا۔“

عقب سے راج دیو کی آواز سنائی دی جو غزال کو آواز دے رہا تھا اور غزال چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر اس نے کہا۔

”اوکے سفینہ میرے اگلے مجھے آواز دے رہے ہیں ذرا جا رہا ہوں۔ تم سے اب تو دن کی روشنی میں بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔“ غزال نے کہا اور وہ ہنس پڑی۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا ”ہاں کیوں نہیں۔“

غزال راج دیو کی جانب چل پڑا تھا۔ راج دیو بڑسکون تھا۔ اس نے کہا۔

”معروف تو نہیں تھے غزال؟“

”یہاں کیا مصروفیت ہو سکتی ہے اگلے۔ پردیفر حشت ہے کی بیٹی سے باتیں کر رہا تھا۔“

”آؤ! راج دیو نے کہا اور وہ چلتے ہوئے دریا کی جانب چل پڑے۔ راج دیو نے ایک پتھر پر بیٹھ کر کہا۔

”لوگس ڈی پارلوا اب یہاں سے واپسی کا سفر شروع کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ کل سے تیاریوں کا آغاز کرے گا۔“

”کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے اگلے یہاں تو ہم بے کار پڑے ہوئے ہیں۔“

”اسی دریا کے کنارے واپسی کا سفر کیا جائے گا۔ میں نے اتنے دن یہاں اس اُمید پر گزارے ہیں کہ ممکن ہے وہ لوگ اس طرف نکل آئیں لیکن دپے تیز بہاؤ پر ہم نے جس رفتار سے سفر کیا ہے اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ممکن ہے وہ لوگ ان

پتہ نہیں ڈیڈی کہ کیا سوچی کہ ایڈمنڈ گارساں کو چھوڑ کر وہ ان کے ساتھ چلے آئے۔ میرا آنا بھی ضروری تھا اور اب لوگس ڈی پارلوا واپس جانا چاہتا ہے۔ مجھے تو خیر اختلاف نہیں ہے ظاہر ہے غزالوں کے چکر میں تو میں ویسے بھی نہیں پڑنا چاہتی تھی مجھے کیا کرنا ہے غزالوں کا۔ ویسے تم اس دوسری پارٹی سے تعلق رکھتے ہو نا جس کے بارے میں بڑی بڑی کہانیاں سننے کو ملتی رہی ہیں کیا نام ہے تمہارا؟“

”غزال۔“ غزال نے جواب دیا۔

”بہت خوبصورت نام ہے بالکل تم پر چلتا ہے۔ تم مجھے بہت پسند آئے ہو۔ ایک دوست کو کم از کم ایسا ہی ہونا چاہئے اور وہ ہنس اس کی تو مجھے صورت سے گمن آتی ہے لیکن وہ ہر وقت میرا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے بے پناہ نفرت۔ ویسے ڈیر غزال تم مقامی باشندے ہو نا میرا مطلب ہے تمہارا تعلق ہندوستان ہی سے ہے نا؟“

”ہاں۔“

”کیا تمہیں بھی غزالوں سے دلچسپی ہے؟“

سفینہ نے سوال کیا اور غزال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہاں مجھے دل کے خزانے بھاتے ہیں۔ وہ خزانے جو محبتوں سے معمور ہوتے ہیں وہ جو پیار کا درس دیتے ہیں۔“ غزال نے جواب دیا اور سفینہ کے ہونٹوں پر ایک دلاویز مسکراہٹ پھیل گئی۔

”میں تمہارا مطلب سمجھ رہی ہوں بھینا تم سے پوری طرح متفق ہوں۔ محبت سے زیادہ قیمتی شے اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ حقیقت یو ڈیر غزال ویسے اگر تم میری اس شرارت کا نڈامانے ہو تو میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ تمہارا ساتھ میرے لئے

”یقین کرو غزال! میں نے صرف شیر تیندوے اور چیتے ہلاک کئے ہیں۔ ان ننھے ننھے معصوم جانوروں کی ہلاکت میرے دل پر شدید اثر دے گی۔ طاری کر دیتی ہے۔ تاہم میں انہیں نہیں روک سکتا۔ میں پھل جمع کرنے والی پارٹی میں شامل ہو جاؤں گا۔“

دوسرے دن صبح ہی سے سب تیار تھے۔ راج دیو پھل جمع کرنے نکل گیا تھا۔ غزال نے بھی یہی ذمہ داری سنبھالی تھی اور وہ بھی پھل جمع کر رہا تھا۔ اس دھن میں مست دور نکل گیا تھا۔ دھلتا اس نے کچھ آٹھیں سنیں اور سنبھل گیا لیکن پھر اس نے سفینہ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ خود بھی مسکرا دیا۔

”میں تمہیں دیر سے تلاش کر رہی تھی بہت دور نکل آئے تم۔“

”ہاں!“

”چھوڑو بہت سے لوگ پھل جمع کر رہے ہیں آؤ بیٹھو باتیں کریں گے۔“

”نہیں یہ میری ذمہ داری بھی ہے۔“ غزال نے کہا۔

”میں بھی تو تمہاری ذمہ داری ہوں۔“ سفینہ نے کہا۔

”تم؟“

”ہاں میں۔ پچھلی رات میں تمہارے بالکل قریب تھی مگر تم گہری نیند سو رہے تھے۔“ غزال چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ سفینہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی لیکن غزال ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”ہم دوست ہیں سفینہ! اس نے کہا۔
”کوئی شک باقی رہ گیا ہے اس میں؟“

دونوں میں یہ فاصلہ نہ ملے کر پائے ہوں اور واپسی کے سفر میں بہت جلد ہماری ان سے ملاقات ہو جائے۔“

”ہاں ہو سکتا ہے اگلے؟“

”تم نہ امید نہیں ہو؟“

”اگلے میں عجیب احساسات کا شکار ہوں۔“

ڈیڑی اور قندیل۔ میں قندیل کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میں جانتا ہوں کہ ڈیڑی پر کیا بیت رہی ہوگی۔ اگر قدرت نے انہیں زندگی دی ہے تو میں جانتا ہوں کہ یہ زندگی اس وقت ان کے لئے موت سے بدتر ہوگی۔ وہ میرے لئے جس قدر بے چین ہوں گے میرے سمجھتا ہوں مگر مجبوری ہے۔ دل یہ بھی کہتا ہے کہ ممکن ہے وہ لوگ کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہوں۔“

”دوسری شکل میں بیٹے ہمارے پاس آگے بڑھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اچھا ہے ان لوگوں کے سہارے ہمارا سفر آسان ہو جائے گا۔“

”ہاں اگلے ٹھیک ہے تیاریاں کیا کی جائیں گی؟“ غزال نے پوچھا۔

خوراک کے سلسلے میں وہ سب سے زیادہ

پریشان ہے۔ بہت نمد وقت گزار چکا ہے اور بھوک کا خطرہ نہیں مول لیتا چاہتا۔ اس لئے یہاں سے وہ ان جنگلی پھلوں کا ذخیرہ اکٹھا کرنا چاہتا ہے۔ گوشت بھی سکھا کر سنوار کرنا چاہتا ہے کل سے اس کے تمام ساتھی اس کام میں مصروف ہو جائیں گے۔“

”آپ تو ان کی کافی مدد کر سکتے ہیں اگلے۔“

”کس طرح؟“

”شکار کا تجربہ جتنا آپ کو ہے دوسروں کو نہیں۔“

”کچھ نہیں ہوتا۔ میں جانتا ہوں حادثے اسی طرح ہوتے ہیں اور پھر جھگ کا قانون تمہارا کیا خیال ہے مسٹر غزال۔ یہ نیزہ تمہاری کھوپڑی ایسے توڑ سکتا تھا کہ پھر وہ کبھی نہ جڑتی لیکن اس میں میرا کیا قصور ہوتا میں نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا اور آئندہ بھی اگر ایسا ہو تو جان بوجھ کر نہیں ہوگا۔ آہ میرا نیزہ شاید کہیں دُور نکل گیا۔“ ہڈن لا پرواہی سے آگے بڑھ گیا تھا دونوں خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ پھر سفینہ نے کہا:

”واقعی حادثے اسی طرح ہوتے ہیں اور کوئی حادثہ ہونا چاہئے بہت جلد ہونا چاہئے۔ اس نے خود ہی مجھے یہ راستہ دکھا دیا ہے۔“ وہ مسکراتی پھر ہنس پڑی ”کیوں غزال حادثے ہوتے ہیں نا؟“

غزال ششدر رہ گیا سفینہ کا لہجہ بے حد سفاک تھا۔

☆☆☆☆☆

گارساں کا چہرہ خوف سے چلا پڑ گیا تھا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ شردھانی نوجوان نے کہا ”جو نقصان تم نے کیا ہے اسے تم ہی پورا کرو گے۔ یہ سب تمہاری جاگیر نہیں ہیں یہ ہمارے جنگل ہیں۔ تم یہاں داخل ہوئے اور تم نے ہم پر گولیاں چلائیں تمہیں یہ سزا مل سکتی ہوگی۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے تم ایسا نہیں کر سکتے!“ اسی وقت ایک بوڑھا شردھانی نوجوان کے پاس آیا اور اس سے کچھ کہنے لگا۔ راؤ سکندر نے سراتو کا شانہ دبایا تھا۔

”شر میں شن رہا۔“ سراتو نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

شردھانی نوجوان نے گردن ہلائی اور بوڑھے

”نہیں لیکن دوستی ایک مقدس جذبہ ہے اس جذبے کی تقدیس مجروح نہیں ہونی چاہئے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔“

”ہمیں حتما رہنا ہوگا سفینہ پچھلی رات جہیں میرے بالکل قریب نہیں ہونا چاہئے تھا۔ بد قسمتی سے ہم دو مختلف صنفوں سے تعلق رکھتے ہیں۔“

”یہ کیا جہالت کی منگٹو شروع کر دی تم نے۔ میں ان جنگلوں میں شدید بیزار ہو گئی ہوں میں ڈنٹی تبدیلی چاہتی ہوں۔“

”میرا فرض ہے کہ میں اچھے دوستوں کی مانند تمہاری دلجوئی کروں لیکن.....“

اچانک ہی کوئی شے سنسناتی ہوئی غزال سے صرف دو انچ کے فاصلے سے نکل گئی۔ اس کی سنسنات اتنی تیز تھی کہ اگر غزال اس کی زد میں آ جاتا تو شدید زخمی ہو سکتا تھا۔ یہ لکڑی کا نیزہ تھا جو

کوئی رکاوٹ نہ ہونے کی وجہ سے اتنی دُور نکل گیا تھا کہ اب نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

غزال اور سفینہ ادھر دیکھنے لگے۔ ہڈن کچھ فاصلے پر نظر آیا تھا انہیں دیکھتے ہی اس نے ہاتھ ہلا کر کہا ”اوہو یہاں تم لوگ ہو پلو مسٹر غزال پلو سفینہ۔“

”نیزہ تم نے پھینکا تھا؟“ سفینہ نے کہا۔

”ہاں ادھر جمہازیاں مل رہی تھیں۔ میں نے سمجھا کوئی جانور ہے میرا نیزہ کہاں گیا؟“

”جنم میں۔ اگر اس سے کوئی زخمی ہو جاتا تو؟“ سفینہ غرائی۔

”صرف زخمی نہیں ڈیز اگر کوئی اس کی زد میں آ جاتا تو ہلاک بھی ہو سکتا تھا۔ تم صرف زخمی ہونے کی بات کر رہی ہو۔“

”اور اس کے بعد تم جانے ہو کیا ہوتا؟“

شردھانی سے کچھ کہا جسے سن کر بوڑھا چلا گیا۔
نوجوان پھر گارساں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”اس بوڑھے ڈاکٹر کو دو انسانی ہاتھ درکار ہیں
ابھی اور اسی وقت اگر تم یہ کارروائی دیکھنا چاہے ہو تو
میں تمہیں یہ آپریشن دیکھنے کی دعوت دیتا ہوں۔“
”لغت ہو تم پر ہمیں یہاں سے جانے دو۔“
گارساں فرمایا۔

”تم میں سے ایک بھی یہاں سے زندہ واپس
نہیں جائے گا۔ ہاں اگر تم چاہو تو کچھ وقت کی زندگی
پاسکتے ہو۔ اس کی شرط یہی ہے کہ خاموشی سے وقت
گزارو اور سرکشی نہ کرو ورنہ آپریشن کا حکم ہے کہ تم
سب کی پیکش کر لی جائے۔ آپریشن ہمارا سرور ہے۔“
”یہ کیا کہہ رہا ہے۔ آہ یہ دیوانہ کیا کہہ رہا ہے

راؤ سکندر شتا تم نے یہ کیا کہہ رہا ہے۔“
”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تم میں سے چند
کو قائدہ بھیج سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ فرض کرو کسی
شردھانی نوجوان کو ایک آنکھ کی ضرورت ہے
ضرورت کے مطابق تمہارے آدمی کی ایک آنکھ نکالی
جائے گی اور اس شردھانی کے نگہ دی جائے گی۔
دوسری آنکھ بھی نکالی جائے گی۔ چلو میں تمہیں یہ آزادی دیتا
ہوں کہ جس شخص سے کسی شردھانی جوان کی ضرورت
پوری ہوگی اسے آزادی دے دی جائے گی۔ نہ
صرف آزادی بلکہ اسے ایک گھوڑا بھی دے دیا
جائے گا اور وہ جہاں چاہے گا جا سکے گا۔ یہ میرا وعدہ
ہے۔“ وہ ہنس پڑا۔ اسی وقت بوڑھا آدمی وہاں پہنچ
گیا اس کے ہاتھ میں ایک پلڈر لکڑی تھی۔

سنہری باتیں

- کچھ لوگوں کا وجود زمین پر بوجھ کے سوا کچھ نہیں۔ (جون ایلیا)
- سب سے بڑی دہشت گردی یہ ہے کہ ملک میں دوہلی پہنکی اور موت سستی ہے۔ (سراج الحق)
- عجب کے نیچے پیٹھ کر ایک تاجیہ خلیفہ مائیک میں کہہ رہا تھا کہ سائنس حرام ہے۔
- نیلے کاغذ کی طرح زندگی ٹھہری اپنی، کوئی لکھتا بھی نہیں اور کوئی جلاتا بھی نہیں۔
- لوگ اچھا پڑنے اور اچھا لکھنے والے کو قابل انسان سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت میں قابل انسان وہ ہے جو اچھا سوچے اور اچھا بولے۔
- جب تک انسان ایک دوسرے کی عزت کرنے کا ماحول پیدا نہیں کر لیتے وہ اپنے انسانی منصب کی نفی ہی کرتے رہیں گے جیسے صدیوں سے کرتے آ رہے ہیں۔ مادی مسابقت کا جذبہ انسانوں کے درمیان باہمی احترام و وقار کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہونے دیتا۔
- ہندومت میں اولاد کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پوت، پھوت اور سپوت ”پوت“ وہ ہے جو اپنے بزرگوں کی میراث کو سنہیال کر رکھے اگر اس میں اضافہ نہ کر سکے تو کوئی بھی نہ آنے دے۔ ”پھوت“ وہ ہے جو اپنے پھکوں کی میراث کھو دے اسے برباد کر کے رکھ دے جبکہ ”سپوت“ وہ ہے جو اپنے بڑوں کی میراث میں قابل ذکر اضافہ کر سکے۔ ہم کون ہیں؟ ہم ڈیڑھ ارب کون ہیں؟ ہماری میراث کہاں ہے؟ علم مومن کی کوئی ہوئی میراث ہے لیکن ہم صدیوں سے کہاں کھوئے ہوئے ہیں؟

(مرسلہ: اسد علی۔ کراچی)

گے۔ پہلے پروگرام کے تحت تم میں سے کچھ زندہ بچا سکتے ہیں۔ دوسری شکل میں ہم تمہیں ہلاک کر کے محفوظ کر لیں گے اور تمہارے ضروری اعضاء کو استعمال کر کے باقی اعضاء پیکیج دیئے جائیں گے۔ فیصلہ کرلو۔“

سب کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اچانک ہی لیسٹر نے ایک لمبی چلا تک لگائی اور فضا میں پرواز کرتا ہوا ڈور نکل گیا۔ پھر اس نے دوسری چلا تک لگائی اور احاطے کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ شروحاتی نوجوان نے ہاتھ اٹھا دیا۔ فائر کی آواز ابھری اور لیسٹر کے سینے میں سوراخ ہو گیا۔ اس کا بدن احاطے کے دروازے کے پاس پھرنے لگا۔ چند شروحاتی جوان آگے بڑھے اور لیسٹر کے خون اگلنے بدن کو اکھاڑا واپس اس جگہ لے آئے جہاں مکروہ بوڑھا موجود تھا۔

گارساں زمین پر بیٹھ گیا تھا۔ شدید دہشت کے آثار اس کے چہرے پر نمودار تھے۔ باقی لوگ چھرا گئے تھے بس ان کے جیسوں میں ہلکی ہلکی قہر قہراہٹ تھی۔ اس کے بعد کے مناظر نہایت دہشت ناک تھے۔ لیسٹر کی موت کا انتظار بھی نہیں کیا گیا تھا اور اسے لکڑی کے ایک عجیب سے فریم سے باندھ دیا گیا تھا۔ بوڑھے ڈاکٹر نے اس کا اوپری لباس اتار کر اس کے بازو، ہنہ کر دیئے۔ لکڑی سے ٹاپ کر ایک چاقو سے نشان لگائے اور دو جوان ایک چمکتا ہوا تیز دھار وزنی کھاڑا لے آئے۔ بوڑھے ڈاکٹر نے انہیں نشان دکھائے اور کھاڑا دوبارہ بلند ہوا۔ گارساں کی دہشت ناک جچ فضا میں ابھری تھی۔ اور اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ دیئے تھے۔ لیسٹر کے دونوں بازو علیحدہ ہو گئے لیکن وہ اس تکلیف

”وہ آگیا شر۔“ سراتو نے راؤ کے کان میں سرگوشی کی۔

”اس نے کیا کہا تھا؟“ راؤ سکندر نے پوچھا۔

”وہ کہہ رہا تھا کہ اسے دو بازوؤں کی ضرورت ہے۔ شروحاتی بولا وہ ٹاپ لے آئے اب وہ ٹاپ لایا ہے۔“

سراتو کا کہنا درست تھا۔ بوڑھے کی نظریں ایک ایک فرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر وہ گارساں کے ایک ساتھی کی طرف بڑھا جس کا نام لیسٹر تھا۔ اس نے لکڑی لیسٹر کے بازوؤں سے لگائی اور پھر زور سے کچھ بولا۔

”ہمیں اس کے بازو درکار ہیں۔“ شروحاتی نوجوان نے لیسٹر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے پاگل ہو گئے ہو تم۔ ایسا نہیں کر سکتے تم۔“ گارساں نے آگے بڑھ

کر شروحاتی نوجوان پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن

شروحاتی جوان کے ایک گھونٹنے نے گارساں کو زمین

چٹا دی تھی۔ پھر وہ غرائی ہوئی آواز میں بولا

”تمہارے چاروں طرف رائفلیں تھیں ہوئی ہیں

جہاں تم قید کئے گئے ہو وہاں بھی تمہاری نگرانی رائفل

کی نالوں سے کی جاتی ہے اور جہاں سے گزرتے

آئے ہو وہاں بھی رائفل بردار تمہاری نگرانی کرتے

رہے ہیں۔ انہیں ہدایت ہے کہ تمہاری کسی سرگوشی کو

معاف نہ کیا جائے۔ میں صرف اٹنی اٹھاؤں گا اور تم

سب زمین پر تڑپے نظر آؤ گے۔ ہمارا مقصد اس

طرح بھی پورا ہو جائے گا۔ ہمارے پاس اعضاء کو

ذخیرہ کرنے کا بھی معقول بندوبست ہے۔ اگر تم

سب کو بیک وقت ہلاک کرنے کی ضرورت پیش آئی

تو ایسا بھی کیا جاسکتا ہے۔ البتہ تم نقصان میں رہو

ابتداء ہی سے میرے لئے منحوس رہا۔ خدا غارت کرے خدا غارت کرے سب کو خدا غارت کرے اس وقت کو جب میں نے اس منحوس نواد خانے میں قدم رکھا تھا۔“

”خود کو سنبالو گارساں ہمت سے کام لینا ہوگا۔“ پروفیسر نے آہستہ سے کہا۔

”ایک تھپڑوں کا منہ پر گردن ٹوٹ جائے گی۔ ہمت سے کام لوں کہاں سے لاؤں ہمت؟ آہ لیٹر پیتا جا کتا ہمارے ساتھ گیا تھا اور اب وہ ہم میں نہیں ہے آہ لیٹر۔“

”ہمت سے کام لینا ضروری ہے حواس کو بیٹھے تو کتے کی موت مرنا پڑے گا۔ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر حرف بہ حرف عمل کریں گے اس کا مظاہرہ تم دیکھ چکے ہو۔“ پروفیسر میرے دوست میرے بھائی کچھ کرو کوئی ترکیب کرو۔ آہ میرے ہاتھ میری آنکھیں میرے پاؤں ارے باپ رے اگر ان میں سے کوئی چیز ان کے تاپ کی ہوئی تو۔“

”دوسری صورت میں ہم وقت سے پہلے مر جائیں گے۔“ پروفیسر نے کہا۔

”میں“ میں مرنا نہیں چاہتا آہ غلطی ہوئی یہ منحوس جھگڑا آہ یہ منحوس جھگڑا کچھ کرو میرے بھائی میرے دوست۔“ گارساں نے پروفیسر کے پاؤں پکڑ لئے۔

”میں آخری وقت تک سمجھداری سے کام لینا ہوگا۔ کوئی بھی لمحہ ہمارے لئے کارگر ہو سکتا ہے۔ اگر تم اس طرح بدحواس ہو گئے تو ہم آن کی آن میں فنا کر دیے جائیں گے۔“

(جاری ہے)

سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا اور اس کا جسم ساکت تھا۔ شر دھانی نو جوان نے کہا۔

”اس کے دلوں بازو کٹ جاتے لیکن یہ زندہ رہتا۔ ہم اس کا بھی علاج کرتے اور تم دیکھتے کہ وہ بالکل تندرست ہو جاتا اور تم سب کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ تمہیں تعاون کرنا ہوگا اور تعاون نہ کرنے والے کا انجام اس سے مختلف نہ ہوگا۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ یہ دلوں بازو ایک شر دھانی کے کس طرح کام آتے ہیں کون یہ آپریشن دیکھنا چاہتا ہے۔“

”میں!“ اچانک راؤ سکندر نے کہا۔ اور سب چونک کر راؤ کو دیکھنے لگے۔

”باقی لوگوں کو واپس چھوڑ آؤ۔ میں تم سب کو بتا چکا ہوں کہ سرنگی کا نتیجہ کیا ہوگا تم میں سے جو بھی مرنا چاہے گا مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا جاؤ سب کو لے جاؤ۔“

پروفیسر غوری اور ہجرت چندر کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اچانک راؤ کو کیا ہو گیا۔ یہ وحشت ناک منظر دیکھنے کے لئے بڑا دل گردہ چاہئے تھا۔ ان لوگوں کے اعصاب ساتھ چھوڑ رہے تھے اور راؤ یہ آپریشن دیکھنا چاہتا تھا۔ شر دھانی نو جوانوں کا ایک گروہ ان کے گرد جمیل گیا۔ گارساں نے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو ایک طرف لڑھک گیا۔ بہر حال اس کے دو ساتھیوں نے کسی نہ کسی طرح اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور لڑھکتے ہوئے باہر نکل آئے۔ قید خانے تک کا سفر انتہائی مشکل ثابت ہوا تھا اور قید خانے میں آ کر کسی میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ وہ بیٹھ ہی سکتا۔ وہ سب زمین پر چرت لیٹ گئے تھے۔

پروفیسر غوری نے اچانک گارساں کی سسکیاں سنیں اور پھر وہ زور زور سے رونے لگا۔ ”آہ یہ سزا